مسلم اقلیات کے معاشرتی مسائل واحکام

ڈاکٹر حافظ محمد عابد نعمان شامی

ابریشم انٹرنیشنل

مسلم اقلیات کے معاشرتی مسائل واحکام

Muslim Minorities

Social Dilemmas and Princi

Hafiz M. Abid Noma

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

مشرق و مغرب میں عمرانی علوم (Sociology) کی بنیاد جن تصورات پر ہے ان میں سے ایک کا تعلق اقلیت اور اکثریت کے باہمی تعلق، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی حکمتِ عملی سے ہے۔ایسے خطوں میں جہاں کوئی قوم بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ملک کی مجموعی آبادی میں کم تر تناسب رکھتی ہو غیر محسوس طور پر ایک اقلیتی نفسیات وجود میں آجاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اکثریت سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اقلیت کے انسانی حقوق کے حصول کے لیے مدد و تعاون کرے۔ بعض اوقات اکثریت کے ساتھ سیاسی یا معاشی الحاق کر کے اپنے حقوق کے حصول کے لیے بھی جدوجہد کی جاتی ہے، چنانچہ ثقافتی تشخص ہو یا معاشی خود انحصاری یا معاشرتی تحفظات، ان سب کے حوالے سے اقلیت بمقابلہ اکثریت کا نمونہ انسانوں کے زاویہ نگاہ اور تصورِ مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسلام وہ دین ہے جو اپنے پیروکاروں کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات لے کر آیا ہے۔ جس نے انسان کو انسانیت سکھائی ہے۔ایک معبودِ برحق کی عبادت بتائی اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو اسوہ حسنہ کی عملی تفسیر بنا کر پیش کیا ہے۔ اسلام کا پیغام کسی خاص علاقے یا زمانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اسکی تعلیمات ابدی اور تمام نوعِ انسان کے لئے ہیں۔اسلام کے آفاقی اور عالمگیر پیغام نے یورپ، امریکہ اور ایشیا کے باسیوں پر بھی اپنا گہرا اثر قائم کیا اور وہاں کی آبادی کا بڑا حصہ آج اسلام قبول کر چکا ہے۔جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ان ممالک میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہے وہاں اسلامی زندگی نسبتا آسان ہے لیکن جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور وہاں اسلامی حکومت بھی نہیں ہے وہاں مسلمانوں کو مذہبی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی اقدار کی بنا پر مسائل کا سامنا

ہے۔ چونکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کی اپنی دینی اور معاشرتی اقدر ہیں اس لئے وہ جہاں اور جس معاشرہ میں بھی رہیں انہیں اپنی اقدار کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے بحیثیت اقلیت معاشرتی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں اور ان کا مناسب حل قرآن و سنت کی روشنی میں تلاش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔

یہ سب اللہ جل مجدہ کے کرم سے ہے جو خالق کائنات بھی ہے اور مالکِ شش جہات بھی۔ جو اپنے ضعیف بندوں پر فضل واحسان فرماتا ہے۔ اس کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں ہوں نبی مکرم، شفیع معظم، جان دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جن کو ہادیِ عالم بناکر مبعوث فرمایا گیا اور آپ کی بعثت کو حضرت انسان کے لیے رحمت، شفقت اور مومنین کے لئے فضل و احسان قرار دیا گیا۔

(اللھم صل علی سیدنا محمد و علی آل محمد بعدد قطرات الامطار)

میں پروردگار عالم کا سر تا پا شکر گزار ہوں کہ جس نے فقط اپنے بے پایاں لطف و کرم اور احسان سے ایسے اسباب و وسائل عطا فرمائے کہ جن کی بدولت اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ ڈاکٹر محمد عاطف کا سپاس گزار ہوں اور صمیمِ قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل مجدہ ان کے والد گرامی الحاج شیخ محمد اشرف صاحب مرحوم و مغفور کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

میری تعلیم کی ابتداء سے پی ایچ ڈی کی تکمیل تک والدین، اساتذہ، شیوخ، اہل علم اور اعزاء و اقرباء، اہل خانہ میں سے جنہوں نے کسی بھی مرحلہ میں میرے ساتھ تعاون اور شفقت کا رویہ اپنایا۔ اللہ جل شانہ ان سب کو خیر عطا فرمائے۔ انہیں دنیوی و اخروی انعامات و عنایات اور اپنی رحمت و مغفرتِ کاملہ سے نوازے!

رب اوزعنی ان اشکر نعمتك التی انعمت علی و علی والدی وان اعمل صالحا ترضہ واد خلنی برحمتك فی عبادك الصالحین۔ اللھم اغفرلھم وارحمھم۔ ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذین سبقونا بالإیمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا إنك رؤوف رحیم۔

اس کتاب میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ فقط اللہ رب العزت کی طرف سے اور جو کوتاہیاں ہیں وہ راقم کی کم علمی کی بدولت ہیں۔میں اللہ جل مجدہ کی بارگاہ میں بصد عجز و نیاز دعاگو ہوں کہ پروردگار اس کاوش کو اپنی شانِ کریمی کے صدقے شرف قبولیت عطا فرمائے!اور مجھے علم نافع عطا فرما کر اسے میرے لیے نجات کا ذریعہ اور وسیلہ بنائے۔

آمین بجاہ النبی الکریم!

دعاجو

حافظ محمد عابد نعمان

مسلم اقلیات پر سابقہ و موجودہ تحقیقی کام

زیر تحقیق موضوع پر تفصیلی طور سے تحقیقی کام نہیں ہوا البتہ جزوی طور پر مختلف جامعات میں اس موضوع پر تحقیقات موجود ہیں۔درج ذیل سطور میں چند تحقیقات کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

1۔اسلامی ریاست اور غیر مسلم شہری

ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ نے جامعہ پنجاب سے اپنے پی ایچ ڈی مقالہ میں جزوی طور پر مسلم اقلیات کاذکر کیاہے لیکن ان کے مسائل اور حل کے لئے قرآن و سنت سے تفصیلات پیش نہیں کیں۔اب یہ مقالہ کتابی شکل میں کتاب محل پبلیکیشنز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔

2۔برصغیر میں بین الاقوامی اسلامی قانون کی تعبیرات ، تحقیقی و تحلیلی مطالعہ

حافظ مقبول احمد نےعلامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے اپنے پی ایچ ڈی کے اس مقالہ میں مسلم اقلیات کے موضوع پرجزوی بحث کی ہے۔تاہم یہ بحث نا مکمل ہے۔

3۔غیر مسلموں سے متعلق احادیث وآثار اور عہد حاضر میں ان کی معنویت

محمد عمر صدیق نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کے اپنے اس مقالہ میں سرسری طور پر مسلم اقلیات کا ذکر کیا۔

4۔جنوبی ایشیا میں مسلم اقلیت :سیاسی و سماجی مسائل

عذرا پروین نے گورنمنٹ کالج یورنیورسٹی فیصل آباد سے اپنے پی ایچ ڈی مقالہ میں ایشیا کی بعض مسلم اقلیات کےسیاسی وسماجی مسائل کاتذکرہ کیا ہے۔تاہم مسائل کے حل کے حوالہ سےقرآن وسنت کی روشنی میں کوئی جامع تجاویز پیش نہیں کیں۔

5۔اقلیتوں کے حقوق اوراسلاموفوبیا

انڈیا میں منعقد کرائے گئے ایک سیمینار میں مختلف خطابات کے مجموعہ کو ایفا پبلیکیشنز

دہلی(انڈیا)نے ۲۰۰۱ءمیں شائع کیا ہے جس میں موضوع کے بعض پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔تا ہم موضوع پر جامع انداز میں تحقیق ضروری ہے۔

6۔فقہ الاقلیات

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی ایک معرکہ آراء تصنیف ہے جس کا اردو زبان میں الیاس نعمانی اور شعبہ حسنین نے ترجمہ کیا ہے۔اس میں اقلیات کے عمومی مسائل سے فقہی اصول و ضوابط کے تحت کلام کیا گیا ہے۔

7۔ضرورت و حاجت سے مراد اور احکام شرعی میں ان کا لحاظ

قاضی مجاہد حسام قاسمی کی یہ کتاب الضرورات تبیح المحضورات کے تناظر میں لکھی گئی ہے جس میں بوقت ضرورت و حاجت بعض ممنوع چیزوں کی اجازت دینے کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اسے ایفا پبلیکیشنز نے شائع کیا ہے۔

8۔فقہ الا قلیات، تعارف تجزیہ اور حل

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کی اس موضوع پر ایک خوبصورت کاوش ہےجس کو اردو زبان میں مولانا امتیاز احمد قاسمی نے ڈھا لا ہےاور شفیق پریس نے لاہور سے اسے شائع کیا اس کتاب میں اقلیتوں کو درپیش حقیقی مسائل، بین الاقوامی قانون اور شرعی قانون(دوسروں کے ساتھ تعلق کی جہت سے)پربحث کی گئی ہے۔

9۔اہل کتاب سے متعلق مسائل و احکام

یہ کتاب اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۲۵ ویں فقہی سیمی نار مورخہ ۵ تا ۷ فروری ۲۰۱۶ء منعقدہ جامعہ دارالحدیث بدر پور(آسام) میں پیش کئے جانے والے علمی و تحقیقی مقالات اور مباحث کا مجموعہ ہے اس کتاب کے ۴ ابواب میں اہلِ کتاب، عہدِ جدید کے اہل کتاب،موجودہ دورِ کے اہل کتاب کے احکام اور اہل کتاب سے متعلق دینی احکام پر مقالہ جات شامل کیے گئے ہیں۔

10۔الاقلیات :روی اسلامیہ

یہ کتاب مجلہ المسلم المعا صر میں چھپنےوالے تحقیقی مقالہ جات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں ڈاکٹر اسماعیل الفاروقی، استاذابو بکر قادری، ڈاکٹر ابراہیم عبدالحمید،ڈاکٹر محمد کمال امام اور ڈاکٹر محمد سلیم العلوانی کے مقالہ جات کو شامل کیا گیاہے۔اس کے موضوعات میں مسلم اورغیر مسلم اقلیات کے مسائل میں اصول،مسلم اقلیات اور انسانی حقوق،مذہبی آزادی،اقتصادی آزادی وغیرہ شامل ہیں۔۲۰۱۱ میں ۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دارنہضہ مصرنے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں اقلیات کے معاشرتی موضوعات میں سے دینی آزادی اور اقتصادی آزادی پر بحیثیت انسان زیادہ زور دیا گیا ہے۔

11۔فقہ النوازل(دراسۃ تا صیلیۃ تطبیقیۃ)

اس کتاب کے مصنف محمد بن حسین الجیرانی ہیں۔یہ کتاب دارابن الجوزیہ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب کل ۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں اقلیات کا معنی، اقلیات کی اقسام،اقلیت بننے کے اسباب، اجتہاد کا حکم،عصر حاضر میں فقہ الاقلیات اور اقلیات کے عمومی احکام پر بحث کی گئی ہے۔

12. Muslim Minorities in Non-Muslim Society

صالحہ عابدین بنت سیدزین العابدین اس مجلہ کوسعودی عرب سے شائع کررہی ہیں اس مجلہ میں غیرمسلم معاشروں میں مسلمانوں کے مسائل کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔

مصرمیں مجمع البحوث الاسلامیہ(قیام۱۹۶۱)،مکہ مکرمہ میں المجمع الفقھی الاسلامی (قیام۱۹۷۷)،جدہ میں انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی(قیام۱۹۸۳)پاکستان میں"اسلامی نظریاتی کونسل۔کویت میں المنظمۃالاسلامیۃللعلوم الطبیۃ،شمالی امریکہ میں مجمع فقھاءالشریعہاورالمجلس الفقھی، یورپ میں المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث (قیام۱۹۷۹)برطانیہ میں" مجلس تحقیقات شرعیہ،ہندوستان میں اسلامک فقہ اکیڈمی

انڈیا(قیام۱۹۸۹)وغیر ہم جیسے ادارے مختلف اغراض و مقاصد کے ساتھ قائم ہوئے۔ ان اداروں کے قیام کاایک مقصد غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کے خالصتاً دینی ومعاشرتی مسائل کے حل کے لئے مناسب تجاویز دینا ہے۔

گزشتہ وموجودہ صدی کی چند اہم مسلم شخصیات ڈاکٹر یوسف القرضاوی، شیخ محمد عبدہ دکتوروھبہ زحیلی،ڈاکٹر خالد ابو الفضل،اسماعیل راجی الفاروقی،طٰہٰ جابرالعلوانی،سر سید احمد خان، مفتی محمد شفیع ،مولانا مودودی،جلال الدین عمری، علامہ غلام رسول سعیدی، مفتی جلال الدین قادری،ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی، ڈاکٹر ضیاء الدین سردار،سیف اللہ خالد رحمانی اور ڈاکٹر خالد مسعود نے اس موضوع پر فقہی اور اجتہادی نقطہ نظر سے قلم اٹھایا ہے۔

مسلمانوں کے معاشرتی مسائل پر جو کچھ بھی تحریر کیا گیا ہے، وہ عام طور پر کسی خاص ملک کے مسلمانوں کے مسائل تک محدود رہا ہے۔ تاہم، مسلم اقلیتوں کے مسائل اور ان کے احکام کو حالات و زمانہ کی رعایت سے، قرآن و سنت اور فقہی تشریحات کی روشنی میں سمجھنے اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کی ضرورت آج کے دور میں پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔ یہ کتاب اس خلا کو پُر کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔

فہرست مضامین

باب اول

مسلم اقلیات، تاریخ و مسائل

فصل اول: مسلم اقلیات کی تاریخ

مبحث اول: اقلیات کا معنی و مفہوم

مبحث ثانی: اقلیات کی تاریخ

مسلم اقلیات کی تاریخ

بین الاقوامی تعلقات و معاملات اور بین المذاہب ہم آہنگی کے سلسلہ میں بین الاقوامی قواعد و ضوابط کی تدوین و تقدیم میں اسلام کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ غیر مسلم اقوام سے تعلقات و معاملات کی بنیادی تعلیمات قرآنی آیات، احادیث نبوی اور خلفاء راشدین کے تعامل و معاہدات میں ملتی ہیں۔ بعد میں فقہائے اسلام نے عہد نبوی و خلافت اسلامیہ کے عہد زریں کے امثال و نظائر اور مآخذ سے غیر مسلموں کے متعلق اصول و ضوابط کا استخراج کیا۔ کلام کو واضح کرنے کے لئے ہم سب سے پہلے اقلیت کا معنی و مفہوم بیان کرتے ہیں:

مبحث اول: اقلیات کا معنی و مفہوم

اقلیت کا لغوی معنی:

اَقَلِیَۃ کی جمع اقلیات ہے اور یہ کثرت کی ضد ہے۔[1]

عمومی اعتبار سے کسی ملک میں افراد کا کوئی خاص گروہ جس کی تعداد دوسروں سے کم ہو اقلیت کہلاتا ہے۔[2]

قرآن کریم میں بھی لفظ قلت لغوی معنی میں کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوٓا۟ إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ[3]﴾

(اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے اس نے تمہیں بڑھا دیا۔)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ۔ ابن منظور، لسان العرب، داراحیاء التراث العربی، بیروت, ۱۴۳۲ء، ج ۷، ص ۳۵۴

[2] ۔ فیروزالدین، جمال الدین محمد بن کرم، مولوی، فیروز اللغات، کراچی: فیروز سنز, راولپنڈی، ۱۳۴۴ھ، ص ۱۰۴

[3] ۔ سورۃ الاعراف ۷:۸۶

﴿وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ[1]﴾

(اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے ملک میں دبے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں تو اس نے تمہیں جگہ دی اور اپنی مدد سے زور دیا۔)

سورۃ البقرۃ میں مزید وضاحت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ[2]﴾

(بارہا کم جماعت غالب آئی ہے زیادہ گروہ پر اللہ کے حکم سے)

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ کثرت کی ضد کے اعتبار سے قلت استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اقلیت کے لیے MINORITY کا لفظ مستعمل ہے۔ آکسفرڈ ڈکشنری میں اقلیت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

The smaller part of a group; less than half of the people or things in a large group or a small group within a community or country that is different because of race, religion, language, etc.

(کسی گروپ کا چھوٹا حصہ۔ کسی گروہ یا ملک کے اندر ایک بڑے گروہ یا چھوٹے گروپ میں آدھے سے کم افراد یا چیزیں جو نسل، مذہب، زبان کی وجہ سے مختلف ہیں۔)[3]

اقلیت کی تعریف ویکیپیڈیا میں اسطرح بیان کی گئی ہے:

In sociology, a minority group refers to a category of people who experience relative disadvantage as

---

1۔ سورۃ الانفال ۸:۲۶

2۔ سورۃ البقرہ ۲:۲۴۹

3. www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/american_english/minority accessed on ۱۲-۰۸-۲۰۲۰

compared to members of a dominant social group.[1]

(سوشیالوجی میں اقلیتی گروپ سے مراد لوگوں کے ایسے گروہ ہیں جو اکثر معاشرتی گروپ کے ممبروں کے مقابلے میں نسبتاً کم فائدے حاصل کرپاتے ہیں)

اقلیات کا اصطلاحی معنی:

اقلیات کا اصطلاحی معنی کیا ہے اس کے بارے قدیم کتب سے کوئی وضاحت نہیں ملتی اور نہ ہی تفاسیر اور حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ بلکہ عہدِ نبوی و عہدِ خلفائے راشدین اور مابعد کے ادوار میں ذمی اور معاہد کی اصطلاحات ملتی ہیں جن سے مراد اقلیت ہے۔

ذمی اور معاہد کی فقہی تعریفات:

ذمی اور معاہد باہم مترادف ہیں۔ المعجم الوسیط میں ان کی تعریف اسطرح بیان کی گئی ہے:

الذمی المعاھد الذی اعطی عھدا یامن بہ علی مالہ وعرضہ ودینہ[2]

(ذمی وہ معاہد شخص ہے جو عہد و پیمان کی وجہ سے وہ اپنے مال، اپنی عزت و آبرو اور دین کے بارے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔)

جبکہ امام کاسانی نے بدائع الصنائع میں ذمی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ لوگ جو عہد و پیمان کے ساتھ سلطنتِ اسلامیہ میں سکونت اختیار کریں۔ ان سے معاہدہ کرنے کی وجہ امام کاسانی نے یہ بیان کی ہے:

﴿انما قبلوا عقد الذمۃ لتکون اموالھم کاموالنا ودمائوھم کدمائنا﴾[3]

(غیر مسلموں سے معاہدہ اس مقصد کے لئے ہے تا کہ ان کا مال ہمارے مال کے برابر ہو اور ان کا خون ہمارے خون کے برابر ہو)

---

[1] www.en.wikipedia.org/wiki/Minority group/accessed on ۰۴-۰۶-۲۰۲۰

[2] ۔ المعجم الوسیط، دارالدعوۃ، قاہرہ، ۲۰۱۱ء، ج۱، ص ۳۱۵

[3] ۔ الکاسانی، علاؤالدین ابو بکر بن سعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ۲۰۱۰ء، ج۶، ص ۸۰

دینِ اسلام، انسانیت اور عدل و مساوات کا دین ہے۔ ریاستِ اسلامی میں غیر مسلموں کے حقوق مسلمانوں کے برابر اور محفوظ تصور ہوتے ہیں۔

مسلم ریاست میں ذمیوں کے متعلق اہم قوانین:

درج ذیل احادیث میں اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق بیان ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الا من ظلم معاهداً او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئاً بغير طيب نفس فانا حجيجه يوم القيامة[1]

(خبر دار ہو جاؤ! جس کسی نے کسی معاہد پر ظلم کیا یا اس کا حق غصب کیا یا اس کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف دی یا اس کی رضا کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو بروز قیامت میں اس کی طرف سے (مسلمان کے خلاف) جھگڑوں گا۔)

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ دستور مملکت کا اہم حصہ تھا۔ چنانچہ ایک دوسری روایت ہے کہ:

ان رجلا من المسلمين قتل رجلًا من اهل الكتاب فرفع الى النبى فقال انا احق من وفى بذمته ثم امر به فقتل[2]

(ایک مسلمان نے ایک اہل کتاب کو قتل کر دیا۔ مقدمہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اہل ذمہ کا حق ادا کرنے کا سب سے زیادہ ذمہ دار ہوں چنانچہ آپ نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا تو اسے قتل کر دیا گیا۔)

1۔ ابو داؤد، سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفیئ والامارۃ، باب فی تعشیر اہل الذمۃ اذا اختلفوا بالتجارۃ، رقم الحدیث:۳۰۵۶

2۔ البیہقی، احمد بن الحسین، السنن الکبریٰ، نشر السنۃ، ملتان، س ن، ج۹، ص ۳۰

رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ احکام میں غیر مسلم معاہدین کی جان کے تحفظ کے سلسلہ میں خاص تاکید اور ذمی کے قتل کے ضمن میں خاص وعید ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

عن عبداللہ بن عمرو عن النبی ﷺ قال من قتل معاھداً لم یرح رائحة الجنه ان ریحھا یوجد من مسیرة اربعین عاما[1]

(حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص نے کسی ذمی کو جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ لیا گیا ہے قتل کیا اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو ستر برس کی مسافت سے سونگھی جاسکے گی۔)

دورِ نبوی ﷺ اور دورِ خلفائے راشدین میں ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر تھی۔ امام شوکانی رقم طراز ہیں:

اخرج البھیقی عن الزھری انھا کانت دیة الیھودی والنصرانی فی زمن النبی مثل دیة المسلم وفی زمن ابی بکر وعمر وعثمان[2]

"امام بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہودی ونصرانی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر تھی اور یہی صورت حال جنابِ ابو بکر، جنابِ عمر اور جنابِ عثمان کے زمانہ میں تھی۔"

فقہاء میں مسلمان کو غیر مسلم کے قصاص میں قتل کرنے کے بارے اختلاف ہے۔ شوافع اور حنابلہ درج ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہوئے مسلمان کو ذمی کے قصاص میں قتل کرنے کے قائل نہیں ہیں:

1۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الجزیہ، باب اثم من قتل ذمیا، رقم الحدیث ۳۱۲۲

2۔ الشوکانی، محمد بن علی، نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار من احادیث سید الاخبار، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۷، ج۷، ص۷٦

لاَ يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ وَلاَ ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ[1]

”کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی معاہد کو جب تک کہ اس کا معاہدہ ہے۔“

فقہائے احناف مسلمان اور ذمی کی دیت برابر ہونے کے قائل ہیں۔ شوافع ایک تہائی اور فقہائے حنابلہ نصف دیت کے قائل ہیں۔ حنفی نقطہ نظر کو علامہ مرغینانی ہدایہ میں بیان کرتے ہیں:

"دیة المسلم و الذمی سواء[2] ”مسلمان اور ذمی کی دیت برابر ہے۔“

اقلیت کی اصطلاحی تعریف:

﴿هی فی العرف الدولی مئات من رعایا دولة من الدول تنتمی من حیث الجنس اواللغة اوالدین الی غیر ما تنتمی الیه اغلبة رعایاها[3]﴾

(ملک کے آئین میں اقلیات ان انسانی گروہ کو کہتے ہیں جو قومیت یا دین یا لغت کے اعتبار سے قوم کی اکثریت سے مختلف ہو۔)

معجم العلوم السیاسیة میں ہے:

﴿الاقلیات جماعة من السکان من شعب معین عددهم اقل من بقیة السکان لهم ثقافتهم ولغتهم ودینهم[4]﴾

”اقلیات خاص قبیلے کے ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کی تعداد باقی لوگوں سے کم ہو ان کا اپنا کلچر اپنی زبان اور اپنا دین ہو۔“

1۔ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، ابواب الدیات، باب لایقتل مسلم بکافر، رقم الحدیث:۲۶۶۰

2۔ المرغینانی، علی بن ابی بکر، الھدایۃ، مکتبہ شرکت علمیہ، ملتان، ج۴، ص۵۸۵

3۔ احمد عطیۃ اللہ، القاموس السیاسی، دار النہضۃ العربیۃ، القاھرۃ۱۹۶۸، ص۹۶

4۔ العمری، احمد سویلم، معجم العلوم السیاسیۃ المیسر، القاھرۃ: الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ص۲۸

ان تعریفات سے معلوم ہوا کہ اقلیات ان لوگوں کو کہا جائے گا جن میں درج ذیل صفات پائی جائیں:

ا۔ ان کی تعداد ملک میں رہنے والے باقی لوگوں کی نسبت کم ہو۔

۲۔ ان کا مذہب اکثریت سے مختلف ہو، جیسے پاکستان میں ہندو، عیسائی اور امریکہ و یورپ میں مسلمان۔

۳۔ ان کی زبان اکثریت سے مختلف ہو جیسے کینیڈا میں فرانسیسی بولنے والے یا پاکستان میں چترالی بولنے والے۔

اقلیات کی لغوی اور اصطلاحی تعریفات کے بعد مختصراً مسلم اکثریتی ممالک کے حوالے سے اہم معلومات ذکر کی جارہی ہیں تاکہ معنی و مفہوم مزید واضح ہو جائے۔ دنیامیں اس وقت ۴۷ ملک ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت بھی ہے اور جو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور بھی ہیں۔[1]

یہی وہ ملک ہیں جن کو عام اصطلاح میں اسلامی ممالک کہا جاتا ہے۔ لیکن دنیائے اسلام صرف مسلم اکثریت رکھنے والے ملکوں تک محدود نہیں۔ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اس کے پیروکار دنیا کے تقریباً ہر حصے میں موجود ہیں۔ کہیں کم، کہیں زیادہ، اور بعض ملکوں میں ان کی حیثیت ایک اہم اقلیت کی ہے ان ملکوں کی مجموعی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔[2]

مسلم اقلیات کی اقسام:

زمانہِ قدیم میں مسلم اقلیتوں کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا اور یہ تینوں حصے مختلف تاریخی پس منظر رکھتے ہیں۔

[1]۔ شہابی، فیض احمد، مسلم دنیا۱۹۹۷تا۲۰۰۲، ادارۃ معارف اسلامی، لاہور، جنوری ۲۰۰۴، ص ۵-۶

[2]۔ صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکشنز لمیٹڈ، لاہور، جون ۲۰۰۴، ص ۱۵، ج ۱

ا۔ پہلی قسم کے مسلم اقلیتی ممالک میں وہ خطے شامل ہیں جو آغازِ اسلام میں آزاد مسلمان مملکتوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن ان میں سے بعض علاقے مسلم سلطنتوں کے زوال کے نتیجے میں غیر اسلامی حکومتوں کے چنگل میں پھنس گئے اور اب وہ کسی غیر مسلم طاقت کے مقبوضات میں شامل ہیں۔ رفتہ رفتہ وہاں ملتِ اسلامیہ کا وجود یا تو ختم ہو گیا یا برائے نام رہ گیا۔ مثلاً مشرقی یورپ میں آباد بلغاریہ، یونان، سربیا، مونٹی نیگرو اور کروشیاء وغیرہ کے مسلمان پہلے سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھے۔ اب وہ ان علاقوں میں مسلم اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں۔[1]

ان کے علاوہ صقلیہ، فرانس اور ہسپانیہ وغیرہ شامل ہیں۔[2]

اسی طرح سے اور متعدد ممالک کے مسلمان ہیں جو ماضی میں آزاد اور خود مختار تھے لیکن آج محکوم ہیں اور مسلم اقلیت کا بڑا حصہ ایسے ہی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ جسکی سب سے بڑی مثال ہسپانیہ ہے۔

۲۔ بعض خطے ایسے بھی تھے جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے مگر انہیں غلبہ نصیب نہیں ہوا یا ایسے خطوں میں مسلمان آج بھی اقلیت میں موجود ہیں مثلاً فلپائن، تھائی لینڈ، برما، نیپال، سری لنکا، کینیا، یوگنڈا، یورپی ممالک اور امریکی ریاستیں شامل ہیں۔[3]

مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ بعض ممالک کی مثالیں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور اسلام کی دعوت پہلی صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہو گئی تھی۔ بعد میں مسلم فاتحین کثرت سے یہاں آتے رہے۔ تقریباً ہزار سال تک مسلم اقتدار کا سورج دہلی میں پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا تا رہا مگر یہاں کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام نہ ہو سکی۔ مسلمان مقامی آبادی میں اقلیت بن کر رہے اور حکمرانی بھی کرتے رہے۔[4]

---

[1]۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، خطباتِ بہاول پور، شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۴۹۴

[2]۔ ایضاً، ص ۴۹۵

[3]۔ صولت، ثروت، دنیا میں مسلم اقلیتیں، معارف اسلامی، کراچی، ۱۹۹۰، ص ۱۱، ج ۱

[4]۔ صولت، ثروت، دنیا میں مسلم اقلیتیں، معارف اسلامی، کراچی، ۱۹۹۰، ص ۱۱، ج ۱

تاہم مسلم اقتدار اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے بعد برقرار نہ رہ سکا۔ اس کے بعد انگریز نے یہاں عنانِ حکومت سنبھال لی اور تقریباً ایک صدی کے بعد ہندوستان کو خیر باد اس طرح کہا کہ اس کا بیشتر علاقہ ہندو قیادت کے سپرد کر دیا۔ یوں صدیوں تک حکمرانی کرنے والی ملت اسلامیہ جو پہلے ہی ہندوستان میں اقلیت میں تھی اب محکوم بھی ہو گئی۔ [1]

[1]۔ ایضاً، ص ۱۲

مبحث دوم: مسلم اقلیات کی تاریخ

عہدِ رسالت ﷺ میں مسلم اقلیت:

رسالت مآب ﷺ کی مکی زندگی اور مسلمانوں کی ہجرتِ حبشہ، مسلم اقلیت کے مسائل و احکام کسی حد تک احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ اسلام ایک عالمگیر اور آفاقی دین ہے اور وہ ہر طرح کے حالات میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی لیے خود رسول اللہ ﷺ کو مختلف صبر آزما حالات سے بھی گزارا گیا تاکہ امت کے لئے ہر طرح کے حالات میں آپ ﷺ کا اسوہ مبارکہ موجود رہے۔ جسے وہ اپنے لیے مشعل راہ بنا سکے اس امر کی گواہی اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید میں دیتے ہیں:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔[1]﴾

(بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے۔)

شریعت اسلامی جس طرح مسلم اکثریت کی رہنمائی کرتی ہے اسی طرح مسلم اقلیت کو بھی لائحہ عمل بناتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ مکیہ ان مسلمانوں کے لیے نقشہ فراہم کرتی ہے جو اپنے طاقتور دشمنوں کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح عہد نبوی ﷺ میں ہجرت حبشہ مسلم اقلیتوں کے لئے بڑی اہم اور نمایاں تاریخی مثال ہے جس سے مسلمانوں کے عالمی کردار کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ مثال رہتی دنیا تک دیگر مسلم اقلیتوں کے لئے ایک نمونہ ہے۔ چند افراد پر مشتمل اس چھوٹے سے لیکن مخلص، متحد، یک زبان، یک رنگ اور یک جہت گروہ نے جو فوائد مسلمانوں کو پہنچائے اس نے مسلمانوں کا اخلاقی اور سیاسی کردار دنیا کے سامنے پیش کیا۔[2]

یہ اسلام کے متعلق وہ تصور اور پیغام تھا جس کے ذریعے اسلام کی وسیع پیمانے پر تبلیغ و توسیع کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ کارنامہ سر انجام دینے والے محض چند افرادِ کار (صحابہ کرام) تھے۔

---

[1] ۔ سورۃ الاحزاب ۳۳:۲۱

[2] ۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، خطباتِ بہاول پور، ۱۹۸۰ء، ص ۴۹۰

عہدِ صحابہ میں مسلم اقلیت:

عہد خلفائے راشدین میں ایسی مسلم اقلیتیں موجود تھیں جن سے مسلم ریاست کو بالخصوص اور مسلمانوں کو بالعموم بہت سے دینی، سیاسی اور اقتصادی مفادات حاصل ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں جنوبی ہندوستان کے ساحل پر کئی ایک مسلم بستیاں معرضِ وجود میں آچکی تھیں جن میں بمبئی (موجودہ ممبئی)، تھانہ گجرات اور مالابار کی بستیاں شامل ہیں جہاں مسلمان ملاح، تاجر اور ان کے اہل خاندان ٹھہرتے تھے۔ ان آنے والوں میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ جیسا کہ پاک وہند میں اور بالخصوص بھارت کے صوبہ گجرات کے بعض مقامات پر واقع ان کے مزارات سے اندازہ ہوتا ہے۔[1]

۴۴ ہجری میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان کا دور تھا۔ المہلب بن ابی صفرۃ نے حملہ کیا اور بنہ (بنوں) ولاہواز (لاہور) تک جا پہنچے۔[2]

اسی طرح بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں بھی صحابہ کرام کے مزارات موجود ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بعثتِ محمدی ﷺ کے وقت سے ہی مسلمان ہجرت کر کے غیر مسلم علاقوں میں دینِ اسلام کی اشاعت کے لئے پہنچے۔ ایسی ہی اقلیتی آبادی فتح سندھ سے قبل سندھ میں موجود تھی۔[3]

اسی طرح چائنہ میں بھی خلافت راشدہ کے فوراً بعد مسلمان تاجر پہنچ گئے اس علاقے میں مقامی روایات کے سبب پہلی صدی ہجری سے باقاعدہ مسلم آبادی چلی آتی ہے اس علاقے میں مسلمان تاجروں کے ساتھ ایک اندوہناک حادثہ پیش آیا جس میں چالیس مسلمان تاجر مقامی ڈاکوؤں کے ہاتھوں اس وقت شہید ہوگئے جبکہ وہ عبادت گزاری میں مصروف تھے ان چالیس مسلمان تاجروں کی قربانی نے وہاں اسلام کا راستہ کھول دیا اور اس واقعے سے متاثر ہو

---

[1]۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، خطباتِ بہاول پور، ص ۴۹۱

[2]۔ بلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر البغدادی الشہیر، فتوح البلدان، مصر، الموسوعات بشارع باب الخلق، ۱۹۰۱ء، ص ۴۳۸

[3]۔ ایضاً، ص ۴۹۱

کر وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مسلمان ہوگئے جس مکان میں ان مسلمان تاجروں کو شہید کیا گیا وہاں مسجد بنادی گئی جو مشرقِ بعید کی قدیم ترین مسجد ہے۔ یہ ننھی سی مسلم اقلیت دنیا کے بالکل دوسرے سرے پر آباد ایک اقلیت ہے جو چین میں چند تاجروں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آئی۔[1]

ہسپانیہ میں اندلس کی مثال لیجئے! مورخین کے عام بیانات کے مطابق یہاں مسلمان ۹۲ ہجری میں طارق بن زیاد کے لشکر کے طور پر آئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۹۲ ہجری سے بہت پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان تاجر اندلس آنے جانے لگے تھے اور اپنے اخلاق و کردار سے وہاں کی آبادی کو متاثر کیا۔[2]

برصغیر میں مسلم اقلیت:

برصغیر میں مسلم اقلیت کی آمد کے ضمن میں سب سے پہلے خلیفہ اول سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور مبارک کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کسی ایسی مہم کا ذکر تو کتب تاریخ و رجال میں نظر نہیں آتا جس کا تعلق براہِ راست زمین پاک و ہند سے ہو۔ البتہ ۱۱ ہجری میں جناب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ کرام کے زیر کمان بحرین وغیرہ کے مقامات پر مرتدین کے خلاف جو جنگیں لڑیں گئیں ان میں ہند اور سندھ کے ان جاٹوں اور ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا جو بحرین اور بلادِ سواحل میں متوطن تھے۔ یہ لوگ وہاں کے مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں شریک ہوئے اور شکست کھائی۔[3]

---

[1]۔ ایضاً، ص ۴۹۳-۴۹۱

[2]۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، خطباتِ بہاول پور، ص ۴۹۳

[3]۔ بھٹی، محمد اسحق، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۴، ص ۳۸

برصغیر میں مسلم اقلیات کا آغاز:

خطہ ہند، سندھ میں مسلم اقلیات کی آمد کا آغاز، عہد فاروقی سن ۱۵ ھ میں ہوا۔ فتوح البلدان میں ہے:

> "حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ۱۵ ہجری میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کو البحرین و عمان کی ولایت پر مقرر کیا وہ خود تو عمان گئے اور اپنے بھائی الحکم کو بحرین بھیجا۔ عمان پہنچ کر انہوں نے ایک دریائی مہم تانہ (تھانہ) کی طرف بھیجی۔ الحکم نے اپنے بھائی المغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا اور خود بزرص (بروچ) پر حملہ کیا دشمن سے مقابلہ ہوا اور اس پر غالب ہوئے"۔ [1]

اس زمانہ میں تھانہ، دیبل اور بروچ یا بھڑوچ ہند کے تین اہم مقامات تھے۔ عہد فاروقی میں چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کرمان اور مکران کے علاقوں میں بھی وارد ہوئے۔ وہاں جنگیں لڑیں اور بہت سے حصوں کو فتح کیا۔ یہ علاقے اس دور میں حدود سندھ میں واقع تھے۔ [2]

پھر جناب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں بلادِ عراق پر عبد اللہ بن عامر بن کریز کو مقرر کیا تو انہیں بحر الہند کی طرف دریائی مہم بھیجنے کا حکم دیا غرض یہ تھی کہ ملک کے حالات سے آگاہی ہو۔ ۳۸ ہجری یا اول ۳۹ ہجری میں حارث بن مرۃ العبدی نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اجازت لے کر سرحد ہند پر حملہ کیا، فتح یاب ہوئے۔ [3]

محمد قاسم فرشتہ اس مہم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۴۴ھ میں حضرت امیر معاویہ نے زیاد بن ابیہ کو بصرہ، خراسان اور سیستان کا حاکم مقرر کیا اور اسی سال زیاد کے حکم سے عبد الرحمٰن

---

[1]۔ بلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر البغدادی الشبیر، فتوح البلدان، الموسوعات بشارع، باب الخلق، مصر، ۱۹۰۱، ص ۴۳۸

[2]۔ بھٹی، محمد اسحٰق، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ص ۴۰

[3]۔ بلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر البغدادی الشبیر، فتوح البلدان، ص ۴۳۸

ربیعہ نے کابل کو فتح کر لیا اور اہل بگوش اسلام کیا۔ کابل کی فتح کے کچھ
عرصے کے بعد ایک نامور عرب امیر مہلب بن ابی صفرہ مرو کے
راستے سے کابل و زابل آئے اور ہندوستان پہنچ کر انہوں نے جہاد کیا
اور دس یا بارہ ہزار کنیز و غلام اسیر کئے ان میں کچھ لوگ توحید اور
آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اقرار کر کے مسلمان ہو گئے۔"[1]

گویا ہندوستان میں جس مسلمان نے سب سے پہلے قدم رکھا اور جہاد کیا وہ مہلب بن ابی صفرہ تھا۔ ان ابتدائی عہدوں میں ہند اور مسلمان عربوں کے درمیان باضابطہ تعلق حجاج بن یوسف کے دور میں قائم ہوا۔ حجاج بن یوسف کے سپہ سالار محمد بن قاسم اور سندھ کے مقامی حکمران راجہ داہر کے لشکروں کے درمیان تصادم ہوا جس میں محمد بن قاسم نے راجہ داہر اور اس کے بیٹے جے سنگھ کو عبرتناک شکست دی۔ جیسا کہ محمد اسحٰق بھٹی لکھتے ہیں:

"پوری قوت اور عظیم فاتح کی حیثیت سے مسلمان اُموی حکمران ولید
بن عبد الملک کے عہد میں ۹۳ھ کو محمد بن قاسم ثقفی کے زیر کمان
پاکستان کے موجودہ صوبہ سندھ کی طرف سے داخل ہوئے تھوڑے
ہی عرصے میں قبیلہ بنو ثقیف کے اس بہادر جرنیل محمد بن قاسم ثقفی
نے سندھ کا تمام تر علاقہ فتح کر لیا اور اس کی سرحدوں کو عبور کر کے
ملتان تک آگے بڑھ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسلامی طاقتوں نے
ہتھیار ڈال دیئے۔ پرچم کفر سرنگوں ہو گیا اور اسلام کے فروغ و
اشاعت کی راہیں لمحہ بہ لمحہ کھلتی چلی گئیں۔"[2]

---

[1] ۔ فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ، المیزان وناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۸۶-۸۶

[2] ۔ بھٹی، محمد اسحق، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ص ۴۵-۴۴

محمد بن قاسم نے قبول اسلام کے لئے مقامی آبادی پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا بلکہ انہیں وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائیں جو ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کا حق تسلیم کی جاتی ہیں۔ سید سلیمان ندوی بیان کرتے ہیں:

"پورے سندھ میں اس نے نہایت عدل و انصاف اور امن کی سلطنت قائم کر دی۔"[1]

سندھ کے لوگ محمد بن قاسم کی رواداری اور عدل و انصاف سے اتنے متاثر ہوئے کہ سلیمان بن عبد الملک کے دور میں جب محمد بن قاسم کو قید کر کے عراق بھیجا گیا تو علامہ بلاذری کہتے ہیں:

"سندھ والوں نے محمد کے جانے کا بہت غم کیا اس کے لئے روئے اور الکیرج میں اس کی شبیہ بنا کے رکھی۔"[2]

سلیمان بن عبد الملک کے بعد عمر بن عبد العزیز خلفیہ ہوئے انہوں نے اس ملک کے بعض فرماں رواؤں کو خط لکھے جن میں ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی۔[3]
چنانچہ بعض سندھی قبائل اور ان کے سردار مسلمان ہوگئے ان میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی شامل تھا۔[4]
الغرض پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اسلامی سلطنت کی حدود ہند، سندھ اور کشمیر کے علاقوں تک وسیع ہو چکی تھیں اور مسلمان کہیں حاکم اور کہیں اقلیت بن کر پہنچ چکے تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوئیں اور اس کا سلسلہ در حقیقت تجارتی آمد و رفت سے وابستہ ہے اس علاقہ

---

[1]۔ ندوی، سلیمان، سید، عرب وہند کے تعلقات، مشعل بکس، پاکستان، ۲۰۰۴، ص ۱۴

[2]۔ بلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر البغدادی الشبیر، فتوح البلدان، ص ۴۴۲

[3]۔ ایضاً، ص ۴۴۲

[4]۔ شیخ، محمد اکرم، آب کوثر، ادارہ ثقافت اسلامی، لاہور، جون ۲۰۰۲، ص ٦٧

میں نہ صرف یہ کہ باہر سے مسلمان آکر آباد ہوئے بلکہ خود ملک کے باشندوں نے بھی اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔

عہد جدید میں مسلم اقلیت:

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ دنیا کی (تقریباً) نصف مسلم آبادی غیر مسلم ممالک میں آباد ہے۔ یہ مسلم اقلیتیں بعض ایسے مسائل سے نبرد آزماہیں جن سے سابقہ ادوار کے مسلمانوں کو واسطہ نہیں پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ہر سلطنت کا ایک مخصوص مذہب ہوتا تھا۔ [1] یہود اسی لیے جزیرۃ العرب میں پناہ گزین ہوئے کیوں کہ وہاں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار، مہاجرین اور یہودیوں کے درمیان جو معاہدہ فرمایا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی کوشش تھی جس میں مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے انسانی حقوق کا احترام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے مذہبی معاملات میں جبر اور تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کریں۔ [2]

جب اللہ رب العزت نے اسلام کو فتوحات عطا کیں اور اسلام دنیا میں پھیلا تو اگر کسی علاقے یا خطے میں اقتدار مسلمانوں کے قبضہ سے نکل جاتا تو مسلمان ایسے علاقوں کی طرف ہجرت کر جاتے جہاں اسلامی حکومت قائم ہوتی۔ کیونکہ جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کی آزادی نہ ہو اور وہاں سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے پر قادر ہوں تو ان پر ہجرت واجب قرار دی گئی ہے۔ [3]

درج بالا سطور میں دار الاسلام کا ذکر ہوا۔ فقہائے اسلام نے دوسری صدی ہجری میں دنیا کی متحارب و غیر متحارب اقوام کو تین اقسام میں منقسم کیا اور ان کے لئے تین اصطلاحات

---

[1] ۔ خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا، غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی، جنوری ۲۰۱۰، ص ۷

[2] ۔ ایضاً، ص ۷

[3] ۔ ایضاً، ص ۸

متعارف کروائیں۔ ان کی تفصیلات تو ہم دوسرے باب کی فصل دوم میں بیان کریں گے مگر یہاں اجمالاً ان اصطلاحات کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ دار الاسلام ۲۔ دار الحرب ۳۔ دار العہد یا دار الامن

دار الاسلام عہد نبوی ﷺ سے عہد عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ تک ایک ہی تھا۔ پھر ساڑھے چار سال کا انقطاع واقع ہوا پھر جب امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ سے صلح کر لی تو دوبارہ دار الاسلام ایک ہی ہو گیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد مکہ اور اطراف مکہ، دار العہد کی مثال ہے۔ سارا عرب جن سے جہاد و قتال جاری تھا، دار الحرب کی مثال ہیں۔ جبکہ حبشہ دار الامن کی مثال ہے۔ اصطلاحات کی تفصیل درج ذیل ہے:

دار الاسلام:

فخر احناف، امام سرخسی نے دار الاسلام کی تعریف اس طرح کی ہے:

﴿وکل موضع کان الظاهر فیه حکم الاسلام فالقوۃ فیه للمسلمین﴾

(دار الاسلام وہ جگہ ہے جو مسلمانوں کے ماتحت ہو اور اس میں مسلمان قوت اور امان میں ہوں)

شیخ ابو زہرہ مصری دار الاسلام کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

﴿دار الاسلام هی الدولة التی تحکم بسلطان المسلمین و تکون المنعة والقوۃ فیها للمسلمین[1]﴾

"دار الاسلام وہ ملک ہے جہاں زمامِ اقتدار مسلمانوں کے ماتحت ہو اور اسکی سیاسی و دفاعی قوت مسلمانوں کے قبضے میں ہو۔"

عہدِ حاضر میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی اسکی جامع تعریف یوں کرتے ہیں:

---

[1] ۔ ابو زہرہ، محمد، العلاقات الدولیہ فی الاسلام، دار الفکر العربی، مصر، ۲۰۱۷ء ص ۵۶

﴿دار الاسلام و هو ان کل ماذخل من البلاد فی محیط سلطان الاسلام ونفذت فیها احکامه و اقیمت شعائره قد صادر من دار الاسلام[1]﴾

وہ ریاست جسکی زمام اسلامی حاکم کے پاس ہو، وہاں اسلام کے قوانین کا نفاذ ہو اور شعائرِ اسلامیہ قائم ہوں تو وہ دار الاسلام ہو جاتا ہے۔

درج بالا تعریفات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دارالاسلام کے لیے مذکورہ شرائط کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سیاسی بالا دستی کا ہونا بھی از بس ضروری ہے۔

۲۔ دارالحرب

غیر مسلموں کے تسلط سے دارالاسلام، دارالحرب ہو جاتا ہے۔

﴿واختلفوا فی دار الاسلام انها بماذا تصیر دار الکفر قال ابو حنیفه انها لا تصیر دار الکفر الا بثلاث شرائط احدها: ظهور احکام الکفر فیها والثانی: ان تکون متاخمة لدار الکفر والثالث: ان لا یبقی فیها مسلم و لا ذمی آمنا بامان الاول وهو امان المسلمین وقال ابو یوسف و محمد رحمهما الله انها تصیر دار الکفر بظهور احکام الکفر فیها[2]﴾

”احناف کا اس بات میں اختلاف ہے کہ دارالاسلام کب دارالکفر ہو جاتا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ کہتے ہیں اس کے لئے تین شرائط ہیں۔ ۱: وہاں کفر کے احکام جاری ہو جائیں۔ ۲: وہ ریاست دارالکفر سے متصل ہو۔ ۳: کوئی مسلمان یا ذمی مسلمانوں کی دی ہوئی پہلی امان کے ساتھ موجود نہ رہے۔ اور امام کاسانی کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک دار کی اسلام یا کفر کی طرف نسبت ہی اس کو

1۔ الزحیلی، الدکتور وہبہ، آثار الحرب فی فقہ الاسلامی، دار الفکر، دمشق، ۱۹۹۷، ص ۱۶۹

2۔ الکاسانی، علاؤالدین ابو بکر بن سعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ۲۰۱۰ء، ج ۶ ص ۱۱۲

دارالاسلام یادارالکفر بنادیتی ہے۔ کیوں کہ اس نسبت سے صاحبین کی مراد احکام کا غلبہ ہوجانا ہے۔"

شیخ ابوزہرہ دارالحرب کی مذکورہ دوسری اور تیسری شرط کے حوالے سے العلاقات الدولیہ میں رقم طراز ہیں:

"دوسری شرط یعنی اسلامی ملک سے متصل ہونا اس زمانے میں مناسب نہیں۔ اس وقت کسی بھی ملک پر پانچ ہزار میل کی دوری سے میزائلوں اور ایٹم بموں سے حملہ آور ہوا جا سکتا ہے۔ امام اعظم کی تیسری شرط کے تناظر میں لکھتے ہیں کہ جب کسی ملک کی طرف سے امن وامان خطرے میں دکھائی دے اس وقت کسی ملک پر دارالحرب کا حکم لاگو ہوسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ شریعت کی روح جنگ کی بجائے امن ہے۔ دارالاسلام اور دارالحرب کی بنیاد، اسلامی اقتدار اور دفاعی قوت ہے۔ جہاں بھی یہ دو چیزیں مسلمانوں کے پاس ہوں وہ دارالاسلام ہے۔[1]

دار الصلح یا دار العہد:

ایسے غیر مسلم ممالک جہاں مسلمانوں کی بالا دستی تو قائم نہ ہو لیکن وہاں کے عوام مسلمانوں کی بالا دستی تسلیم کرتے ہوں اور انہوں نے بقائے باہمی اور پر امن تعلقات کے قیام کے لئے مسلمانوں سے صلح کا معاہدہ کیا ہو۔ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک اس معاہدہ کی وجہ سے وہ اہل الذمہ ہوں گے۔ اور وہ جگہ دار الاسلام ہو گی۔ جبکہ امام شافعی کے نزدیک ایسا علاقہ دارالاسلام نہیں دارالعہد ہو گا۔ امام ماوردی اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

﴿وان یصالحوا علی ان الارضیین لهم ویضرب علیها خراج یودونه عنها وهذا الخراج فی حکم الجزیة متی اسلموا سقط عنهم ولا

[1] ۔ ابوزہرہ، محمد العلاقات الدولیہ فی الاسلام، ص ۱۳۵

يصير ارضهم دارالاسلام و تكون دار عهد و قال ابو حنيفه قد
صارت دارهم بالصلح دار الاسلام و صاروبه اهل ذمة توخذ
جزية رقابهم[1]

"کفار سے صلح کی شرط یہ ہو کہ زمین ان کے قبضے میں ہی رہے گی البتہ
ان سے زمین کے بدلے خراج لیا جائے گا اور یہ جزیہ کے حکم میں
ہو گا اور جب یہی لوگ مسلمان ہو جائیں تو ان کے یہ علاقے دار العہد
ہو جائیں گے۔"

دارالعہد کی مذکورہ تعریف سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں غیر مسلموں سے تعلقات کی بنیاد امن پر ہے۔ لہٰذا عہد جدید میں یو این او(UNO) کے ممبر کی حیثیت سے مسلم اور غیر مسلم ممالک کے تعلقات کی بنیاد دارالعہد کی بنیاد پر ہو گی۔

جسٹس تقی عثمانی کے نزدیک آج دنیا میں تین طرح کے ممالک ہیں۔

۱۔ دار الاسلام، ۲۔ دارالامن، ۳۔ دار الخوف۔

اسلامی نقطہ نظر سے تمام اسلامی ممالک کو ایک ہی ریاست ہونا چاہیے۔ اس کی عملی صورت آج ناممکن ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کے معاشی و دفاعی مفادات و مقاصد کے لئے ہر ریاست اپنی خارجہ پالیسی میں اتحاد عالم اسلامی کو اولین ترجیح دے۔ اس طرح ان میں سے ہر اسلامی ملک پر دار الاسلام کی تعریف صادق آسکتی ہے۔ جب ہر اسلامی ملک دوسرے اسلامی ممالک کے دفاع و تحفظ اور فوجی امداد کو دینی فریضہ سمجھے۔[2]

دارالحرب کی اصطلاح ایک اجتہادی خطاء:

ہندوستان کے مشہور مفکر مولانا وحید الدین خان کے نزدیک دارالحرب کی اصطلاح کسی نص سے ثابت نہیں ہے بلکہ یہ عباسی دور کی ایک اجتہادی اصطلاح ہے۔ مولانا کے نزدیک

---

[1] ۔ الماوری، علی بن محمد، الاحکام السلطانیہ، مکتبہ دار ابن قتیبہ، الکویت، ۱۹۸۹، ص ۱۷۶

[2] ۔ مولانا تقی عثمانی، اسلام اور سیاسی نظریات، مکتبۃ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۰، ص ۳۳۰

اصطلاح دار الحرب کی بجائے دارالدعوۃ کو عصر حاضر میں اسلامی دعوت کے تناظر میں عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

آپ لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک دارالحرب کی اصطلاح ایک اجتہادی خطا ہے۔رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہر قسم کے واقعات پیش آئے مگر آپ نے کسی بھی علاقہ کو دار الحرب قرار نہیں دیا۔اگر قرآن و سنت میں اجتہاد کر کے اس سلسلہ میں کوئی اصطلاح بنائی جائے تو وہ صرف ایک ہو گی، اور وہ دارالدعوۃ ہے۔یہی اسلامی روح کے مطابق ہے۔اسلام ہر قوم کو مدعو کی نظر سے دیکھتا ہے خواہ اہل اسلام کا تعلق ان سے امن کا ہو یا حرب کا۔اس لیے صحیح اسلامی نظریہ کے مطابق صرف دو اصطلاحیں درست ہیں۔دارالاسلام اور دارالدعوۃ۔اس کے سوا جو بھی اصطلاحیں بولی گئی ہیں وہ سب میرے نزدیک اجتہادی خطا کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً دارالحرب، دارالکفر، دارالطاغوت وغیرہ۔"[1]

عہدِ جدید میں دارالاسلام، دارالحرب اور دارالصلح:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے قیام کے بعد کیا اسلامی اصطلاحات (دارالاسلام اور دارالحرب) غیر موثر ہو گئیں ؟۔اس پیچیدہ سوال کے جواب میں ڈاکٹر محمود احمد غازی کہتے ہیں:

> "یہ اصطلاحات (دارالحرب، دار الاسلام) نہ قرآن پاک میں آئی ہیں نہ سنت میں آئی ہیں۔ یہ اصطلاحات فقہائے کرام کی اصطلاحات ہیں اور انہوں نے اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے جب اپنے زمانے کی صورتِ حال کو بیان کیا تو یہ اصطلاحات استعمال کیں۔ خود امام ابو حنیفہ (جنہوں نے دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات

---

[1]۔ وحید الدین خان، مولانا، امن عالم، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۱۵۶

استعمال کیں)، ان کے شاگردوں کے زمانے میں دارالعہد اور دارالصلح کی اصطلاحات بھی وجود میں آگئیں اور پھر اس کے فوراً بعد ہی حنفی فقہاء کے ہاں دارالموادعہ اور دارالامان اور اس طرح کی متعدد اصطلاحات بھی آگئیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے اکثر ممالک دارالعہد کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے کہ وہ سب کے سب بین الاقوامی معاہدوں میں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس وقت بہت سے بین الاقوامی معاملات، بین الاقوامی معاہدات کے نتیجے میں انجام پارہے ہیں۔ اس وقت اقوام متحدہ کے ادارے، اقوام متحدہ کی تنظیمیں مل کر یہ سارے معاملات طے کر رہی ہیں۔"[1]

مذکورہ بالا عبارت کا تجزیہ کریں تو اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اقوام متحدہ کے قیام کے بعد دنیا کے بیشتر ممالک بین الاقوامی معاہدوں میں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس وقت دنیا کا باہمی نظام بین الاقوامی معاہدات کی روشنی میں ہی سرانجام پارہاہے۔ بدیں وجہ دنیا کے اکثر ممالک دارالعہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تتمہ عہدِ جدید میں مسلم اقلیت:

سترہویں صدی سے ایک نئے جمہوری نظام کا تصور اُبھرا۔ حکومت اور کلیسا کی جنگ اور اس جنگ میں حکومت کی فتح نے لادینی جمہوریت کے تصور کو فروغ دیا۔ لادینی جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوگا اور تمام مذہبی گروہوں کو نجی زندگی میں اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی گنجائش ہوگی۔ اس نظام نے ایک نئی صورتحال پیدا کر دی ہے جن ملکوں میں مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا وہاں بھی مسلمان اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ مقیم ہیں۔ جیسے ہندوستان، روس و چین کے بعض صوبے۔ ان ملکوں میں مسلمان نہ تو

---

[1]۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، عصر حاضر اور شریعت اسلامی (محاضرات شریعت)، ص ۲۱۳

اتنے خود مختار ہیں کہ ان کی منشاء کے مطابق ہی قانون بنے اور نہ اتنے مجبور ہیں کہ وہ اعلانیہ اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرنے سے قاصر ہوں لہذا ان ممالک میں مسلمان ایک نئی صورتحال سے دوچار ہیں۔[1]

فقہائے اسلام نے یہ تو بتایا ہے کہ اسلامی ممالک کے تعلقات غیر مسلم ممالک میں بسنے والی مسلم اقلیتوں سے کس نوعیت کے ہونا چاہیے لیکن عملاً کسی ملک میں کوئی اقلیت کس طرح آباد ہے اس کو کیا حقوق و فرائض چاہیئے اور اس کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جارہا ہے یہ سوالات عام طور پر فقہی کتابوں میں موجود مواد میں نہیں ملتے۔[2]

ضرورت اس امر کی ہے مسلم اقلیت کے مسائل و معاملات کے متعلق تحقیق کی جائے اور خاص ان سے متعلق احکام کو جمع کر کے الگ سے مرتب کر دیا جائے۔ فقہ الاقلیات جدید دور میں غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے مسائل و معاملات کے حوالے سے وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

مسلم اقلیات کے اسباب:

دنیا میں مسلم اقلیات کس طرح وجود میں آئیں، آسکتی ہیں یا آئیں گی۔ اس کے اسباب و محرکات درج ذیل ہیں:

قبولِ اسلام:

غیر مسلموں کے درمیان رہنے والے چند لوگ جب اسلام قبول کرلیں اور اس ملک کی اکثریت غیر مسلم ہو تو ان مسلمانوں کو مسلم اقلیات کہیں گے اور یہ پہلا سبب مسلم اقلیات کا ہے۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں مکہ مکرمہ میں مشرکین کے درمیان رہنے والے مسلمان جو کہ باہر سے نہیں آئے تھے بلکہ مکہ ہی کے رہائشی تھے ان کے آباء واجداد مکہ کے رہنے

1۔ غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ص۸-۹

2۔ غازی، ڈاکٹر محمود احمد، خطباتِ بہاول پور، ص۴۸۳

والے تھے انہوں نے اسلام قبول کیا، مسلمان ہوئے، چونکہ ان کی تعداد مشرکین کے مقابلہ میں کم تھی اس وجہ سے تاریخ اسلام میں یہ سب سے پہلے مسلم اقلیات شمار کیے جاسکتے ہیں۔

مقبوضہ مسلم علاقے:

کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اپنا ملک ہو مگر کفار کے قبضہ کرنے کی وجہ سے وہ مغلوب ہو جاتے ہیں اس طرح پھیلتے پھیلتے اکثریت غیر مسلموں کی ہو جاتی ہے جیسا کہ فلسطین کے مسلمان کہ اب وہ تقریباً مکمل طور پر اسرائیل کے تسلط اور قبضے میں ہیں۔

سیاست سے کنارہ کشی:

مسلم اقلیات کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ان کو تب اقلیات کہا جائے گا جب وہ عدد کے لحاظ سے تھوڑے ہوں۔ اگر عدد کے لحاظ سے وہ زیادہ ہوں مگر ان کو سیاسی اقتداری قوت حاصل نہ ہو پھر بھی وہ اقلیات ہی کہلائیں گے۔ جیسا کہ ہند کے مسلمان کہ وہ تعداد کے اعتبار سے ۲۲ کروڑ (سے متجاوز) ہیں۔ اسی طرح تنزانیہ اور لبنان کہ ان ممالک میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے مگر اقتدار غیروں کے قبضہ میں ہے لہذا پھر بھی یہ مسلمان اقلیات ہی کہلائیں گے کیونکہ اگرچہ وہ زیادہ ہیں اقتدار نہ ہونے کی وجہ سے تھوڑوں کے مقابلہ میں پھر بھی تھوڑے اور اقل ہیں۔[1]

ہجرت بوقتِ ضرورت:

مسلم اقلیات کے وجود میں آنے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات مسلمان کام، تعلیم، شادی یا کسی اور جائز غرض کے لئے اپنے ملک کو چھوڑ کر غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو ان ممالک کی شہریت اختیار کر لیتے ہیں اور ان ممالک کے شہری ہو جانے کے ناطے وہاں کے تمام حقوق و اختیارات سے مستفید ہوتے ہیں۔ بعضے ایسے ہوتے ہیں جن کو ان ممالک کی شہریت نہیں ملتی کیونکہ وہ ایک مخصوص مدت کے

---

[1]۔ القرضاوی، ڈاکٹر یوسف، فقہ الاقلیات المسلمہ، دار الشروق، القاہرہ، ۱۴۲۲ھ، ص ۱۷

لئے جاتے ہیں۔ان کو غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل ہو یا نہ ہو بہر طور ان کو مسلم اقلیات میں شمار کیا جائے گا۔

عصرِ حاضر میں مسلم اقلیات کی اقسام:

مسلم اقلیات کی دو قسمیں ہیں:۔

ا۔ غیر اسلامی ممالک کے اصل باشندے

2۔ غیر اسلامی ممالک کے مہاجر باشندے

ڈاکٹر یوسف القرضاوی مسلم اقلیات کی درج بالا دو اقسام کا بالتفصیل تجزیہ کرتے ہیں کہ وہ مسلم اقلیتیں جو ان ممالک کے اصل باشندے ہیں ان کی زیادہ تعداد مشرقی یورپ میں ہے ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں اسلامی فکر کیا ہوتی ہے۔ ان کا تعلق صرف کلمہ شہادت کی حد تک ہے والدین اپنے بچوں کو کلمہ شہادت پڑھا دیتے ہیں۔ دوسری قسم ان مسلم اقلیات کی جو اسلامی ممالک سے آئے تھے۔ ابتدائی دور میں ان کی تعداد غیر مسلم ممالک میں کم تھی اور اسلام کے بارے میں ان کا عقیدہ راسخ نہیں تھا۔ وہ صرف روزگار کی تلاش میں غیر مسلم ممالک میں گئے تھے۔ موخر الذکر مہاجرین وہاں کی عریانی اور فحاشی کی چکاچوند میں اپنا دین، اپنا کلچر بالکل بھول گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آنے والی نسلیں نام نہاد مسلمان بن گئیں اور غیر مسلموں میں اسطرح گھل مل گئیں کہ اب معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بھی مسلمان تھے۔ اس کی واضح مثال ان افغانیوں میں ملتی ہے جنہوں نے آسٹریلیا کی طرف ہجرت کی چونکہ یہ اکثر ان پڑھ، دین سے نابلد تھے انہوں نے آسٹریلیا میں جاکر مسجدیں تو بنائیں، عمارتیں تو کھڑی کر دیں مگر شادی آسٹریلین (Australian) لڑکیوں سے رچالیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اولاد ان کی ازواج کے دین پر ہیں۔ یہ اسلام سے دور اور مذہب سے بیگانہ ہو گئیں، زاں بعد مسجدوں کی صرف عمارتیں رہ گئیں ان کو نماز، عبادات، علمی مجالس کے ذریعے آباد کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ یہی حال ارجنٹائن کے مسلمانوں کا

تھا کہ ان کی پہلی نسل ان ممالک کے معاشرے میں پوری طرح گھل مل گئی اسلام کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ بعض مسلمانوں نے توکھلم کھلا مذہب عیسائیت قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔[1]

مشاہدہ کی بات ہے کہ اب الحمدللہ مسلم اقلیات میں دین کا جذبہ آنے کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی کثرت سے اسلام کی جانب مائل ہورہے ہیں۔ اس کی وجہ مساجد و مدارس کی تعمیرات ان کی آبادکاریاں اور کثرت سے علماء کی آمدورفت ہے۔ کئی اسلامی تنظیمیں ہیں جو بہت لگن اور جذبے کے ساتھ غیر مسلم ممالک میں دین اسلام کا کام کر رہی ہیں اور دین کے پیغام کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ سب ان کے کی کوششوں کا ثمر ہے کہ مسلم اقلیات میں دینی بیداری شروع ہو گئی ہے۔

مسلم اقلیات کی تعداد غیر مسلم ممالک میں:

200سے زائد ممالک کے جامع آبادیاتی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آج ۱.۹بلین سے زائد مسلمان دنیا کے ہر خطے ہر ملک میں رہائش پذیر ہیں۔جو دنیا کی ۲۴٪ آبادی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ۲۰۲۰ کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق دنیا کی موجودہ آبادی ۷.۸ بلین ہے۔[2]

جدید عالمی نقشے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان دنیا کے پانچوں براعظم، ایشیاء، افریقہ، آسٹریلیا، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، یورپ میں موجود ہیں۔

> While Muslims are found on all five inhabited continents, more than 60% of the global Muslim population is in Asia and about 20% is in the Middle East and North Africa. More than 300 million Muslims, or one-fifth of the world's Muslim population, live in countries where Islam is not the majority religion.

---

[1] ۔ القرضاوی، ڈاکٹر یوسف، فقہ الاقلیات، ص ۳۰-۳۳

[2] www.pewforum.org/۲۰۰۹/۱۰/۰۷/mapping-the-global-muslim-population accessed on : ۱۵-۰۷-۲۰۲۰

(مسلمان تمام پانچوں براعظم میں رہائش پذیر ہیں ۔60٪ سے زائد مسلم آبادی اشیاء میں اور 20٪ مڈل ایسٹ اور نارتھ افریقہ میں ہے۔
300 ملین سے زیادہ مسلمان ان ممالک میں رہتے ہیں جہاں اسلام اکثریت والا دین نہیں ہے۔[1]

خطے کے لحاظ سے مسلم آبادی:

۱: ایشیائی خطے میں مسلمان:

2010 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق Asia-Pacific میں مسلم اقلیات کی تعداد 500,705,000 ہے جو یہاں کی آبادی کا 24 فیصد اور دنیا کے مسلمانوں کا 62 فیصد حصہ ہے۔

۲: مشرق وسطہ اور شمالی افریقہ میں مسلمان:

2010 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق مڈل ایسٹ اور نارتھ افریقہ میں مسلم اقلیات کی تعداد 321,869,000 ہے جو یہاں کی آبادی کا 91.2 فیصد اور دنیا کے مسلمانوں کا 19.9 فیصد حصہ ہے۔

۳: صحرائے سہارا افریقہ میں مسلمان:

2010 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق صحرائے سہارا، افریقہ میں مسلم اقلیات کی تعداد 242,544,000 ہے جو یہاں کی آبادی کا 30.1 فیصد اور دنیا کے مسلمانوں کا 15 فیصد حصہ ہے۔

۴: یورپ میں مسلمان:

2010 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق یورپ میں مسلم اقلیات کی تعداد 44,138,000 ہے جو یہاں کی آبادی کا 5.2 فیصد اور دنیا کے مسلمانوں کا 2.7 فیصد حصہ ہے۔

---

[1] www.pewforum.org/۲۰۰۹/۱۰/۰۷/mapping-the-global-muslim-population accessed on : ۱۵-۰۷-۲۰۲۰

۵ : امریکہ میں مسلمان:

2010 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق امریکہ میں مسلم اقلیات کی تعداد 5,256,000 ہے جو یہاں کی آبادی کا 0.5 فیصد اور دنیا کے مسلمانوں کا 0.3 فیصد حصہ ہے۔[1]

دنیا کے 80 فیصد مسلمان ان ممالک میں رہتے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں[2].

اقلیات کی حیثیت سے دنیامیں مسلمان:

اقلیت کی حیثیت سے رہنے والے 317 ملین مسلمان میں سے 240 ملین، تین چوتھائی ان پانچ ممالک میں رہتے ہیں:

۱: ہندوستان (195 ملین)

۲: ایتھوپیا (35 ملین)

۳: چین (28 ملین)

۴: روس (20 ملین)

۵: تنزانیہ (19 ملین)

اقلیتوں کی حیثیت سے رہائش پذیر 10 ممالک میں سے دو ممالک یورپ میں ہیں:

روس (20 ملین) اور جرمنی (4 ملین)۔[3]

یہ اقلیتی آبادی اکثر و بیشتر بڑی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، ہندوستان، ایک ہندو اکثریتی ملک، دنیا بھر میں مسلمانوں کی تیسری بڑی آبادی ہے۔ ایتھوپیا کی مسلم آبادی افغانستان کی

---

[1] https://www.prb.org/muslim-population-growth/accessed on ۱۵-۷-۲۰۲۰

[2] www.pewforum.org/۲۰۰۹/۱۰/۰۷/mapping-the-global-muslim-population accessed on : ۱۵-۰۷-۲۰۲۰

[3] https://worldpopulationreview.com/country-rankings/muslim-population-by-country accessed۱۲-۰۸-۲۰۲۰

نسبت بڑی ہے۔ چین میں شام سے زیادہ مسلمان ہیں۔ روس اردن اور لیبیا کے مشترکہ ممالک سے زیادہ مسلمانوں کا گھر ہے۔ اور جرمنی میں لبنان سے زیادہ مسلمان ہیں۔

مسلم اقلیت جن ممالک میں زیادہ تعداد میں ہیں:

انڈیامیں مسلم اقلیت:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد 195,000,000 ہے جو انڈیا کی آبادی کا 14.20 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 10.9 فیصد ہے۔

ایتھوپیامیں مسلم اقلیت:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق ایتھوپیا میں متوقع مسلمانوں کی تعداد 35,600,00 ہے جو ایتھوپیا کی آبادی کا 33.90 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 1.80 فیصد ہے۔

چین میں مسلم اقلیت:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق چین میں مسلمانوں کی تعداد 28,127,500 ہے جو اس کی آبادی کا 1.73 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 1.60 فیصد ہے۔

روس میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق روس میں متوقع مسلمانوں کی تعداد 20,000,000 ہے جو اس کی آبادی کا 13.5 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 1.0 فیصد ہے۔

تنزانیہ میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق تنزانیہ میں مسلمانوں کی تعداد 19,426,814 ہے جو اس کی آبادی کا 35.20 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 0.80 فیصد ہے۔

موزامبیق میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق موزامبیق میں مسلمانوں کی تعداد 3,830,063 ہے جو اس کی آبادی کا 17.90 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا تقریباً 0.30 فیصد ہے۔

فلپائن میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق فلپائن میں متوقع مسلمانوں کی تعداد 7,913,542 ہے جو اس کی آبادی کا 8.00 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 0.45 فیصد ہے۔

جرمنی میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق جرمنی میں متوقع مسلمانوں کی تعداد 4,750,000 ہے جو اس کی آبادی کا 5.07 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 0.02 فیصد ہے۔

یوگنڈا میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق یوگانڈا میں مسلمانوں کی تعداد 5,435,234 ہے جو اس کی آبادی کا 14.00 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 0.30 فیصد ہے۔[1]

برما میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق برما میں متوقع مسلمانوں کی تعداد 1,800,000 ہے جو اس کی آبادی کا 40 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 4.3 فیصد ہے۔[2]

لاوس میں مسلم اقلیات:

2020 کے آبادیاتی مطالعہ کے مطابق لاوس میں متوقع مسلمانوں کی تعداد 100,000 ہے جو اس کی آبادی کا 5 فیصد اور دنیا میں مسلم آبادی کا 0.01 فیصد ہے۔[3]

---

[1] https://worldpopulationreview.com/country-rankings/muslim-population-by-country

[2] Muslim Minorities and Majorities of Southeast Asia: Focus on Realities Barke, Pakistan Horizon Vol.57, No.2 (April 2004)

[3] J.L, Esposito, op. cit, vol1, pp 94-95.

مسلم اقلیات کے بنیادی مسائل

زمانۂ حال میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہے۔ ہر سال لاکھوں مسلمان روزگار اور بہتر زندگی کی تلاش میں یورپ ،امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے بنیادی مسائل کیا ہیں اور مسلمانوں کا رویہ غیر اسلامی ملک میں کیسا ہونا چاہیے۔واضح رہے کہ اس وقت دنیا میں دو واضح تبدیلیاں آئی ہیں۔اولاً یہ کہ مذہبی جبر وتشدد بہت کم ہو گیا ہے۔اس وقت (2019-24) پوری دنیامیں صرف برما (میانمار) اور چین کا صوبہ سنکیانک ہی ہیں جہاں سے مسلمانوں پر مذہبی جبر وتشدد کی اطلاعات ہیں۔باقی دنیامیں اگر کوئی مسائل باقی ہیں تووہ ثانوی اور فروعی نوعیت کے ہیں۔واضح ہو کہ بھارت میں اس وقت بیس کروڑ سات لاکھ مسلمان موجود ہیں۔[1]

وہاں کے مسلمانوں کے لیے بھی آگے بڑھنے کاواحد راستہ یہ ہے کہ وہ عدم تشدد کے ذریعے اپنے مقاصد کوحاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔غیر مسلموں سے اپنے تعلقات بہتر بنائیں۔سیاسی میدان میں صحیح حکمت عملی اختیار کریں۔پرامن رہیں اور ہر مسئلے کو آئین وقانون اورانصاف وضمیر کی دہائی دے کر اپنا موقف واضح کریں۔ اسی طرح انڈیانے کشمیر کے مسئلے پر جو غیر آئینی اور غیر قانونی رویہ اختیار کرر کھاہے وہ بھی منظرِ عام پر لے کر آئیں۔اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کشمیر کا مختصر تعارف بھی پیش کریں۔

---

[1] http://www.indiaonlinepages.com/muslim-population-in-india accessed on ۱۵-۰۸-۲۰۲۰

مقبوضہ کشمیر کی مختصر تاریخ:

جموں و کشمیر ایک با اختیار ریاست تھی۔ جس کا بیشتر علاقہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے پر پھیلا ہوا ہے۔ جموں و کشمیر کی سرحدیں جنوب میں ہماچل پردیش اور پنجاب، انڈیا، مغرب میں پاکستان اور شمال مشرق میں چین سے ملتی ہیں۔

پاکستان میں بھارت کے مقبوضہ علاقے کو مقبوضہ جموں و کشمیر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جموں و کشمیر ،جموں وادی کشمیر ، لداخ اور گلگت بلتستان میں منقسم ہے۔ بھارت کے زیر انتظام کشمیر کا دارالحکومت سری نگر ہے جبکہ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کا دار لحکومت مظفر آباد ہے۔ وادی کشمیر اپنے حسن کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے جبکہ لداخ جسے "تبت صغیر" بھی کہا جاتا ہے، اپنی خوبصورتی اور بدھ ثقافت کے باعث جانا جاتا ہے۔ ریاست کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاہم ہندو، بدھ اور سکھ بھی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ کشمیر کا فیصلہ تقسیم ہند کے اصول کے تحت اکثریت آبادی کی بنا پر ہونا تھا۔ لیکن سیاسی تنازعات اور مہاراجہ کشمیر کی بھارت کے ساتھ ساز باز نے اخلاقی اور بنیادی حق آزادی کی تحریک کو الجھا دیا۔ اس کے خلاف کشمیر میں عوامی تحریک آزادی شروع ہے جو آج تک جاری ہے۔ [1]

مقبوضہ کشمیر میں اسلام :

چودھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں کشمیر کے ایک راجہ نے، جس کا نام رینچین یا رام چندر بتایا جاتا ہے، ایک عرب مسافر سید بلبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز اور تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا، اپنا اسلامی نام صدر الدین رکھا اور سری نگر میں جامع مسجد تعمیر کی۔ اس طرح کشمیر کے اسلامی دور کا آغاز ہوا۔ پندرہویں صدی کے ربع اول میں کشمیر کو سلطان زین العابدین جیسا نیک دل، رعایا پرور اور علم دوست بادشاہ نصیب ہوا جس نے عدل، تدبر، رحم دلی اور اسلامی اخوت و مساوات کے جذبہ سے ریاست میں اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔

---

[1] ۔wikipedia.org/wiki/جموں وکشمیر -accessed on 4/4/2021

جامع مسجد کے ساتھ دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور علماء کی سرپرستی کی۔ اہل کشمیر اسے ”بڈشاہ“ (بڑا بادشاہ) کہتے ہیں اور اس کے عدل و انصاف اور رعایا پروری کے دوست دشمن سبھی معترف ہیں۔ سلطان زین العابدین کا دور کشمیر کی اسلامی تاریخ کا زریں دور شمار ہوتا ہے۔[1]

کشمیر کا تنازعہ دراصل ۱۹۴۷ کو شروع ہوا جب انگریز نے ہندوستان اور پاکستان کو تو منقسم کر دیا مگر کشمیر کا فیصلہ کشمیری عوام کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

Ever since the division of the sub-continent in 1947, the foundations were laid for the long-standing conflict in and around the regions of Jammu and Kashmir that persists today. India and Pakistan have fought three wars over territory there, and each state continues to assert claims over its entire area. China also holds a large portion of the contested territories. Tensions and unresolved grievances around these historic disputes continue to feed wider regional instability and undermine efforts for demilitarisation in the region.[2]

”1947 میں برصغیر کی تقسیم کے بعد سے ہی آس پاس کی ریاستی تنازعہ کی وجہ سے جموں و کشمیر کی بنیاد رکھی گئی تھی جو آج بھی برقرار ہے۔ ہندوستان اور پاکستان نے یہاں کے علاقوں کو حاصل کرنے کے لئے تین مرتبہ جنگیں لڑیں اور ہر دو ریاستیں جموں کشمیر کے پورے علاقے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ جبکہ چین کے پاس علاقے کا ایک بڑا حصہ ہے۔ ان تاریخی تنازعات کے آس پاس تناؤ اور لاینحل شکایات نے وسیع تر علاقائی عدم استحکام کو فروغ دیا اور یہی وجہ خطے میں امن و سلامتی کی کوششوں کو ناکام بنا رہی ہیں۔“

کشمیر کی موجودہ آئینی حیثیت:

یاد رہے کہ انڈیا میں برسر اقتدار بھارتی جنتا پارٹی کی حکومت نے ۵ اگست ۲۰۱۹ کو انڈین آئین کی شق ۳۷۰ کے خاتمے کا اعلان کر دیا ہے جس کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو نیم خود

[1] http://zahidrashdi.org/1313 –accessed on 4/4/2021

[2] c-r.org/programme/south-asia/jammu-and-kashmir-conflict –accessed on 4/4/2021

مختار حیثیت اور خصوصی اختیارات حاصل تھے۔

بی بی سی کی رپورٹنگ کے مطابق آرٹیکل ۳۷۰ کے خاتمے کے ساتھ ہی مسئلہ کشمیر کی صورتِ حال مزید پیچیدہ اور گھمبیر ہو گئی ہے۔

"تقسیمِ برصغیر کے وقت جموں و کشمیر کے حکمران راجہ ہری سنگھ نے پہلے تو خود مختار رہنے کا فیصلہ کیا تاہم بعد ازاں مشروط طور پر انڈیا سے الحاق پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اس صورتحال میں انڈیا کے آئین میں شق ۳۷۰ کو شامل کیا گیا جس کے تحت جموں و کشمیر کو خصوصی درجہ اور اختیارات دیے گئے۔ تاہم ریاست کی جانب سے علیحدہ آئین کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ جس پر سنہ 1951 میں وہاں ریاستی آئین ساز اسمبلی کے قیام کی اجازت بھی دے دی گئی۔ انڈین آئین کی شق ۳۷۰ عبوری انتظامی ڈھانچے کے بارے میں ہے اور یہ دراصل مرکز اور ریاستِ جموں و کشمیر کے تعلقات کے خدوخال کا تعین کرتا تھا۔ یہ آرٹیکل ریاست جموں و کشمیر کو انڈین یونین میں خصوصی نیم خود مختار حیثیت دیتا تھا اور ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ اور انڈین وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی اس پر پانچ ماہ کی مشاورت کے بعد اسے آئین میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو ایک خاص مقام حاصل تھا اور انڈیا کے آئین کی جو دفعات دیگر ریاستوں پر لاگو ہوتی ہیں اس آرٹیکل کے تحت ان کا اطلاق ریاست جموں و کشمیر پر نہیں ہو سکتا تھا۔"[1]

[1] https://www.bbc.com/urdu/regional-۴۹۲۰۸۷۲۸ accessed on ۱۵-۰۸-۲۰۲۰

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سیاسی میدان میں درست حکمت عملی اختیار کریں۔ پر امن رہیں اور ہر مسئلے کو آئین و قانون اور انصاف و ضمیر کی دہائی دے کر اپنا موقف واضح کریں۔ بی بی سی اور سی این این کے مطابق اس وقت میانمار (برما) اور سنکیانک وہ جگہیں ہیں جہاں مسلمان جبر و تشدد کا شکار ہیں۔[1]

اس ضمن میں اسلامی لحاظ سے بنگلہ دیش اور پاکستان پر بالخصوص اور او آئی سی (O.I.C) پر بالعموم یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ میانمار اور انڈیا کی حکومت سے سنجیدہ گفتگو کریں۔ دوسری تبدیلی یہ آئی کہ دنیا کے اکثر ممالک نے حکومت چلانے کے لیے جمہوریت کو بطور ماڈل اختیار کیا ہے۔ جمہوریت میں کوئی بھی غلام نہیں ہوتا۔ ہر گروہ مناسب حکمت عملی کے ذریعے اپنی اہمیت اور اپنے مطالبات منوانے کی جد و جہد کر سکتا ہے ان دونوں خوش آئند تبدیلیوں کی وجہ سے اب مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ غیر مسلم ملکوں میں اعتماد کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ ایسے مسلمانوں پر دین ہی کی رو سے دو بنیادی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اولاً یہ وہ ملکی قوانین کی پوری پابندی کریں گے۔ اور ثانیاً یہ کہ وہ وہاں اسلام کے سفیر ہوں گے۔ آج اسلام کے تمام اہم احکامات پر ہر جگہ، ہر انسان عمل کر سکتا ہے ، بشرطیکہ عمل کرنا چاہے۔ البتہ چند مسائل جیسا کہ: پردہ اور حجاب، عدالتی فسخِ نکاح، حقِ طلاق کے لئے تخصیص، حصولِ شہریت کے لئے پیپر میرج، بینکوں سے لین دین کے معاملات وقف و بیع کے مسائل اور حلت و حرمت کے حوالے سے آج بھی دشواریاں موجود ہیں۔ ذیل میں ہم مسلمانوں کے بنیادی اور اہم مسائل کے حوالے سے تحریر کریں گے:

[1] https://edition.cnn.com/interactive/۲۰۱۷/۰۹/world/myanmar-rohingya-refugee-stories accessed on ۱۵-۰۸-۲۰۲۰

مسلم اقلیات کے اہم بنیادی مسائل:

غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر مسلم اقلیات کے مسائل جاننے کے لئے ہم نے امریکہ، یورپ، انگلینڈ، کوریا اور چائنہ میں موجود مسلم خواتین و حضرات سے بذریعہ انٹرنیٹ رابطہ کیا۔ اول الذکر ممالک کا دورہ بھی کیا تاکہ وہاں مسلمانوں کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کی جاسکے۔ ذیل میں ہم ان مسائل کو ترتیب وار ذکر کریں گے۔

ا: پردہ اور حجاب:۔

غیر اسلامی ممالک میں ہجرت کرنے والے مرد وزن، اسلامی تشخص، شعائر اسلامیہ اور ہر وہ پہچان جو اسلام ایک مسلمان کو عطا کرتا ہے، ترک کرنے پر ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں۔ جبکہ راسخ العقیدہ مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی جائیں اپنی شناخت سے جڑے رہتے ہیں۔ غیر اسلامی ممالک خصوصاً فرانس میں رہنے والی مسلم خواتین کو حجاب کے حوالے سے انتہادرجے کا تعصب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک میں بھی خواتین کے سروں سے سکارف کھینچنے کے بے شمار واقعات خبروں کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم پردہ اور حجاب کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں: یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پردہ عورت کی پاکیزگی کا ضامن ہے اور مسلمان عورت کی زندگی اور دین کا ایک جزہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ﴾[1]

(اے نبی اپنی بیبیوں اور صاحبزادیوں (**بیٹیوں کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ مصطفیٰ ﷺ کی ایک سے زائد بیٹیاں تھیں**) اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرمادو کہ اپنی چادروں کا

[1]۔ سورۃ الاحزاب ۳۳:۵۹

ایک حصہ اپنے منہ پر ڈالے رہیں یہ اس سے نزدیک تر ہے کہ ان کی پہچان ہو تو ستائی نہ جائیں۔)

مفسرِ شہیر ابو الحیان اندلسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"زمانہ جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ آزاد عورتیں اور باندیاں دونوں قمیص اور دوپٹے میں چہرہ کھول کر نکلتی تھیں اور جب وہ رات کے وقت قضاء حاجت کے لیے کھجوروں کے جھنڈ اور نشیبی زمینوں میں جاتیں تو بدکار لوگ بھی ان کے پیچھے جاتے اور بعض اوقات وہ آزاد عورت سے بھی دست اندازی کرتے اور یہ کہتے کہ ہم نے اس کو باندی گمان کیا تھا تب آزاد عورتوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ باندیوں سے مختلف وضع قطع اختیار کریں۔ بڑی چادروں اور کمبلوں سے اپنے سروں اور چہروں کو ڈھانپ لیں تاکہ وہ باحیا اور معزز رہیں۔"[1]

بے پردہ عورتوں کا دنیوی اور اخروی انجام برا ہے۔ دنیوی انجام تو ہر کوئی معاشرے میں اپنی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے کہ عزت دار اور باحیا لوگوں میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی بدیں وجہ لوگ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ ایسی عورت خود خطرناک بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے یہ ان بے پردہ عورتوں کا دنیوی انجام ہے۔ بے پردہ عورتوں کا اخروی انجام حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جہنمیوں کی دو قسمیں ایسی ہیں جنہیں میں نے (اپنے زمانے میں) نہیں دیکھا (بلکہ وہ میرے بعد والے زمانے میں ہونگے) ا: وہ لوگ جن کے پاس گائے کی دم کی طرح کوڑے ہونگے جن سے وہ لوگوں کو

1۔ اندلسی، ابو الحیان محمد بن یوسف، البحر المحیط، ج۷، ص ۲۵۰

ماریںگے۔ ۲: وہ عورتیں جو لباس پہننے کے باوجود ننگی ہونگی، مائل کرنے
والی اور مائل ہونے والی ہوں گی، ان کے سر موٹے اونٹ کی
کوہانوں کی طرح ہونگے یہ نہ جنت میں جائیں گی نہ اسکی خوشبو پائیں
گی حالانکہ اس کی خوشبو بہت دور سے آتی ہو گی۔ [1]

درج بالا بحث سے معلوم ہوا کہ پردہ عورت کا اختیاری فعل نہیں کہ چاہے تو کرلے اور اگر دل چاہے تو نہ کرے بلکہ عورت پر پردہ کرنا ضروری ہے اور جو عورتیں پردہ نہیں کرتیں ان کے لئے قرآن و حدیث میں وعید آئی ہے۔ غیر مسلم ممالک میں خواتین کو جن مشکلات کا سامنا ہے ان میں سے ایک پردہ کرنا بھی ہے کیونکہ بعض ایسے ممالک ہیں جنہوں نے عورت کے حجاب پر پابندی لگائی ہے یہاں تک کہ فرانس کی ایک یونیورسٹی سے چند مسلم طالبات کو صرف اسی وجہ سے نکال دیا گیا کہ انہوں نے شریعت کے مطابق حجاب کیا ہوا تھا۔ [2]

یہ صرف فرانس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اور بھی کئی غیر مسلم ممالک ہیں جن میں ایسے ہوتا ہے برطانیہ میں ایک کالج سے دو مسلم طالبات کو صرف اس وجہ سے نکالا گیا کہ انہوں نے حجاب کیا ہوا تھا۔ [3]

پردہ اور حجاب میں فرق

شرعی پردہ دراصل دو پردوں پر مشتمل ہے۔

۱: اندرون خانہ، ۲: بیرون خانہ

اول الذکر گھر کے اندر کا پردہ جس کے بارے سورۃ النور میں احکام بیان ہوئے ہیں ان احکامات کو "احکاماتِ ستر" کہا جاتا ہے۔

---

[1] ۔ قشیری، امام ابوالحسین، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، رقم: ۲۱۲۸

[2] ۔ جریدۃ اللواء النبانیۃ، ۱۹۸۹-۱۱-۱۵

[3] ۔ جریدۃ الحیاۃ ومجلۃ العالم، ۱۹۹۰

ثانی الذکر گھر کے باہر کا پردہ جس کے بارے احکامات سورۃ الاحزاب میں وارد ہوئے ہیں اور یہ احکامات "احکاماتِ حجاب" کہلاتے ہیں۔

ستر و حجاب میں فرق

پردے کے حوالے سے اکثر لوگ ستر اور حجاب میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے حالانکہ شریعتِ اسلامیہ میں ان دونوں کے احکامات الگ الگ ہیں ۔ احکامِ ستر کے حوالے سے کتب فقہ میں تفصیل موجود ہے۔

یجب علی المکلف ستر عورته خارج الصلاۃ عن نفسه و عن غیرہ ممن لا یحل له النظر الی عورته الا الضرورۃ کالتداوی وحد العورۃ من المراۃ الحرۃ خارج الصلاۃ هو ما بین السرۃ والرکبة اذا کانت فی خلوۃ او فی حضرۃ محارمها او فی حضرۃ نساء مسلمات فیحل لها کشف ءاعدا ذلك من بدنها بحضرۃ هولا الخ[1]

مکلف کے لئے نماز کے علاوہ بھی ستر چھپانا فرض ہے۔اس کے ستر کی طرف سوائے طبیب کے یا کسی شرعی عذر کے علاوہ، دیکھنا جائز نہیں ہے۔ ستر جسم کا وہ حصہ ہے جس کا ہر حال میں دوسروں سے چھپانا فرض ہے ما سوائے زوجین کے یعنی خاوند اور بیوی اس حکم سے مستثنٰی ہیں۔ مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے اور عورت کا ستر ہاتھ پاؤں اور چہرے کے علاوہ پورا جسم ہے۔ایک اور روایت کے مطابق عورت کا سارا جسم ستر ہے سوائے چہرے اور ہاتھ کے۔ البتہ عورت کے لئے عورت کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ معمول کے حالات میں ایک عورت ستر کا کوئی بھی حصہ اپنے شوہر کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں کھول سکتی۔

ستر کا یہ پردہ ان افراد سے ہے جن کو شریعت نے ''محرم'' قرار دیا ہے۔ ان محارم کی فہرست سورۃ النور کی آیت ۳۱ میں موجود ہے۔ستر کے تمام احکامات سورۃ

---

[1] ۔عبدالرحمٰن الجزیری،کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة،داراحیاء التراث العربی،بیروت،الطبعة الثالثة،۱۹۹۱ء، کتاب الصلاۃ،باب ستر العورۃ خارج الصلاۃ،ج۱،ص۱۹۱

النور میں بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیلات احادیث نبوی ﷺ میں مل جاتی ہیں۔ گھر کے اندر عورت کے لئے پردے کی یہی صورت ہے۔البتہ حجاب عورت کا وہ پردہ ہے جسے گھر سے باہر کسی ضرورت کے لئے نکلتے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔اس صورت میں شریعت کے وہ احکامات ہیں جو اجنبی مردوں سے عورت کے پردے سے متعلق ہیں۔ حجاب کے یہ احکامات سورۃ الاحزاب میں بیان ہوئے ہیں۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ گھر سے باہر نکلتے وقت عورت جلباب یعنی بڑی چادر (یا برقع) اوڑھے گی تاکہ اس کا پورا جسم ڈھک جائے اور چہرے پر بھی نقاب ڈالے گی تاکہ سوائے آنکھ کے چہرہ بھی چھپ جائے۔

گویا حجاب یہ ہے کہ عورت سوائے آنکھ کے باقی پورا جسم چھپائے گی۔[1]

چہرے اور ہاتھ کا پردہ

یہ مسئلہ ابتداء سے ہی فقہاء کے مابین اختلاف کا موضوع رہا ہے۔خود صحابہ کرام کی آراء چہرے پر نقاب کے تعلق سے مختلف رہی ہیں۔چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے "زینة" (جس کے چھپانے کا عورتوں کو حکم دیا گیا ہے) کی تفسیر عورت کی زیب وزینت کی اشیاء مثلاً: لباس، زیورات وغیرہ سے کی ہے، یعنی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ عورت اتنی شدت کے ساتھ پردے کی پابند ہو کہ اس کی زیب وزینت کی اشیاء بھی اجنبی مردوں کے سامنے ظاہر نہ ہوں، البتہ اس زینت کو چھپانے کے لئے جو بڑی چادر یا برقع استعمال کیا جاتا ہے اگر وہ اجنبی مردوں کی نگاہوں میں آجائے، اسی طرح اگر اس چادر یا برقع کے نیچے سے لباس کے کنارے ظاہر ہوں تو اس میں مضائقہ نہیں، کیونکہ ان کو چھپانے میں حرج اور تنگی ہے۔ البتہ حضرت عبد اللہ بن عباس اسکی تفسیر چہرہ سے کرتے ہیں، لیکن اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام میں اجنبی مردوں سے چہرے کا پردہ نہیں، بلکہ صرف ستر عورت سے

---

[1]۔ سورۃ الاحزاب ۳۳:۵۹

چہرے کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، حرج اور تنگی کی بناء پر۔ اور اجنبی مردوں سے پردے کے حکم میں عورت کا باقی بدن اور چہرہ برابر ہیں کہ ان سب کو چھپانا ضروری ہے۔ علامہ حافظ ابن کثیر رقم طراز ہیں:

> وقال ابن مسعود کالرداء والثیاب یعنی علی ما کان یتعاطاه نساء العرب من المقنعة التی تجلل ثیابها، ومایبدو من اسافل الثیاب فلاحرج علیها فیه، لان هذا لایمکن اخفاؤه عن عبد الله قال فی قوله: "ولایبدین زینتهن" الزینة القرط والدملوج والخلخال والقلادة قال: الزینة زینتان، فزینة لایراها الا الزوج، الخاتم والسوار، وزینة یراها الاجانب وهی الظاهر من الثیاب[1]

صرف حافظ ابن کثیر ہی نہیں، بلکہ تمام مفسرین نے اس مقام پر اس سے ملتے جلتے الفاظ میں اس کی تفسیر کی ہے۔ ملاحظہ ہو: علامہ آلوسی کی روح المعانی، قاضی شوکانی کی فتح القدیر، جصاص کی احکام القرآن، علامہ قرطبی کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن، علامہ قرطبی ہی کی احکام القرآن، تفسیر ابن جریر، تفسیر بحر محیط، تفسیر ابو السعود، تفسیر زاد المیسر، تفسیر در منثور، تفسیر روح البیان، تفسیر مظہری، تفسیر معالم التنزیل، تفسیر جمل اور تفسیر بیضاوی وغیرہ۔

مغرب کی حجاب مخالف تحریکوں کے حامی ہمارے بعض متجددین اس اختلاف کی غلط تصویر پیش کرتے ہیں اور پردے کو اسلام مخالف لباس ثابت کرنے پر مُصِر ہیں۔ ہماری رائے میں محض اختلاف ہونا کسی امر کے جائز ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اہلِ ایمان کا کسی مسئلہ میں جب اختلاف ہو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی جانب لوٹائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

> فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ[2]

---

[1]۔ ابن کثیر، حافظ اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۴، ص ۵۳۸

[2]۔ سورۃ النساء ۴:۵۹

اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اپنے تنازعات اللہ اور رسول کی طرف لوٹادو۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ پردے کو لے کر اکابر میں جو بھی اختلاف ہے وہ اس کے وجوب سے متعلق ہے۔ پردے کے استحباب پر کبھی بھی علماء و فقہاء میں اختلاف نہیں رہا۔ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے متعلق یہ بات متحقق ہے کہ وہ چہرے کا پردہ کیا کرتی تھیں۔ ازواج مطہرات کی زندگیاں اور ان کا طرز معاشرت مسلمان خواتین کیلیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جملہ فقہاء قولِ مصطفیٰ ﷺ کے موافق بلا ضرورت اور بلا عذر شرعی مردوں کے لیے عورتوں کا چہرہ دیکھنا حرام ہی قرار دیتے ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

يَا عَلِيُّ لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَإِنَّ لَكَ الأُولَى وَلَيْسَتْ لَكَ الآخِرَةُ[1]

اے علی نظر پڑ جانے کے بعد پھر نظر نہ ڈالو (یعنی اگر کسی عورت پر ناگہاں نظر پڑ جائے تو پھر اسکے بعد دوبارہ اس کی طرف نہ دیکھو) کیونکہ تمہارے لئے پہلی نظر تو جائز ہے (جبکہ اس میں قصد و ارادہ کو قطعًا دخل نہ ہو) مگر دوسری نظر جائز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پردے کا وجوب ایک الگ اور مستقل موضوع ہے۔ ستر اور برہنگی سے متعلق دینی ہدایات کا مخاطب افراد یعنی مرد و زن ہیں اور ان کی اہمیت بنیادی طور پر شخصی اخلاقیات اور تہذیب نفس کے پہلو سے ہے۔ اس حیثیت سے مردوں کی آزمائش یہ ہے کہ نگاہوں اور خیالات کو پاکیزہ بنائیں، اور خواتین کی آزمائش یہ ہے کہ جسمانی حسن اور زیب وزینت کی نمائش کی جبلت کو قابو میں رکھیں۔ یعنی یہ یک طرفہ نہیں، بلکہ دو طرفہ تہذیب وتربیت کی تعلیم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر

---

[1]۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، کتاب الادب، باب ماجاء فی نظرۃ الفجاءۃ، رقم الحدیث: ۲۷۷۷

مسلم ممالک بالخصوص اور مسلم ممالک بالعموم چونکہ سیکولر ہیں اس لیے نا تو کوئی پردہ ہے نا کوئی حدود و قیود، لڑکیاں نیم عریاں لباس میں بر سر عام پھرتی ہیں۔ مجمعِ عام کے سامنے مرد و عورت بوس و کنار کرتے ہیں۔ پارکوں اور تفریح گاہوں میں بغیر پردے کے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ایک مسلمان عورت کے لئے اسلامی لباس پہننا اور پردہ کرنا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس تمام صورت حال کے باوجود ایسی مسلمان عورتیں بھی ہیں جو ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے پردے کی پابند ہیں اور یہی اسلام کا فخر ہیں۔

۲: مخلوط معاشرہ:

غیر اسلامی ممالک میں خصوصاً اور اکثر اسلامی ممالک میں عموماً مخلوط معاشرہ، مخلوط تعلیم، دین پسند لوگوں کے لئے ایک بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ شریعت اسلامیہ میں بلا عذر اختلاطِ مرد و زن کی ممانعت ہے۔ ابتدائے اسلام میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی ضرورت کے لئے رسول اللہ ﷺ کے گھر تشریف لاتے تھے اور بغیر ضرورت کے امہات المومنین سے کلام کیا کرتے تھے۔ باوجود کہ امہات المومنین ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو بھی پسند نہیں فرمایا اور وحی نازل فرمائی کہ کوئی مسلمان رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کے سامنے آکر سوال نہ کرے بلکہ پردہ کی آڑ میں کوئی چیز دریافت کرنا چاہے تو کرلے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ﴾[1]

(اور جب تم اُن سے برتنے کی کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو اس میں زیادہ ستھرائی ہے تمہارے اور ان کے دلوں کی۔)

علامہ غلام رسول سعیدی درج بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

[1]۔ سورۃ الاحزاب ۳۳:۵۳

"اس آیت میں دلیل ہے کہ مسلمان ازواج مطہرات سے پردے کی آڑ سے دینی مسائل بھی معلوم کر سکتے ہیں اور دنیاوی ضرورت کی چیزیں بھی طلب کر سکتے ہیں اس میں عام مسلم خواتین بھی داخل ہیں کیونکہ عورتیں مجسم چھپائی جانے والی ہیں ان کا بدن اور انکی آواز سب مستور ہے۔"[1]

سنن ابو داؤد میں روایت ہے:

﴿عَنْ حَمْزَةَ بْنِ أَبِي أُسَيْدٍ الْأَنْصَارِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ وَهُوَ خَارِجٌ مِنَ الْمَسْجِدِ فَاخْتَلَطَ الرِّجَالُ مَعَ النِّسَاءِ فِي الطَّرِيقِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلنِّسَاءِ: اسْتَأْخِرْنَ، فَإِنَّهُ لَيْسَ لَكُنَّ أَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيقَ، عَلَيْكُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِيقِ﴾[2]

”حضرت ابو اسید انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب مسجد کے باہر آپ ﷺ نے مرد و عورت کے اختلاط کو دیکھا تو آپ نے عورتوں سے فرمایا رک جائیں! عورتوں کے لئے جائز نہیں کہ پورا راستہ گھیر کر چلیں تم پر ضروری ہے کہ تم راستے کے کنارے چلو۔“

درج بالا روایت سے معلوم ہوا کہ محرم کی موجودگی کے بغیر کسی بھی کام میں، کسی بھی موقع پر اجنبی مرد و عورت کو تنہا ہونے کی اجازت نہیں۔ بدیں وجہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ضیاء القرآن پبلیشنز: لاہور، ج۹، ص ۵۲۸

[2]۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، المکتبۃ العصریہ، بیروت، ۲۰۰۹، کتاب الادب، باب فی مشی النساء (مع الرجال) فی الطریق، رقم الحدیث: ۵۲۷۲

"خبر دار کوئی بھی شخص عورت کے پاس رات نہ گزارے مگر یہ کہ اس کا خاوند ہو یا محرم ہو۔"[1]

شیطان کا کام تو گناہ ہی کروانا ہے۔ جب بھی کوئی مرد غیر عورت کے ساتھ تنہائی میں ہو گا تو شیطان بھی وہاں موجود ہو گا۔ جو جذبات کو ابھارے گا اور دلوں میں بدکاری کے وسوسے ڈالے گا۔ اسی وجہ سے ہادی اعظم ﷺ نے سختی کے ساتھ غیر محرم کے پاس تنہائی میں رہنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ حدیث مبارکہ ہے:

"ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ مرد تو آپ کی باتیں سن لیتے ہیں ہمارے لیے بھی اپنی طرف سے ایک دن مقرر فرما دیجئے تاکہ ہم اس دن جمع ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ نے جو آپکو علم دیا ہے اس میں سے کچھ ہم کو بھی سکھا دیا کریں چنانچہ آپ نے ان کے لئے ایک دن مقرر فرما دیا۔"[2]

درج بالا حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئی: ۱: علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ خاتون اس کے بارے میں اتنی فکر مندی کا اظہار کرتیں اور نہ نبی ﷺ اس کا اہتمام فرماتے۔ ۲: مسلمان عورتیں شریعت کے احکامات کی رو سے یہ جانتی تھیں کہ عورتوں کا مردوں کی مجالس میں جا کر بیٹھنا درست نہیں۔ لہذا مرد تو رسول اللہ ﷺ سے خوب استفادہ کرتے لیکن عورتیں اس سعادت سے محروم رہ جاتی تھیں۔ خواتین نے اس مشکل کا حل خود سوچا اور حل نکل آیا۔ یہ نہ صرف ان کے لئے بلکہ دنیا کی ہر مسلمان

---

[1]۔ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، مکتبہ البشریٰ، ۲۰۰۹، کتاب السلام، باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیھا، رقم الحدیث: ۲۱۷۱

[2]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، دار صادر، بیروت، کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء یوم علی حدۃ فی العلم، رقم الحدیث: ۱۰۱

عورت کے لئے ہے اور وہ یہ کہ عورت دینی تعلیم یا کوئی اور ضروری علم و ہنر پردہ میں رہ کر اور اختلاط سے بچ کر حاصل کر سکتی ہے۔

اختلاطِ زن وشو میں حدود شرعیہ کی پاسداری:

مسلمان خاتون اپنے وکیل یا سربراہ کی اجازت اور رضامندی کے ساتھ گھر سے باہر بھی مختلف تعلیمی و دینی اور سماجی خدمات انجام دے سکتی ہے لیکن وہ کسی حال میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتی کہ شریعت نے اس کے اور اجنبی مردوں کے درمیان اخلاق اور قانون کی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔

سید جلال الدین عمری لکھتے ہیں:

> ”اس کے فرائض حیات کو خانگی میں محصور کرنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ نامحرموں سے اختلاط اور میل جول اخلاقی بگاڑ کا ذریعہ نہ بننے پائے۔ اگر کوئی عورت خدا کی قائم کردہ دیوار کو توڑ کر کسی میدان میں آگے بڑھتی ہے تو اسلام کی نگاہ میں اس کا ہر قدم معصیت اور تباہی کی راہ طے کرتا ہے خواہ اس کی نیت کتنی ہی صاف اور اس کے ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں کیونکہ اس طرح وہ اس مقصد کو پامال کرتی ہے جس کی پامالی شریعت دیکھنا نہیں چاہتی۔ حضور اکرم ﷺ سے زیادہ خدا ترس کون ہو گا؟ کس کی اخلاقی بلندی آپ کی رفعت کردار کا مقابلہ کر سکتی ہے اور ان خواتین کے پاک جذبات آج کی کونسی عورت کو حاصل ہیں جو آپ سے اسلامی احکام کے اتباع کا عہد کرنے حاضر ہوتی تھیں؟ وفاداری کا عہد مرد تو آپ ﷺ کے

ہاتھ میں ہاتھ ملا کر کرتے تھے لیکن ذات اقدس کا دستِ مبارک کبھی
کسی نا محرم خاتون کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا۔"[1]

ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اختلاط مرد و زن کی ممانعت سد ذریعہ سے متعلق ہے۔اسی حقیقت کے پیشِ نظر اسلام آزادانہ اختلاط مر دوزن کی ترویج نہیں کرتا۔بلاضرورت آزادانہ اختلاط تعلیماتِ اسلامیہ کی رو سے جائز نہیں۔اسلام اس بات کو بھی سپورٹ نہیں کرتا کہ اجنبی مرد و عورت جن میں حرمت کا کوئی رشتہ نہ ہو وہ بلا جھجک تنہائی میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں۔اب غیر مسلم ممالک میں ایک مسلمان عورت کے لیے جہاں اور کئی مسائل ہیں وہاں اختلاط بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ مغربی معاشرہ ایک مخلوط معاشرہ ہے۔عورت کو آزادی کے نام پر ہر جگہ اجنبی مردوں کے درمیان لا کھڑا کیا گیا ہے۔مخلوط حیاباختہ ماحول کی وجہ سے بہن ،بھائی،باپ،بیٹی استاد،شاگرد ایسے پاکیزہ رشتوں کا تقدس ختم ہو چکا ہے۔ یہ سب اس لیے کہ اجنبی مرد اور عورت کے درمیان شرم وحیا کی حد فاصل کو ختم کر دیا گیا اور مخلوط معاشرہ کے لئے راہیں ہموار کی گئیں۔

حقیقی رشتوں کا خاتمہ:

کائنات کا حسین رشتہ جسے دین اسلام نے سب سے زیادہ لائق احترام ٹھہرایا اور سب رشتوں پر مقدم ٹھہرایا وہ ماں، باپ کا رشتہ ہے ۔ قرآن کریم نے تاکید کے ساتھ ماں، باپ کے احترام کا حکم دیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ اِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوۡ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِىۡ صَغِيۡرًا﴾[2]

---

[1] ۔سید جلال الدین عمری، عورت اسلامی معاشرے میں، اسلامک پبلیکیشنز لیمٹڈ،۲۰۰۹ء، ص ۲۳۱

[2] ۔سورۃ بنی اسرائیل ۲۴:۱۷۔۲۳

(اور تمہارے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تیرے سامنے ان میں ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے ہُوں (اُف تک) نہ کہنا اور انہیں نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے اور عرض کر کہ اے میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دنوں نے مجھے چھٹپن (چھوٹی عمر) میں پالا۔)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ماں، باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے کہ جب ماں، باپ جوان ہوں اور اپنی ضروریات کے خود کفیل ہوں، اس وقت تو بچے ان کے فرمانبردار ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بچوں پر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن جب بڑھاپا آجاتا ہے صحت بگڑنے لگتی ہے اس وقت سعادت مند اولاد کا فرض ہے کہ انکی خدمت گزاری دل جوئی میں کوئی کمی نہ لائے خدمت ایسے انداز سے کرنی ہے کہ زبان سے اُف بھی نہیں نکالنا کہ مبادہ وہ ناراض ہو جائیں بلکہ غنیمت سمجھ کر انکی خدمت کرنی ہے۔ ان حالات میں اولاد کو چاہیے کہ جب ان سے گفتگو کرے تو ایسے محبت بھرے انداز میں گفتگو کرے کہ ان کے دل باغ باغ ہو جائیں، آنکھیں روشن ہو جائیں اور بے ساختہ دعائیں دینے لگیں۔ یہ ایک اسلامی معاشرے میں ماں، باپ اور بیٹے کے رشتے کی ایک جھلک تھی جو ہم نے بیان کی۔ کیا مسلم اقلیات کو غیر مسلم ممالک میں ایسا معاشرہ اور یہ حقوق اور ایسی اولاد مل سکتی ہے؟ ہر گز نہیں کیونکہ مغرب میں جدیدیت پسندی نے ماں، باپ اور اولاد کو جیتے جی یتیم اور بے سہارا کر دیا، شفقت اور احترام کے جذبوں کو کچل دیا اس معاشرہ میں تو بیٹا جب بالغ ہو جائے تو ماں، باپ کو کچھ اختیار بھی حاصل نہیں وہ کیا کرتا ہے کہاں جاتا ہے کہاں رات گزارتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر باپ سختی کرے یا مارنا چاہے تو بچہ فوراً پولیس بلا لیتا ہے اور اپنے باپ کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے یا خود ہی مارنا شروع کر دیتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

In western Countires Police have a legal responsibility to safeguard children under 18.This includes sharing information held by police which is relevant to protect a child from harm.When a child has been the victim of child abuse within the family, police will often work together with social workers to interview the child or conduct joint visits to the home.Children often calls Police themselves if they become victim of child abuse.[1]

مغربی ممالک میں 18 سال سے کم عمر بچوں کی حفاظت کرنا پولیس کی قانونی ذمہ داری ہے۔ اس میں پولیس کے پاس رکھی گئی معلومات کا تبادلہ کرنا بھی شامل ہے جو کسی بچے کو کسی نقصان سے بچانے کے متعلق ہے۔جب ایک بچہ خاندان میں ہی زیادتی کا نشانہ بنتا ہے تو پولیس مل کر کام کرتی ہے۔بچوں سے انٹرویو لینے یا گھر میں مشترکہ دورے کرنے کے لئے سماجی کارکنوں کے ساتھ جایا جاتا ہے۔ اگر بچے والدین سے بد سلوکی کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اکثر پولیس کو خود فون کرتے ہیں۔ وہاں بوڑھے ماں، باپ کے لئے اولڈ ہوم(Old Home) موجود ہیں جہاں وہ اپنی زندگی کے اخری ایام پر سکون گھر میں گزارنے کی بجائے اذیت کدوں میں گزارتے ہیں۔

یہ تو آج کی بات ہے۔1997 کے روزنامہ نوائے وقت کی ایک رپورٹ ملاحظہ ہو:

"ایک سروے کے مطابق امریکی معاشرے میں نوعمروں کی دہشت گردی پھیل گئی ہے امریکہ کے تقریباً اَسی لاکھ والدین کو اپنے بچوں کے ہاتھوں مار کھانا پڑتی ہے اور چالیس لاکھ سے زائد والدین بچوں کے ناپسندیدہ مطالبات پورے نہ کرنے پر ان کے ہاتھوں پٹتے ہیں۔ اولاد کی اس خرابی کا ذمہ دار ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو ٹھہرایا جارہا ہے۔ امریکہ میں جس قدر قتل ہو رہے ہیں ان میں دو فیصد ایسے والدین ہیں جو اپنے اولاد کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں۔امریکی یونیورسٹی کے

[1] https://www.citizensadvice.org.uk/family/children-and-young-people accessed on 10/4/2021

دماغی علاج کے ماہر ڈاکٹر نے بتایا کہ والدین کی پٹائی سنگین مسئلہ بن گئی ہے۔ بیشتر والدین شرم کے باعث رپورٹ نہیں کرتے، مائیں ابتداء میں اپنے بچوں کی غلطیاں باپ سے پوشیدہ رکھتی ہیں جن کے باعث بچے خراب ہو جاتے ہیں"۔ [1]

آج سے ۲۲ سال پہلے غیر مسلم ممالک میں مغربی معاشرہ کی یہ حالت تھی تو اب حالات کتنے خراب ہونگے اس کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اب ظاہر ہے کہ جب مسلمان غیر مسلم ممالک میں رہیں گے تو ان کے قوانین ماننا بھی ان پر ضروری ہو گا ایسے میں وہ اپنے اولاد کی تربیت اسلام کے مطابق کیسے کر سکیں گے اور ماں، باپ کو جو احترام اسلام نے دیا ہے دیارِ غیر میں وہ اپنی اولاد سے ملنے کی کیسے امید کر سکیں گے۔ یہ مسلم اقلیات کے لیے سب سے بڑھ کر مشکل مسئلہ ہے کہ وہ غیر مسلم ممالک میں رہتے ہوئے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت اسلام کے مطابق کریں۔

عدالتی فسخِ نکاح کا مسئلہ:

غیر مسلم ممالک میں میاں، بیوی رشتہ ازدواج بطریقِ احسن نبھانے سے عاجز آ جائیں تو غیر مسلم جج کے سامنے شریک ہوتے ہیں۔ عورت کے لئے خلع کا حصول ہو یا خاوند مفقود الخبر ہو جائے، عدالتی فیصلے کے ذریعے ڈگری جاری کی جاتی ہے۔ اسلام نے مسلمان عورت کو بغیر کسی قید کے، دنیا میں جہاں بھی ہو، نکاح اور فسخِ نکاح کا اختیار دیا ہے خواہ وہ یتیم ہو یا باندی، مطلقہ ہو یا کنواری، اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ نکاح کے بعد اس کے خاوند کو اس پر حاکم بنایا گیا اور اسکی کفالت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تا کہ عورت کو معاشی بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] ۔ نوائے وقت: ۱۹۹۷-۰۲-۱۶

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾[1]

(مرد افسر ہیں عورتوں پر اس لیے کہ اللہ نے ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی اور اس لیے کہ مردوں نے ان پر اپنے مال خرچ کیے۔)

حسنِ انتظام کا یہ منظر اسلامی معاشرہ کے علاوہ کسی معاشرے میں نہیں پایا جاتا کہ شادی سے قبل عورت کی جملہ ضروریات، اخراجات والد کی ذمہ داری اور شادی کے بعد شوہر کی ذمہ داری۔ بسا اوقات زندگی کے نشیب و فراز میں ایسے لمحات بھی ڈیرے ڈال لیتے ہیں جہاں مرد اور عورت کے لئے ایک ساتھ رہنا انگاروں پر لوٹنے کی مانند ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ان دونوں کے درمیان جدائی کے لئے اسلام نے قانونِ طلاق کا نفاذ کیا اور اس کا اختیار مرد کو دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾[2]

(مگر یہ کہ عورتیں کچھ چھوڑدیں یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق کا حق مرد کو ہی کیوں دیا گیا؟

حقِ طلاق کے لئے مرد کی تخصیص:

طلاق دینے کا حق مرد کو دیا گیا اسکی کئی وجوہات ہیں:۔

ا: عورت مغلوب الغضب ہوتی ہے یعنی اس کو غصہ جلدی آتا ہے۔ اگر طلاق دینے کا معاملہ عورت کے اختیار میں ہوتا تو طلاق کی شرح بڑھ جاتی۔

۲: مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے اس لیے ان حقوق سے دستبردار ہونے کا حق بھی اسی کو دیا گیا کیونکہ جو شخص اپنا مال خرچ کر کے کوئی چیز حاصل کرتا ہے وہ

---

[1]۔ سورۃ النساء ۴:۳۴

[2]۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۳۷

اس چیز کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور صرف اسی وقت اس کو چھوڑتا ہے جب چھوڑنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نظر نہ آئے۔ اس کے بر خلاف عورت کو حقوقِ زوجیت قائم کرنے کے لئے نہ تو کوئی محنت کرنی پڑتی ہے نہ پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے اس لیے اگر طلاق کا اختیار اس کو دے دیا جاتا تو اتنی سوچ بچار نہ کرتی۔ جلد طلاق واقع کرتی اور ہنستے بستے گھر ویران ہو جاتے۔ طلاق کو مرد کے اختیار میں دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وقوع طلاق میں عورت کا بالکل دخل نہیں۔ عورت کو خلع کا حق دیا گیا۔ اگر عورت طبعی نامناسبت یا مار پیٹ وغیرہم ایسی وجوہات کی وجہ سے مرد کو ناپسند کرتی ہے تو وہ اپنا مہر چھوڑ کر یا کچھ اور دے کر طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ مغربی ممالک میں مسلم اقلیات کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہاں جب میاں بیوی کے درمیان لڑائی ہوئی، اختلافات پیدا ہوگئے تو مسلم عورت غیر اسلامی عدالت میں جا کر طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اور عدالت اس کے حق میں فیصلہ دے دیتی ہے۔ اس کے جواز اور غیرِ جواز پر دلائل موجود ہیں۔ ذیل میں ہم دلائل ذکر کرتے ہیں:

ا: عدالت شرعیہ کو چھوڑ کر غیر شرعی عدالت کا فیصلہ جاننا پڑتا ہے جو کہ جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿أَلَمۡ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ يَزۡعُمُونَ أَنَّهُمۡ ءَامَنُواْ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبۡلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوٓاْ إِلَى ٱلطَّٰغُوتِ وَقَدۡ أُمِرُوٓاْ أَن يَكۡفُرُواْ بِهِۦۖ وَيُرِيدُ ٱلشَّيۡطَٰنُ أَن يُضِلَّهُمۡ ضَلَٰلَۢا بَعِيدٗا ﴿٦٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡاْ إِلَىٰ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَإِلَى ٱلرَّسُولِ رَأَيۡتَ ٱلۡمُنَٰفِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودٗا ﴿٦١﴾[1]

(کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو (کتاب) تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش

---

[1] ۔ سورۃ النساء٦٠:٤

کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس سے اعتقاد نہ رکھیں اور شیطان (تو یہ) چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈال دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف (رجوع کرو) اور پیغمبر کی طرف آؤ تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تم سے اعراض کرتے اور رکے جاتے ہیں۔)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ فیصلہ اسلامی عدالتوں سے حل کروائیں اگر نہ ہو جس طرح مغربی ممالک میں ہوتا ہے تو پھر یہ معاملات طے کرنا علماء کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

﴿قال الجويني: فاذا خلال الزمان عن سلطان فا الامور مو كلة الى العلماء و حق على الخلائق ان ير جعوا الى علما ءهم و يصير وا فى جميع قضا يا لوالا يات عن را يهم فان فعلوا ذلك فقد هدوا الى سواء السبيل[1]﴾

"امام جوینی نے کہا جب زمانہ ولایت رکھنے والے حاکم سے خالی ہو تو سارے امور علماء کے سپرد ہونگے اور لوگوں پر ضروری ہے کہ ان کی طرف رجوع کریں اور علماء کو چاہیے کہ تمام فیصلے اپنی رائے کے مطابق کریں تو جب یہ ایسا کرینگے سب سیدھے راستے کی طرف ہدایت یافتہ شمار ہونگے۔"

جب یہ صورت ممکن نہ ہو تب اپنا حق حاصل کرنے اور ظلم سے نجات پانے کے لئے رائج قوانین کا سہارا لیا جاسکتا ہے ایسے حالات میں وہ کسی ملامت کے مستحق نہیں ہونگے۔ کیونکہ شریعت سے فیصلہ نہ کروانے والے کے نفاق اور کفر کے بارے میں جو منصوص احکام ہیں وہ ان حالات کے ساتھ خاص ہیں جب شریعت مطہرہ کے مطابق فیصلہ کروانا ممکن ہو۔

---

[1] ۔ جوینی، عبد الملک، امام الحرمین، غیاث الامم فی التیاث الظلم، المکتبۃ العصریہ، بیروت، ص ۲۸۲

ضمناً ہم یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ بعض غیر مسلم عدالتی طلاق کی صورت میں عورت کو مرد کی آدھی جائیداد کا وارث قرار دیتی ہیں یہ بھی غیر شرعی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ[1]﴾

(اور ان کو کچھ برتنے کو دو مقدور والے پر اس کے لائق اور تنگدست پر اس کے لائق حسب دستور کچھ برتنے کا۔)

ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی جائے تو اس کو متعہ دینا واجب ہے اور باقی مطلقات کی جتنی قسمیں ہیں ان کو متعہ دینا مستحب ہے۔ متعہ: دوپٹہ، چادر، قمیص ہے۔[2]

ایسے معاملات میں چاہیے کہ مسلمان، مستند، سنجیدہ اور متین عالمِ باعمل کے پاس جا کر شرعی مسئلہ معلوم کرے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات کے مطابق ہی تقسیم کو قبول کریں!

عدالتی فسخِ نکاح کا حکم:

خاوند اگر مفقود الخبر (گم) ہو جائے یا نان و نفقہ دینے سے انکاری ہو یا مار پیٹ کرنے والا اور سنگ دل رویے سے زوجہ کی زندگی اجیرن کرتا ہو تو بیوی کو خلع کا حق حاصل ہے۔ شوہر اگر کسی وجہ سے طلاق نہ دیتا ہو تو عدالت عالیہ کو تنسیخِ نکاح کا حق حاصل ہوتا ہے۔

انفساخ نکاح مسلمانان ایکٹ ۱۹۳۱، دفعہ ۲، ذیلی شق (ا) کے تحت اگر شوہر ۴ سال سے مفقود الخبر ہو تو عورت کو عدالت کے ذریعے تفریق کا حق حاصل ہے۔ لیکن ۱۹۹۹،۱۹۹۸ میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی سفارشات میں کہا کہ عدالت چھان بین کروانے کے بعد ایک سال کے اندر مفقود الخبری شوہر کے نکاح کو فسخ کر دے۔[3]

---

[1] ۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۳۶

[2] ۔ ابن عابدین، محمد بن امین شامی، درمختار دار احیاء، التراث العربی، بیروت، ص ۳۳۶-۳۳۵

[3] سالانہ رپورٹ، 1998، 1999، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اسلام آباد، ص 53

فسخ نکاح کی دوسری اہم ترین صورت نان نفقہ فراہم نہ کرنا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اتفاق کیا ہے کہ اگر خاوند ٦ ماہ تک نفقہ دینے سے غفلت برتے یا بلاوجہ انکار کرے تو عورت عائلی عدالت میں تفریق کی درخواست پیش کر سکتی ہے۔ عدالت پہلے مرحلے میں شوہر کو نفقہ دینے کا کہے گی بصورت انکار عدالت تنسیخ نکاح کی ڈگری دے سکے گی۔ [1]

مفتی منیب الرحمٰن عدالتی فسخِ نکاح کا حکم بیان کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں:

> "اگر عورت غیر شرعی جج سے فیصلہ کرانے پر مجبور ہو اور وہ اس کے حق میں فیصلہ دے دے اور مرد کی آدھی جائیداد کا فیصلہ اس کے حق میں کر دے۔ شرعی اعتبار سے عورت، بعد میں اس سے دست بردار ہونے کا اعلان کرے کہ میں یہ نہیں لیتی۔ عدالت خاوند کی عدم موجودگی میں طلاق کا فیصلہ کر دیتی ہے جو کہ جائز نہیں کیونکہ طلاق کا حق خاوند کو ہے۔ اگر عورت کوئی شکایت لے جا کر عدالت میں خاوند کے خلاف کرتی ہے تو عدالت کو چاہیے کہ کسی بھی طرح خاوند کو حاضر کرنے پر مجبور کرے۔ جو عورت نے شکایات کی ہیں اس کے سچ اور جھوٹ کی تصدیق کروائے۔ اگر وہ تکذیب کر دے تو عدالت مقدمہ خارج کر دے اور اگر تصدیق کر دے تو طلاق دینے پر مجبور کرے۔ اگر طلاق نہیں دیتا، اب عدالت کو طلاق کا اور فسخ نکاح کا اختیار ہوتا ہے۔ [2]

ہماری رائے میں اگر خاوند کو بالکل علم نہیں اور عدالت نے اس کے خلاف فیصلہ کر دیا تو یہ نافذ العمل نہیں ہو گا۔ اس قسم کے فیصلے کے نتیجے میں عورت پہلے خاوند سے الگ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی اور مرد کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن اگر خاوند کو سب معلوم ہو اور وہ

---

[1] ڈاکٹر اکرام الحق یسین، حکومتی استفسارات 1962-2014، اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان، اسلام آباد، 2011ء

[2] ۔ مفتی منیب الرحمٰن، تفہیم المسائل، ضیاء القرآن، لاہور، ج۳، ص ۲۷۴-۲۶۷

خاتون کو مزید ذلیل ورسوا کرنے کے لیے دانستہ عدالت میں حاضر نہ ہوتا ہو تو عدالت یکطرفہ فیصلے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

غیر مسلم جج کے ذریعے فسخ نکاح کی حیثیت:

اس معاملے میں دو آراء ہیں قدیم فقہاء اس کے عدم جواز جبکہ متاخرین اس کے جواز کے قائل ہیں:

اول الذکر کے نزدیک دین اسلام میں قاضی کا فیصلہ فسخ نکاح کا حکم اس لیے رکھتا ہے کہ جج کو مسلمانوں پر ولایت حاصل ہے جبکہ غیر مسلم قاضی کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ[1]﴾

(مسلمان، مسلمانوں کے سوا کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے کچھ علاقہ (تعلق) نہیں مگر یہ کہ تم ان سے کچھ ڈرو! اور اللہ تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پھرنا ہے۔)

قدیم فقہاء کے نزدیک قاضی کے لئے مسلمان ہونا لازم ہے۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

﴿لا یولی قاضی حتیٰ یکون بالغا مسلما حراً عدلا[2]﴾

"بالغ مسلمان آزاد اور عادل شخص کو ہی قاضی مقرر کیا جاسکتا ہے۔"

اسی لیے غیر مسلم قاضی مسلمان زوجین کے درمیان ثالث بھی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ محکم قاضی کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے لئے بھی قاضی والی شرائط لازمی ہوں گی۔ علامہ برہان الدین المرغینانی لکھتے ہیں:

---

[1]۔ سورۃ آل عمران ۳:۲۸

[2]۔ ابن قدامہ، عبد اللہ بن احمد مقدسی، المغنی، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ج ۱۴، ص ۱۲

﴿اذا كان المحكم بصفة الحاكم لانه بمنزلة القاضي فيما بينهما فيشترط اهلية القضاء[1]﴾

”جج صفتِ حاکمیت سے متصف ہوتا ہے کیونکہ وہ زوجین کے مابین قاضی کے قائم مقام ہے۔اسکے لیے بھی قاضی والی شرائط(یعنی مسلمان ہونا)ضروری ہیں۔“

یادرہے کہ ثالثی میں بھی غیر مسلم قاضی کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں ہوتی۔بدیں وجہ اس کا نکاح کو فسخ کرنا مسلمان میاں بیوی پر نافذ نہیں ہوگا۔

اب ہم متاخرین علماء کی آراء پیش کرتے ہیں:

غیر مسلم عدالت کے ذریعے فسخ نکاح کا جواز:

غیر مسلم قاضی کی ایک حیثیت وکیل کی سی ہے کیونکہ غیر مسلم کو وکیل بنانا صحیح ہے۔امام بخاری نے ایک باب باندھا ہے اذا وکل المسلم حربیا فی دار الحرب او دار الاسلام جاز یعنی اگر مسلمان کسی حربی کو دار الحرب یا دار الاسلام میں وکیل بنائے تو جائز ہے۔اس باب کے تحت امام محمد بن اسماعیل بخاری نے جنابِ عبدالرحمن بن عوف کے امیہ بن خلف کو ارسال کردہ اس مکتوب کا ذکر کیا ہے جس میں اسے اپنی جائیداد اور اعزاو غیرہم کی حفاظت کے لئے لکھا اور حبیب مکرم ﷺ کو اس معاملے کی خبر تھی۔علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿والظاهر اطلاع النبی علیه السلام ولم ینکره قال ابن المنذر توکیل المسلم حربیا متامنا و توکیل الحربی المستامن مسلما لا خلاف فی جوازه[2]﴾

[1]۔المرغینانی، علی بن ابی بکر الفرغانی، برہان الدین ابی الحسن (۵۹۳م) الھدایۃ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن، ج۳، ص ۱۵۱

[2]۔عسقلانی، احمد بن علی ابن حجر، فتح الباری، شرح صحیح بخاری، دار الاسلام الریاض، ۲۰۰۰، ج۴، ص ۶۰۵

"نبی کریم ﷺ کو اس (خط) کی اطلاع ہوئی آپ ﷺ نے اس کو ناپسند نہیں فرمایا۔ امام ابن منذر کہتے ہیں مسلمان کا حربی وکیل ہو سکتا ہے اور حربی مستامن کا مسلمان وکیل ہو سکتا ہے اس کے جواز میں چنداں اختلاف نہیں۔"

اسی جواز کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رقم طراز ہیں:

"غیر مسلم ممالک کی عدالت میں حصول طلاق کے لئے مسلمان غیر مسلم جج کو وکیل بنا سکتا ہے۔ اس سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ ایسے ہی اگر مسلمان مرد یا عورت مقدمہ دائر کروائیں۔ ان کی درخواست پر عدالت طلاق دے دے تو عدالت کا فیصلہ معتبر ہو گا۔ تحکیم کی صورت میں طلاق نہیں ہو گی۔ شوہر کے انکار کی وجہ سے بھی عدالت کی طرف سے طلاق شرعاً معتبر نہ ہو گی۔"[1]

لہذا اولاً تو غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلم اقلیتوں کو مقدور بھر کوشش کرتے ہوئے ریاست سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ مسلم عائلی معاملات کے حل کے لئے مسلمان قاضی یا مجسٹریٹ کا تقرر کیا جائے تاکہ مسلمان، دین اسلام اور ملکی قوانین کے مطابق اپنے حل طلب مقدمات کا فیصلہ کروا سکیں لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو غیر مسلم جج کی حیثیت ایک وکیل کی سی ہو جائے گی اور غیر مسلم کو وکیل بنانا جائز ہے۔

غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنے کے لئے پیپر میرج:

مسلم اقلیات کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ممالک شہریت حاصل کرنے لیے وہ اس ملک کی کسی شہری عورت کو کچھ رقم دے کر اس سے نکاح کر لیتے ہیں اور اس نکاح سے

---

[1]۔ خالد سیف اللہ رحمانی، غیر مسلم ممالک کی عدالتوں سے طلاق کے فیصلے در مشمولہ غیر مسلم ممالک میں عدالتوں کی طلاق، ایفاء پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۱، ص ۹۱

مقصد صرف شہریت حاصل کرنا ہوتا ہے اس طرح اس کو جلدی شہریت مل جاتی ہے۔ جب شہریت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ شخص اس عورت کو چھوڑ دیتا ہے الغرض اس نکاح سے مقصد شہریت حاصل کرنا ہوتا ہے باقی یہ مرد اس عورت کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرتا ہے نہ نان نفقہ ادا کرتا ہے۔ یہ عمل شرعا کئی وجوہ سے ناجائز ہے۔

ا۔ یہ نکاح شرعاً متعہ ہے۔ کیونکہ متعہ کا معنی ہے کہ عورت سے وقت اور مدت کا تعین کیا جائے کہ معین رقم کے عوض اتنی مدت کے لئے اپنا جسم حوالے کرے گی۔ وقت پورا ہو جانے کے بعد متعہ ازخود ختم ہو جاتا ہے طلاق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عورت کے لئے مسلمان یا اہل کتاب عورت کا ہونا ضروری نہیں مجوسی عورت سے بھی متعہ ہو سکتا ہے ممنوعہ عورت وراثت کی حقدار نہیں ہوتی نہ متعہ کرنے والا اس کا وارث ہوتا ہے۔ ہماری اس بات کی وضاحت تہذیب الاحکام کی اس عبارت سے ہوتی ہے جس میں شیخ طوسی لکھتے ہیں:

﴿عن زرارة عن ابی عبدالله علیه السلام قال لا یکون متعة الا بامرین باجل مسمی وباجر مسمی[1]﴾

”زرارہ لکھتے ہیں کہ ابو عبد اللہ السلام نے کہا متعہ اکیلی دو چیزوں سے منعقد ہوتا ہے۔ مدت متعین ہو اور اجرت متعین ہو۔“

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ متعہ کے دو ارکان ہیں۔ ا: مدت متعین ہو، ۲: اجرت متعین ہو اور مذکورہ بالا صورت میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں کہ اس عورت کے ساتھ پیسے بھی مقرر کیے جاتے ہیں کہ اتنے پیسے دینے ہیں اور وقت بھی مقرر کیا جاتا ہے کہ جب شہریت مل جائے گی تو نکاح ختم ہو جائے گا۔ لہذا یہ متعہ ہے۔

”مذکورہ نکاح اس لحاظ سے بھی متعہ ہے کہ جس طرح متعہ میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ عورت مسلمان ہے یا کتابی یا کافرہ اس طرح یہاں پر

---

[1] ۔ طوسی، ابو جعفر محمد بن حسن، تہذیب الاحکام، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳۶۵ھ، ج۳، ص ۲۶۲

بھی نہیں دیکھا جاتا۔ شیخ طوسی کہتے ہیں: مجوسی عورت کے ساتھ متعہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"[1]

مذکورہ صورت نکاح اس اعتبار سے بھی متعہ ہے کہ جس طرح متعہ میں عورت کو طلاق دینا ضروری نہیں ہوتا جب مدت گزر جائے تو نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے یہاں بھی اس طرح ہوتا ہے کہ جب مرد کو شہریت مل جاتی ہے تو اس نکاح کو ختم تصور کیا جاتا ہے۔ شیخ کلینی روایت کرتے ہیں:

﴿فاذا مضت منك الايام كان طلاقها فی شرطها ولا عدة لها عليك[2]﴾

"جب دن گزر جائیں گے تو اس عورت کو طلاق ہو جائے گی اور اس نکاح کی کوئی عدت نہیں ہے یہ نکاح اس اعتبار سے بھی متعہ ہے کہ جس طرح متعہ میں نکاح کرنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے یہاں پر بھی وراثت کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص صرف کسی ملک کی شہریت حاصل کرنے کے لئے ایک عورت سے نکاح کرلے اور شہریت حاصل کرنے کے بعد چھوڑ دے اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم نہ رکھے اور اصل مقصود صرف شہریت حاصل کرنا ہو تو ایسا نکاح، نکاح متعہ ہے اور متعہ بالاتفاق حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ[3]﴾

(اور چاہیے کہ بچے رہیں وہ جو نکاح کا مقدور نہیں رکھتے یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے مقدور والا کردے۔)

1۔ ایضاً، ج۳، ص۱۴۴

2۔ کلینی، ابو جعفر محمد بن یعقوب، اصول الکافی، دار الکتب الاسلامیہ، تہران ۱۳۶۲ھ، ج۵، ص۴۵۶-۴۵۵

3۔ سورۃ النور ۲۴:۳۳

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بیان فرمایا کہ اگر نکاح نہیں کر سکتے تو ضبط نفس کرو اگر متعہ جائز ہوتا تو نکاح کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں متعہ کی اجازت دے دی جاتی جبکہ متعہ کی اجازت کی بجائے ضبط نفس کا حکم دیا گیا تو معلوم ہو گیا کہ اسلام میں متعہ کے جواز کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حارث بن غزیہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا:

"عورتوں سے متعہ حرام ہے۔"[1]

اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۲۵ ویں فقہی سیمینار مورخہ ۵ تا ۷ فروری ۲۰۱۶ء منعقدہ جامعہ دار الحدیث بدرپور (آسام) میں پیش کیے جانے والے مقالات میں مولانا اقبال احمد قاسمی اہل کتاب سے متعلق مسائل واحکام میں تفسیراتِ احمدیہ اور مدارک کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اب رہا مسئلہ کتابیہ سے نکاح کرلینے کے بعد اسکے حقوق سے جان چرانے اور ان کو چھوڑ کر بھاگ آنے یا محض غیر مسلم ہونے کی بنیاد پر طلاق دیدینے کی اجازت کا تو سارے ہی مقالہ نگار جنہوں نے اس مسئلہ کو لکھا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ اہل کتاب خاتون سے نکاح کر لینے کے بعد حقوق سے راہ فرار اختیار کرنے اسی طرح چھوڑ کر بھاگ آنے کی اجازت نہیں ہو گی۔"[2]

فی الواقع ہوتا بھی اسی طرح ہے۔ پیپر میرج میں مرد کے ذمے خاتون کا کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اگر اس کو نکاح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے کثیر مفاسد سامنے آتے ہیں۔ بیوی کا اس کے ماتحت نہ ہونا، مرد کی حاکمیت کا ختم ہو جانا کیونکہ اس صورت میں خاوند کو بیوی پر کوئی اختیار نہیں ہوتا نہ اسے اس کی حرکات وسکنات کا کوئی علم ہوتا ہے۔ وہ اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ دوستی لگانے، بوائے فرینڈز بنانے سے منع نہیں کر سکتا، الغرض ایسے مفاسد ہیں جو

---

[1] ۔ الھیثمی، حافظ نور الدین، مجمع الزوائد، دار الکتب العربیہ، بیروت ۱۴۰۴ھ، ج ۴، ص ۲۶۶

[2] ۔ مولانا اقبال احمد قاسمی، اہلِ کتاب سے متعلق مسائل واحکام، اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا، ۲۰۱۷، ص ۶۷

بیان سے باہر ہیں۔ اسی وجہ سے مسلم اقلیات کو غیر مسلم ممالک میں شہریت حاصل کرنے کے لئے پیپر میرج (Paper Marriage) کرنا جائز نہیں ہے۔

غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا:

ایک مسلمان کا غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا ایک جدید مسئلہ ہے۔ صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اس مسئلہ کا وجود نہیں تھا کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی۔ مسلمان ہر ملک میں جانے کی اجازت رکھتے تھے اور اسلامی ملکوں کے درمیان مروجہ حدود نہیں تھیں۔ لہذا مسلمان جس اسلامی ملک میں بھی چلا جاتا وہ اجنبیت محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ غیر مسلم ممالک میں عرصہ دراز کے لئے قیام کریں نہ ہی یہ ضرورت محسوس ہوتی کہ وہ غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرلیں۔ زاں بعد جب اسلامی حکومتیں ختم ہو گئیں اور مسلمان کمزور ہو گئے، دشمن ان پر غالب آ گیا تو پناہ حاصل کرنے اور دیگر معاشی وجوہ کی بنیاد پر انہوں نے غیر مسلم ممالک کا رخ کیا اس طرح ایک نیا مسئلہ سامنے آیا۔

شہریت کی تعریف:

﴿التجنيس رابطة قالونية وسياسية تفيد أن دمج الفرد فى مصر السكان بوصفه من العناصر المكونة للدولة[1]﴾

" شہریت ایک قانونی اور سیاسی رابطہ ہے جو رہنے والوں میں تمام ملکی قوانین کو مانتے ہوئے اس ملک میں رہنے کا فائدہ دیتا ہے۔"

ایک اور تعریف ملاحظہ ہو:

"شہریت اس کو کہتے ہیں کہ ایک شخص کسی ملک کی شہریت اور اس ملک کے رہنے والوں میں شمولیت کو طلب کرے۔ اس کے ساتھ اس

1۔ محمد کمال فهمی، اصول القانون الدولی الخاص، موسسۃ الثقافۃ، الجامعۃ الاسکندریۃ، ۱۹۹۲، ص ۷۱

کے تمام قوانین کو قبول کرے گا جو اس ملک کے شہری بننے کی وجہ
سے اس پر لاگو ہوتے ہیں اور ان قوانین کو رضامندی سے قبول
کرے اور حالت جنگ میں اس ملک کا دفاع کرے۔"[1]

ان دونوں تعریفات کی وضاحت یہ ہے کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان غیر مسلم حکومت سے یہ اپیل کر دے کہ اس کو اس ملک کے رعایا میں شامل کیا جائے اور جو حقوق اس ملک کے شہری کو ملتے ہیں اس کو بھی وہ مل جائیں اسی طرح جو ذمہ داریاں اس ملک کے شہری پر عائد ہوتی ہیں وہ ذمہ داریاں قبول کرنے کے لئے وہ تیار ہے اس کو غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا کہتے ہیں۔

شہریت کی وجہ سے لازم حقوق:

جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت حاصل کرلیتا ہے تو اس کو اس ملک کی طرف سے جو مراعات حاصل ہوتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ وہ ملک اس شخص کا اپنا ملک بن جاتا ہے۔

۲۔ اس کو اس ملک میں ہمیشہ رہنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

۳۔ وہ ملک اس شہری کا دفاع کرتا ہے اور ملک سے باہر بھی اس کا خیال رکھتا ہے اس کو تحفظ دیتا ہے۔

۴۔ اس شخص کو اس ملک میں الیکشن لڑنے کا حق مل جاتا ہے وہ انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے۔

شہریت کی ذمہ داریاں:

شہریت حاصل کرنے کی وجہ سے شہری پر چند اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں:

ا۔ جنگ کے وقت اس ملک کی فوج میں شرکت اختیار کرنا ہو گا اور اس کا دفاع کرنا ہو گا۔

---

[1] ۔ ازدی، جابر ابراہیم، شرح احکام الجنسیۃ، دار مجد، ۱۹۹۳، ص ۲۳

۲۔ ملک کی ترقی کے لئے کوششیں کرنا ہو نگی۔

شہریت حاصل کرنے کے احکام:

غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا چار اقسام پر مشتمل ہے:

واجب:

جب غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنے میں اسلام اور مسلمانوں کی مضبوطی ہو اور چھوڑنے میں فساد کا خوف ہو تو اس وقت شہریت حاصل کرنا واجب ہے۔

مستحب:

جب شہریت حاصل کرنے سے مقصود دین کی تبلیغ ہو اور اسلام کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانا ہو تو اس وقت شہریت حاصل کرنا مستحب ہے۔

جائز:

علم حاصل کرنے کے لئے روز گار کے لئے جان کی تحفظ حاصل کرنے، ظلم سے بچنے کے لیے غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے۔

مکروہ:

جب فتنہ میں پڑ جانے کا خوف ہو تو اس وقت شہریت حاصل کرنا مکروہ ہے۔ [1]

غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنے کا جواز:

غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا چونکہ نیا مسئلہ ہے اور متقدمین کے دور میں اس کا وجود نہیں تھا اس وجہ سے اس بارے میں علماء کے متعدد اقوال ہیں۔

قول اول: غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں۔

قول ثانی: غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے۔

قول ثالث: ضرورت کے وقت شہریت حاصل کرنا جائز ہے بصورت دیگر نہیں۔

---

[1] ۔ ابن بیۃ، عبد اللہ بن الشیخ المحفوظ، ضاعۃ الفتویٰ، دار المنہاج جدہ، الطبعۃ الاولی ۲۰۰۷، ص ۲۸۴-۲۸۵

قول رابع: غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنے میں تفصیل ہے کیونکہ جو مسلم اقلیات غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرتے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: اگر کوئی شخص غیر مسلم ممالک کی شہریت اس وجہ سے حاصل کرتا ہے کہ کافر اور کافروں کے ملک ان کو اچھے لگتے ہیں۔ ان کا غیر مذہبی کلچر ان کو پسند ہے تو یہ تو معاذ اللہ اسلام سے ارتداد ہے۔

دوسری قسم: جو مسلم اقلیات اس غیر مسلم ممالک کے باشندے ہوں ان کے لئے اس ملک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے۔

تیسری قسم: جو مسلمان غیر مسلم ملک کا رہنے والا نہ ہو عارضی قیام اس نے اختیار کیا ہو اس کے لئے شہریت حاصل کرنے میں تفصیل ہے۔

۱: اگر اس نے اپنا اسلامی ملک مجبوری کی وجہ سے چھوڑا ہے اور یہاں پناہ لی ہے تو پھر مجبوری کی حد تک وہ وہاں پر رہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم رہے برائیوں کو کم از کم دل میں برا جانے کافروں کے مذہبی اجتماعات میں جانے سے بچے۔

۲: اس نے اپنا ملک روزگار کے سلسلہ میں چھوڑا ہو وہ روزگار ہی کے لئے غیر مسلم ملک میں سکونت اختیار کرے اگر وہ چھوڑتا ہے تو وہ بے روزگار ہو جائے گا۔ تو اگر اس کا روزگار بغیر شہریت حاصل کرنے کے نہیں چلتا یا اس کو روزگار ملتا ہی نہیں تو اس کے لئے شہریت حاصل کرنا جائز ہے۔

۳: اسلام مسلمان اور تبلیغ دین کے لئے غیر مسلم کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے۔

۴: بغیر ضرورت کے اور دینی مصلحت کے محض دنیوی اغراض کے لئے شہریت حاصل کرنا یہ حرام ہے۔

اس اجمال کی تفصیل اور دلائل درج ذیل ہیں:

قول اول کے دلائل:

جو لوگ کہتے ہیں کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں انہوں نے قرآن و حدیث اور دلائل عقلیہ سے استدلال کیا ہے۔

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ-وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً[1]﴾

(مسلمان کافروں کو اپنا دوست نہ بنالیں مسلمانوں کے سوا اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے کچھ علاقہ (تعلق) نہ رہا مگر یہ کہ تم ان سے کچھ ڈرو)

اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ-وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ-وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ[2]

(اے ایمان والو اپنے باپ اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ سمجھو اگر وہ ایمان پر کفر پسند کریں اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی کرے گا تو وہی ظالم ہیں تم فرماؤ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہارا کنبہ اور تمہاری کمائی کے مال اور وہ سودا جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہارے پسند کے مکان یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ پیاری ہوں تو راستہ دیکھو (انتظار کرو) یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے اور اللہ فاسقوں کو راہ نہیں دیتا۔)

---

[1]۔ سورۃ آل عمران ۳:۲۸

[2]۔ سورۃ التوبہ ۹:۲۴-۲۳

ان دو آیات کریمہ میں یہ حکم ہے کہ تم کافروں کو دوست نہ بناؤ اگرچہ وہ تمہارے قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہوں تو جب کافر جو قریبی رشتہ دار ہوں ان کو دوست بنانا جائز نہیں تو پھر کافر جو دور کے ہیں ان کو دوست بنانا کیسے جائز ہوگا۔ جبکہ شہریت حاصل کرنے میں تو ان کو دوست بنانا ہوتا ہے اور ان کی دین کا اتباع یا کم از کم اچھا سمجھنا ہوتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ[1]

(اے ایمان والو یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہیں میں سے ہے بے شک اللہ بے انصافوں کو راہ نہیں دیتا۔)

ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں:

''جو لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں ان کو مضبوط کریں تو وہ ان کافروں میں سے شمار ہونگے کیونکہ جس طرح یہود و نصاریٰ نے اللہ کی مخالفت کی اس نے بھی کی اور جس طرح ان کے لئے جہنم واجب ہے تو جس نے ان کو دوست بنایا ان کے لئے بھی جہنم واجب ہوگی۔''[2]

یہ بات تو واضح ہے کہ جو شخص کسی ملک کی شہریت حاصل کرتا ہے وہ اسلامی ملک کی نسبت کو چھوڑ کر غیر اسلامی ملک کو اپنا وطن بناتا ہے۔ یہ دوستی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور کافروں کی دوستی اگر دل سے رضامندی کے ساتھ کی جائے تو یہ کفر ہے۔ لہٰذا علماء نے اس آیت سے

---

[1]۔ سورۃ المائدہ ۵:۵۱

[2]۔ قرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ج ۶، ص ۲۱۷

استدلال کیا ہے کہ بلا ضرورت غیر اسلامی ملک کی شہریت حاصل کرنا کفر ہے۔ [1]

دلیل نمبر ۳: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ- قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ-قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا-فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ-وَسَآءَتْ مَصِيْرًا [2]

(وہ لوگ جن کی جان فرشتے نکالتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے تھے ان سے فرشتے کہتے ہیں تم کاہے میں تھے کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور تھے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے تو ایسوں کاٹھکانا جہنم ہے اور بہت بری جگہ پلٹنے کی۔)

ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں:

فی هذه الاية دليل على وجوب هجران الارض التى بعمل فيها بالمعاصى وقال سعيد بن جبير اذا عمل بالمعاصى فى ارض فاخرج منها [3]

(اس آیت میں دلیل ہے کہ جس زمین پر اللہ کی نافرمانیاں ہوتی ہوں اس سے ہجرت کرنا واجب ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں جب زمین میں اللہ کی نافرمانیاں شروع ہو جائیں تو وہاں سے نکل جاؤ۔)

شہاب الدین محمود بن عبد اللہ آلوسی لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کے فرمان "ظالمی انفسھم" کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ہجرت کو چھوڑ کر اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور کفار کے پاس رہے جس کی وجہ سے ان کے دین کے امور میں خلل آگیا یا اپنے نفاق کی وجہ سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدد نہیں کی اور کافروں کی مدد کی۔“ [1]

---

[1]۔ رشید رضا، الفتاویٰ، الطبعۃ الاولی، دار الکتب الجدید، بیروت، ۱۹۷۰ء، ج۵، ص۱۷۵۹

[2]۔ سورۃ النساء ۴:۹۷

[3]۔ قرطبی، ابو عبد اللہ، محمد بن احمد، الجامع الاحکام القرآن، ج۵، ص۲۴۶

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے اس بات پر کہ جو شخص ہجرت پر قادر ہو اس کے لئے کفر والی جگھوں سے اسلام والی جگھوں کی طرف ہجرت کرنا واجب ہے تو جس طرح دار الکفر میں اقامت جائز نہیں ہے اس سے ہجرت واجب ہے تو پھر دار الاسلام کو چھوڑ کر دار الکفر منتقل ہونا اور وہاں ہمیشہ رہنے کی نیت سے شہریت حاصل کرنا یہ کس طرح جائز ہو گا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا[2]

(تو اے محبوب تمہارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم حکم فرمادو اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں۔)

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اللہ کے رسول ﷺ کو حاکم نہیں مانتا اسلام کے احکام پر راضی نہیں وہ مومن نہیں تو جو شخص غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرتا ہے۔ وہ اسلام کے احکام اور قانون پر کفر کے احکام اور قوانین کو ترجیح دیتا ہے اس وجہ سے وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والا شمار نہیں ہو گا۔ مزید یہ کہ شہریت حاصل کرنے کے ساتھ کئی ایسی چیزوں کو حرام ماننا پڑتا ہے جو اسلام میں بالاتفاق حلال ہیں اور کئی ایسی چیزوں کو حلال ماننا پڑتا ہے جو اسلام میں بالاتفاق حرام ہیں۔ یہ انکار ضروریات دین کا ہے جس سے بندہ ایمان سے نکل جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ان آیات سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں۔

---

[1] ۔ آلوسی، شھاب الدین، محمود بن عبد اللہ، روح المعانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ج ۲، ص ۱۵۱

[2] ۔ سورۃ النساء ۴:۶۵

قول ثانی کے دلائل:

جو علماء یہ کہتے ہیں کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے ان کے دلائل درج ذیل ہیں۔

دلیل ۱: اسلام کا مقصد پانچ چیزوں کی حفاظت کرنا ہے جنہیں مقاصدِ شرعیہ کہا جاتا ہے:

۱: دین، ۲: جان، ۳: عقل، ۴: عزت، ۵: مال

لہذا ہر وہ چیز جس سے ان چیزوں کی حفاظت ہوتی ہو وہ مشروع ہو گی۔ غیر مسلم ممالک میں ان کی حفاظت کامل طور پر حاصل ہوتی ہے بلکہ بعض غیر مسلم ممالک میں ان چیزوں کی حفاظت اتنے اہم طریقے کے ساتھ حاصل ہوتی ہیں کہ اکثر اسلامی ممالک میں بھی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ وہ ممالک مسلم شہریوں کو عبادت، دعوت دین اور علم پھیلانے کی مکمل آزادی دیتے ہیں اس لیے کہ وہ سیکولر (Secular) ملک ہیں، آزادئِ رائے کے قائل ہیں۔[1]

لہذا جب شریعت کا مقصد ان پانچ چیزوں کی حفاظت ہے اور ان چیزوں کی حفاظت غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنے کے ساتھ کامل طریقہ پر حاصل ہوتی ہے تو پھر غیر مسلم ممالک کی شہریت جائز ہونی چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ[2]

(اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو!)

[1] ۔ ڈاکٹر عطیہ عدنان، الاحکام الشرعیہ للنوازل، ج ۲، ص ۲۲۷-۲۲۳

[2] ۔ سورۃ الممتحنہ ۶۰:۸

قول اول کے علماء نے جو دلائل دیئے ہیں اگر ان کو تسلیم کیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ جب دو ضرر جمع ہو جائیں تو سب سے کمزور ضرر کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور سخت ضرر کو کمزور ضرر کے ذریعے دور کیا جاتا ہے۔ ابن تیمیہ نے کہا:

"شریعت کا مقصد یہی ہے کہ مصلحتوں کو حاصل کیا جائے اور ان کی تکمیل کی جائے مفاسد کو دور کیا جائے۔ دو چیزوں میں سے سب سے اعلیٰ چیز کو ترجیح دی جائے اور دو شروں میں سے سب سے بڑے شر کو دفع کیا جائے۔"[1]

اس وجہ سے غیر مسلم ممالک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ اسلام کا تشخص قائم دائم رہے، دین ضائع نہ ہو اور کسی فعلِ حرام اور قولِ حرام کا ارتکاب کرنا لازم نہ آئے اگر یہ چیزیں ہوں تو شہریت حاصل کرنا حرام ہے۔

قول ثالث کے دلائل:

قول ثالث میں یہ تھا کہ ضرورت کی وجہ سے شہریت حاصل کرنا جائز ہے۔ ان کے دلائل وہی ہیں جو قول اول کے قائلین کے ہیں۔ مگر انہوں نے اضطرار کو مستثنیٰ کیا ہے۔ کیونکہ الضرورات تبیح المخطورات۔[2]

شیخ علی طنطاوی نے بھی یہی فتویٰ دیا کہ جب آپ سے پوچھا گیا کہ کیا کافر ملک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

لا یجوز لمسلم ان یتحصل بجنیسة دولة کافرة لان ذلك لو جب علیه الالتزام بقوانینها واوامرها الا اذا ضطر الی ذلك[3]

---

[1] ۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم، مجموع الفتاویٰ، مجمع الملک فھد، المدینۃ المنورہ، ۲۰۰۴، ج ۲۰، ص ۴۸

[2] ۔ ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم محمد، الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ج ۱، ص ۱۱۸

[3] ۔ شیخ علی طنطاوی، الفتاویٰ، ص ۱۶۳

(کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی غیر مسلم ریاست کی شہریت اختیار کرے، کیونکہ اس صورت میں اسے اس ریاست کے قوانین اور احکامات کی پابندی کرنی پڑے گی، الا یہ کہ وہ کسی مجبوری یا اضطراری حالت میں ایسا کرنے پر مجبور ہو ۔)

قول رابع کے دلائل:

قول رابع کے علماء نے جن صورتوں میں انہوں نے شہریت حاصل کرنے کی اجازت دی ہے اس صورت میں انہوں نے قول اول کے دلائل سے استدلال کیا ہے اور جن صورتوں میں منع کیا ہے ان صورتوں میں قول ثانی کے دلائل سے ہی استدلال کیا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے اس فصل کو دوبارہ پڑھ لیا جائے۔

ویزا حاصل کرنے کے لیے خود کو قادیانی ظاہر کرنا:

بعض مسلمان، غیر مسلم ممالک کا ویزا سہولت سے حاصل کرنے یا کسی اور مصلحت کیلئے پاسپورٹ اور ویزا کے فارم میں خود کو قادیانی لکھ دیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ تو واضح رہے کہ کسی مسلمان کا دنیاوی مصلحت یا کسی کافر ملک کا ویزا حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو قادیانی یا کسی غیر مسلم مذہب سے منسوب کرنا صراحتاً کفر ہے، کیونکہ یہ فعل خود کو ایسے مذہب سے جوڑنا ہے جو اسلامی عقائد کے منافی ہے۔ یہ ایک سنگین گناہ اور موجبِ کفر ہے، جس کے بعد تجدیدِ ایمان اور خالص دل سے توبہ لازم ہے۔ فقہاء نے واضح کیا ہے کہ ایسے کلمات یا افعال جو کسی معروف کافر مذہب کی طرف صریح نسبت کریں، وہ موجبِ کفر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ جلد دوم، صفحہ 277 میں ہے کہ اگر مسلمان کہے کہ میں فرعون یا ابلیس ہوں، تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح "فتاویٰ تاتارخانیہ" میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم مذہب کے ساتھ تعلق ظاہر کرے، تو یہ کفر کے مترادف ہے۔"

غیر مسلم ممالک میں الیکشن لڑنا:

غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیات کے لئے ایک مسئلہ ان ممالک میں الیکشن لڑنے کا بھی ہے ان غیر مسلم ممالک میں اکثر مسلمان ان حقوق سے محروم ہوتے ہیں۔ جو اس ملک کے ایک غیر مسلم شہری کو ملتے ہیں تو کیا اپنے حقوق حاصل کرنے اور اس ملک کے مراعات سے استفادے کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے یا نہیں۔ اس بارے علماء کی دو آراء ہیں:

پہلی رائے: غیر مسلم ممالک میں الیکشن لڑنا، انتخابات میں حصہ لینا جائز ہے۔

دوسری رائے: غیر مسلم ممالک میں الیکشن میں حصہ لینا مطلقاً ناجائز ہے۔

قول اول کے دلائل:

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡہَا حَیۡثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ[1]

(یوسف نے کہا مجھے زمین کے خزانوں پر کردے بے شک میں حفاظت والا علم والا ہوں اور یوں ہی ہم نے یوسف کو اس ملک پر قدرت بخشی اس میں جہاں چاہے رہے ہم اپنی رحمت جسے چاہے پہنچائیں اور ہم نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔)

سید محمد آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

"اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ عہدے کا طلب کرنا جائز ہے جبکہ عہدہ طلب کرنے والا عدل و انصاف اور شرعی احکام کے جاری کرنے پر قادر ہو اگرچہ (یہ شرعی احکام) کافر یا ظالم کے ہاتھ سے جاری کروائے۔"[2]

1۔ سورۃ یوسف ۱۲:۵۶-۵۵

2۔ آلوسی، ابو الفضل سید محمود آلوسی حنفی، روح المعانی، ج ۳، ص ۵

لہذا اس سے معلوم ہوا کہ جس وقت انتخابات میں حصہ لینا کسی مصلحت کی وجہ سے ہو یا کسی شر کو دور کرنا مقصود ہو تو پھر حصہ لینا جائز ہے اگرچہ بادشاہِ وقت غیر مسلم ہو۔

دوسری دلیل:

غیر مسلم ممالک میں الیکشن لڑنا اور عہدہ طلب کرنے کا ثبوت حدیث مبارکہ سے بھی ملتا ہے کہ نجاشی حبشہ ایک غیر مسلم ملک کا حاکم تھا جب کہ تھا وہ مسلمان فیصلے بھی شریعت کے احکام کے مطابق نہیں فرمایا کرتے تھے اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے ان کو "رجل صالح" یعنی نیک آدمی فرمایا اور جب اس کے وفات کی خبر نبی کریم ﷺ تک پہنچی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمۃ[1]

"آج کے دن ایک نیک آدمی فوت ہو گیا پس تم کھڑے ہو جاؤ اور اپنے بھائی اصحمہ پر نماز جنازہ پڑھو۔"

تمام کتب احادیث جن میں نجاشی کے وفات کا ذکر ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نجاشی مسلمان تھا اگرچہ وہ ایک کافر ملک کا حاکم تھا اور ان کے عرف و شریعت کے مطابق فیصلے کرتا تھا۔ ابن تیمیہ نے کہا:

"نجاشی کے لیے قرآن کے مطابق فیصلے کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ اسکی قوم ایسا کرنے میں مانع تھی بسا اوقات آدمی قاضی بن جاتا ہے مگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے وہ اسلام کے مطابق فیصلہ نہیں کر پاتا اور اللہ تعالیٰ نہیں مکلف کرتا مگر وسعت کے مطابق۔"[2]

پہلی رائے پر اکتفا کرتے ہوئے درج بالا بحث سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیات کے لئے انتخابات میں حصہ لینا نہ صرف جائز بلکہ مصلحت کے تحت ضروری بھی ہے۔

1۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب موت النجاشی، رقم الحدیث: ۳۸۷۷

2۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم، مجموع الفتاویٰ، ج ۱۷، ص ۲۱۸-۲۱۹

باب دوم:
مسلم اقلیات سے متعلق اصول و احکام

فصل اول: غیر مسلموں سے معاشرتی تعلقات کے اصول واحکام

فصل دوم: غیر اسلامی ریاست میں ہجرت وقیام سے متعلق احکام

غیر مسلموں سے معاشرتی تعلقات کے اصول واحکام

اقلیات سے تعلقات کے قرآنی روابط:

معاشرت سے مراد دنیا میں رہنے سہنے اور ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤاور سلوک کرنے کے اصول ہیں۔ان میں سے بعض کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے اور بعض کا اجتماعی زندگی سے جبکہ بعض کا تعلق دونوں سے ہے۔اسلام میں معاشرت کی تعلیم بے مثال ہے۔ اس سے جہاں ایک مسلمان کو قربِ خداوندی نصیب ہوتا ہے وہاں معاشرے کا ہر ہر فرد بھی راحت اور سکون میں زندگی بسر کرتا ہے۔اسلام ایک ہمہ گیر اور آفاقی مذہب ہے۔ اسلام فطرت اور انسانیت کا مذہب ہے جس میں نہ علاقائیت کا حصار ہے اور نہ سلطنت کی تحریر، نہ قومیت کی وبا ہے نہ نسل پرستی کا مرض۔اسلام احترام انسانیت کا قائل ہے اور انسانیت کی بنیاد پر بنی نوع انسان کے تحفظ وبقاء کی پر زور تائید کرتا ہے۔قرآن کی سورۃ الحج میں اس تصور کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے کہ معاشرہ کیسا ہونا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ[1]

(بھلائی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں اور اللہ ہی کے لیے سب کاموں کا انجام ہے)

اس قرآنی تصور سے ایک ایسا معاشرہ بنانے کی جانب راہ کھلتی ہے کہ جہاں معاشرے کے بنیادی تصور کے مطابق تمام افراد کو بنیادی ضروریات زندگی بھی میسر ہوں اور ذہنی آسودگی بھی حاصل ہو اور کسی بھی انسانی معاشرے کو اس وقت تک ایک اچھا معاشرہ نہیں کہا جاسکتا کہ جب تک اس کا ہر فرد مساوی انسان نا سمجھا جائے اور ایک کمزور کو بھی وہی انسانی حقوق

---

[1]۔ سورۃ الحج ۲۲:۴۱

حاصل ہوں جو ایک طاقتور کے پاس ہوں اسلام کی پوری تاریخ، انسانیت کے احترام، حقوق کی رعایت اور انسانی اقدار کی حفاظت سے معمور ہے۔ اولاد آدم کی تکریم و تعظیم اور احترامِ انسانیت کے حوالے سے ارشادات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے قرآن مجید کی درج ذیل آیت دستوری حیثیت رکھتی ہیں، جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ربط و تعلق کے بہت سے حساس گوشوں کو واضح کرتی ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

> لاَ يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَى إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ [1]
>
> (اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا کہ ان کے ساتھ احسان کرو اور ان سے انصاف کا برتاؤ برتو! بے شک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں۔ اللہ تمہیں منع کرتا ہے جو تم سے دین میں لڑے یا تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یا تمہارے نکالنے پر مدد کی کہ ان سے دوستی نہ کرو اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی ستمگار ہیں۔)

مراد یہ ہے کہ تمام انسانوں کے ساتھ عدل و انصاف کرنا، مسلمانوں کا مطلوب رویہ ہے، خواہ وہ کفار ہوں یا مشرکین، یعنی کفر و شرک ترک تعلق کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ظالمانہ رویہ اور عداوت کی وجہ سے، دوستی اور خفیہ تعلقات کی ممانعت ہے، وہ کفار جو مسلمانوں جو مسلمانوں کے ساتھ سرگرم ظلم و عداوت

---

[1]۔ سورۃ الممتحنہ ۹:۶۰۔۸

نہیں ہیں ان کے ساتھ نہ یہ کہ صرف عدل و انصاف کا حکم دیا جارہا ہے بلکہ اس کے علاوہ ان کے ساتھ خیر خواہی، ہمدردی اور احسان کا معاملہ کرنے کی ترغیب بھی ہے اور جو کفار مسلمانوں کی مخالفت اور شدید عداوت کے درپے ہیں ، ان کے ساتھ صرف دوستی اور رازدارانہ معاملہ رکھنے کی ممانعت کی ہے، عدل و انصاف کی ہرگز ممانعت نہیں ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"اس آیت پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اس میں حصر ہے، اس کا زور "أن تولوا" پر ہے، یعنی ممنوع جو چیز ہے وہ "تولی" یعنی ان کفار کو دوست اور کارساز بنانا ہے نہ کہ ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنا ہے، رہا عدل و قسط کا معاملہ تو اس کی بنیاد قانون، معاہدے اور معروف پر ہوتی ہے، اس میں کافر و مومن، دوست و دشمن کے امتیاز کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، قانون اور معاہدے کا جو تقاضا ہو وہ بہرحال پورا کرنا ہو گا اس سے بحث نہیں کہ معاملہ دوست کا ہے یا دشمن کا۔"[1]

علامہ غلام رسول سعیدی اسی آیت کے تحت اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ذمی کافروں اور بدعقیدہ لوگوں کے ساتھ معاشرتی برتاؤ کرنا، خرید و فروخت، قرض کا لین دین، بیمار پرسی اور تعزیت وغیرہ کرنا جائز ہے البتہ مرتدین سے کسی قسم کا کوئی معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔[2]

اسلامی معاشرہ میں غیر مسلموں کے حقوق کو کتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اس کا اندازہ حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتا ہے:

> ألا من ظلم معاهدا أو انتقصه,أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئًا بغير طيب نفس فأنا حجيجه يوم القيمة[3]

---

[1] ۔اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۷۹ء، ج۷، ص:۳۳۵

[2] ۔سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، فرید بک سٹال، لاہور، ۲۰۱۰، ج۲، ص۱۰۸

[3] ۔ابو داؤد، سجستانی، سنن ابو داؤد، کتاب الخراج والفیئ والامارۃ، باب فی تعشیر الخ، المکتبۃ العصریہ، بیروت، رقم الحدیث:۳۰۵۲

(خبردار! جس کسی نے کسی معاہد (غیر مسلم) پر ظلم کیا یا اس کا حق
غصب کیا یا اس کو اسکی استطاعت سے زیادہ تکلیف دی یا اس کی رضا
کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو بروز قیامت میں اسکی طرف سے
(مسلمان کے خلاف) جھگڑوں گا۔)

یہ صرف ایک تنبیہ ہی نہیں بلکہ ایک قانون ہے جو حضور اکرم ﷺ کے دور مبارک میں اسلامی مملکت میں جاری تھا۔ جس پر بعد میں بھی عمل درآمد ہوتا رہا۔ اب بھی یہ اسلامی دستور مملکت کا حصہ ہے۔

اقلیات سے معاشرتی تعلقات کے قرآنی اصول:

ا۔رواداری:

رواداری فارسی زبان کا لفظ ہے جو دو لفظوں "روا" اور "داری" سے مرکب ہے۔روا کا مطلب ہے جائز، مناسب جبکہ داری کا مطلب ہے ملحوظِ خاطر رکھنا۔رواداری اور ہم آہنگی مترادف الفاظ ہیں۔انگریزی میں اسے (condescending) اور (Tolerance) بھی کہتے ہیں۔[1]

مولانا مودودی، رواداری کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اپنے مشہور زمانہ تصنیف تفہیمات میں لکھتے ہیں:

"رواداری" کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے
نزدیک غلط ہیں، ان کو ہم برداشت کریں، ان کے جذبات کا لحاظ کر
کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو، اور
انہیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لیے
زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔اس قسم کے تحمل اور اس طریقے
سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن فعل

---

[1]. Kitabistan New Millennium Dictionary, B.A.Qureshi,Kitabistan Publishing co., P۳۴۷)

ہے، بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو بر قرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں ، اور خود ایک دستور العمل کے پیرو ہوتے ہوئے دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ : آپ سب حضرات برحق ہیں ، تو اس منافقانہ اظہارِ رائے کو کسی طرح "رواداری" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مصلحتاً سکوت اختیار کرنے اور عمداً جھوٹ بولنے میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ [1]

اسلام کے نزدیک ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور سب کے ساتھ بھلائی کا حکم ہے:

اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللهِ فَأَحَبُّ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ [2]

(ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے پیاری وہ مخلوق ہے، جو اس کے کنبہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔)

اسلام جملہ انسانوں کو انسانیت کے رشتے سے بھائی مانتا ہے اور ان کو بھائیوں کی طرح باہمی اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَا تَقَاطَعُوا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَكُوْنُوا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا [3]"

(ایک دوسرے سے تعلقات نہ توڑو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور خدا کے ایسے بندے بن جاؤ جو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔)

---

[1] ۔ سید مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیمات ، اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۶۵، ج۱، ص۱۰۹-۱۱۰

[2] ۔ طبرانی، امام ابوالقاسم، سلیمان بن احمد، المعجم الکبیر، دار حیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ، رقم الحدیث: ۳۳۰۰۱

[3] ۔ مسلم بن حجاج، صحیح المسلم،، مکتبہ البشریٰ، الطبعۃ الجدید، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب النھی عن التباغض والتحاسد والتدابر، رقم الحدیث: ۶۵۳۹

اس لیے اس کی رحمت و شفقت کا دائرہ کسی خاص قوم یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے ہے۔ قرآن مجید میں مطلقاً عدل واحسان کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ[1]

(بے شک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی کا.)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں کے سائے میں ہی انسان زندہ ہے۔ اس لیے اس کریم ہستی کا مطالبہ حضرت انسان سے بھی یہی ہے کہ اے حضرت انسان! دوسروں پر اسی طرح احسان کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر فضل وکرم کی بارش کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ[2]

احسان کر جیسا اللہ نے تجھ پر احسان کیا

اسلام کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے دوسرے مذاہب اور ان کے پیروکاروں سے متعلق مسلمانوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ جس کی بناء پر ان کے دلوں میں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور وسعت نظری پیدا ہوئی۔ دین اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب ایک دوسرے کی تکذیب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھتے تھے اور مذہبی اعتبار سے آج تک سمجھتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ۪ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَؕ[3]

(اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں)

ہندوؤں کی طرف دیکھا جائے تو وہ دوسرے مذاہب کو مذہب کا درجہ ہی نہ دیتے تھے۔ اہلِ فارس میں احساس برتری عروج پر تھا۔ اسلام نے اس نفرت اور تکدر کی فضا میں اعلان کیا کہ

1۔ سورۃ النحل ۱۶:۹۰

2۔ سورۃ القصص ۲۸:۷۷

3۔ سورۃ البقرۃ ۲:۱۱۳

کوئی قوم اللہ کی رحمت سے دور نہیں۔رب العالمین نے ہر قوم کی طرف رسول بھیجے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ[1]

(ہر قوم کے ہادی ہیں)

اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں سب سے زیادہ رواداری کا حامل ہے۔یہ دین میں زبردستی کا قائل ہرگز نہیں۔اہلِ حکم کو بالعموم اور مسلم مبلغین کو بالخصوص حکم دیا گیا ہے:

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ[2]

(کچھ زبردستی نہیں دین میں۔)

اسلام کی رواداری اظہر من الشمس ہے کہ یہ دوسرے مذاہب کے باطل معبودوں کو بھی برا کہنے سے روکتا ہے۔اللہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ[3]

(اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں)

۲۔حقِ انصاف:

اسلام کے اولین دور میں اسلام اور مسلمانوں کا ساتھ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سے رہا۔یہ تینوں اسلام اور مسلمانوں کے مخالف تھے۔اس کے باوجود اسلام نے ان کو ان کے حقوق سے محروم نہیں کیا۔یہود کے ساتھ عدل و انصاف کا حکم قرآن میں موجود ہے:۔اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَاِنۡ حَكَمۡتَ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِالۡقِسۡطِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ[4]

---

[1] سورۃ الرعد ۱۳:۷

[2] ۔سورۃ البقرہ ۲:۲۵۶

[3] ۔سورۃ الانعام ۶:۱۰۸

[4] ۔سورۃ المائدہ ۵:۴۲

(اور اگر ان میں فیصلہ فرماؤ تو انصاف سے فیصلہ کرو بے شک انصاف والے اللہ کو پسند ہیں)

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر میں مختلف مفسرین کی تفسیری آراء ذکر کرنے کے بعد اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں یہ کہتا ہوں جب قاضی کے سامنے مسئلہ پیش کرنے والے دو ذمی کافر یا حربی کافر ہوں تو قاضی پر واجب ہے کہ ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کرے۔ کیونکہ انہوں (قاضی) نے سلطان کی طرف سے یہ منصب اس لیے قبول کیا ہے کہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کریں۔ اسی طرح جب ایک فریق مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کرے، جبکہ مدعی علیہ مسلمان ہو یا ذمی ہو کیونکہ اسلام قبول کر کے یا اس کے احکام کے سامنے اطاعت کا اظہار کر کے شرع کے حکم کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے مگر اس صورت میں مسئلہ مختلف ہو گا کیونکہ اس نے احکام اسلام اپنے اوپر لازم نہیں کیے مگر جب دو مسلمان یا دو ذمی یا دو حربی یا دو مختلف دین رکھنے والے افراد مسلمان قاضی کے علاوہ کسی اور مسلمان کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کریں تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ثالثی قبول کرنا اس پر واجب نہ ہو گی بلکہ اسے اختیار ہو گا چاہے ثالث بنے چاہے اعراض کرے۔"[1]

اس کی توثیق ہمیں جناب رسالت مآب ﷺ کے فرمان سے ملتی ہے:

[1]۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور،، ۱۹۹۵ء ج ۳، ص ۱۲۴

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ امام ہو گا
جو عادل اور خوش اخلاق ہو اور سب سے بری جگہ ایسا امام ہو گا جو ظالم
اور جاہل ہو۔[1]

غیر مسلموں سے تعلقات کے حوالے سے بنیادی اصول عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں ہر کس و ناکس کے ساتھ عدل کرنے کا حکم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ[2]

(بے شک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی کا۔)

دینِ اسلام ہر قسم کے ظلم و زیادتی کے خلاف ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کو عدل و انصاف کا پابند بناتا ہے اور عدل و انصاف کی بنیاد پر ہی پورے معاشرے کی تعمیر چاہتا ہے۔ جس میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں۔ عدل کا ہم معنی لفظ قسط ہے۔ قرآن لاریب میں ہے:

قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ[3]

(تم فرماؤ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔)

ایک اور مقام پر اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ ۚ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ۚ وَ اِذَا
قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی[4]

(ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو! ہم کسی جان پر بوجھ نہیں
ڈالتے مگر اس کے مقدور بھر اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ
تمہارے رشتہ دار کا معاملہ ہو)

1۔ بیہقی، عبد اللہ بن حسین، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، باب فی طاعۃ اولی الامر، رقم الحدیث ۷۳۷۱

2۔ سورۃ النحل ۱۶:۹۰

3۔ سورۃ الاعراف ۷:۲۹

4۔ سورۃ الانعام ۶:۱۵۲

کتابِ لاریب کی اسی آیت میں بلا امتیازِ مذہب یا قرابت داری کے سب کے ساتھ ناپ تول پورا کرنے اور معاشرے میں عدل کا مظاہرہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرابت داری میں چونکہ عدل کرنا انتہائی مشکل امر ہے اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ یہی بات اپنی ذات، والدین، رشتے دار اور امیر غریب کے حوالے سے ایک اور مقام پر زیادہ وضاحت اور احسن طریقے کے ساتھ یوں کہی گئی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا[1]

(اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ اللہ کے لیے گواہی دیتے چاہے اس میں تمہارا اپنا نقصان ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا جس پر گواہی دو وہ غنی ہو یا فقیر ہو بہر حال اللہ کو اس کا سب سے زیادہ اختیار ہے تو خواہش کے پیچھے نہ جاؤ کہ حق سے الگ پڑو اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ پھیر و تو اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے)

مسلم یا غیر مسلم، اقلیت ہوں یا اکثریت انسانیت کے ناطے ان کو ظلم سے بچانا اور عدل و انصاف دلانا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے واضح حکم ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا[2]

(بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں جن کی ہیں انہیں سپرد کرو اور یہ کہ جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو

1۔ سورۃ النسا۴:۱۳۵

2۔ سورۃ النسا۴:۵۸

بے شک اللہ تمہیں کیا ہی خوب نصیحت فرماتا ہے بے شک اللہ سنتا دیکھتا ہے۔)

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کہیں ایسے (بنی اسرائیل کی طرح) بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہر حال بات جب کہو انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو! عدل و قسط کے لئے بوجوہ طاقت کا استعمال بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ سورۃ الحدید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ[1]

(بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور عدل کی ترازو اُتاری کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا اُتارا اس میں سخت آنچ اور لوگوں کے فائدے ہیں۔)

اسلام ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنے کا حکم دیتا ہے۔ فرد اور ریاست دونوں کو اس کا پابند بناتا ہے۔ عدل و انصاف کے معاملے میں اس کے نزدیک دوست اور دشمن میں چنداں فرق نہیں۔ وہ دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی پابندی کو لازمی قرار دیتا ہے اور کسی حال میں بھی اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا۔ اس بات کی وضاحت سورۃ المائدہ کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۚ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ[2]

(اے ایمان والو! اللہ کے حکم پر خوب قائم ہو جاؤ انصاف کے ساتھ گواہی دیتے اور تم کو کسی قوم کی عداوت (دشمنی) اس پر نہ ابھارے کہ

---

[1]۔ سورۃ الحدید ۵۷:۲۵

[2]۔ سورۃ المائدہ ۵:۸

انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو وہ پرہیز گاری سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔)

تاریخِ اسلام میں مسلم اور غیر مسلم سے عدل و انصاف کی بے نظیر مثالیں موجود ہیں۔ اسلام نے قتل کی سزا قصاص رکھی ہے۔ یعنی جان کے بدلے جان۔ ایک مسلمان اگر کسی مسلمان کو قتل کر دے تو وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ ایک ذمی اگر ایک مسلمان کو قتل کر دے تو وہ بھی قتل کیا جائے۔ ایک مسلمان اگر ایک ذمی کو قتل کر دے تو اسے بھی قتل کیا جائے گا۔

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى[1]

(تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو!)

اگر مقتول کے ورثا بغیر کسی جبر و اکراہ کے دیت لینے پر آمادہ ہو جائیں تو انہیں پوری دیت لینے کا حق حاصل ہے۔ امام قرطبی قرآن کی اس آیت کو دلیل بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کافروں اور مسلمانوں کی دیت کی مساوات اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ اگر کسی مسلمان نے کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دیا تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا اور اس کے ورثا کو دیت دے دینا اور اگر تم میں اور کافروں میں کوئی عہد ہو تو مقتول کے ورثاء کو پوری دیت دی جائے گی۔"[2]

آپ ﷺ کا چوری کی سزا نافذ کرتے وقت یہ فرمانا کہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا، یہ بے لاگ انصاف کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرامین میں غیر مسلم کی جان کے تحفظ کے سلسلے میں خاص تاکید وارد ہوئی ہے جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1]۔ سورۃ البقرۃ ۲:۱۷۸

[2]۔ قرطبی، ابو عبد اللہ، محمد بن احمد قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، بنایۃ المسکین، بیروت، ج ۲۰، ص ۲۹۰

"عن عبداللہ بن عمرو عن النبی ﷺ قال من قتل معاھداًلم یرح رائحۃ الجنہ ان ریحھا یوجد من مسیرۃ اربعین عاما"[1]

"عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی دوری سے محسوس ہو گی۔"

۳۔ حقِ پناہ:

ایک مشرک آدمی بھی اگر پناہ مانگے تو قرآنی تعلیمات کے مطابق اسے پناہ دینا اور محفوظ مقام تک پہنچانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ اس سے بڑھ کر رواداری اور کیا ہو سکتی ہے۔ اللہ رب العزت نے سورۃ التوبہ میں ارشاد فرمایا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ[2]

(اور اے محبوب اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو کہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دو۔)

اس آیت کی تفسیر میں ڈاکٹر وھبہ زحیلی ایسے مفسرین کہ جن کے نزدیک یہ آیت "فاقتلوا المشرکین" سے منسوخ ہے، کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ھذا الحکم ثابت فی کل وقت، قال الحسن رضی اللہ عنہ: ھی محکمۃ الی یوم القیامۃ[3]

"(حقِ امان) یہ حکم ہر وقت کے لئے ہے۔ حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے اور قیامت تک کے لئے اس کا حکم ثابت ہے۔"

1۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الجزیہ، باب اثم من قتل ذمیا، رقم الحدیث:۳۱۶۶

2۔ سورۃ التوبہ ۹:۶

3۔ الزحیلی، الدکتور وھبہ، التفسیر المنیر، امیر حمزہ کتب خانہ، کوئٹہ، ۲۰۰۱، ج۵، ص۳۵۹

ڈاکٹر وھبہ زحیلی مذکورہ بالا آیت کی دینی اور سیاسی افادیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والایۃ تفید عموم حکم الامان لاھداف دینیۃ او سیاسیۃ او تجاریۃ[1]

"اس آیت میں بیان ہونے والے حکمِ امان کا عمومی فائدہ یہ ہے کہ غیر مسلموں سے دینی، سیاسی اور تجارتی اہداف حاصل کیے جا سکیں۔"

۴۔ عدم تشدد:

دین اسلام کے بسرعت پھیلنے کا سبب اسلام کی عدم تشدد کی پالیسی تھی۔ صاحبِ قرآن ﷺ انتہائی لین خو اور نرم دل تھے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ[2]

(تو کیسی کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ اے محبوب تم ان کے لیے نرم دل ہوئے اور اگر تند مزاج سخت دل ہوتے تو وہ ضرور تمہارے گرد سے پریشان ہو جاتے۔)

جناب رسالت مآب ﷺ اور آپ کے اصحاب نے عموماً تلوار کا استعمال دفاعی، فتنہ دبانے کے لئے یا مظلوموں کی دادرسی کے لئے کیا مگر کسی غیر مسلم کو مسلم بنانے کے لیے تلوار کا استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ قوت کے زور پر کسی کو مسلمان بنانا دراصل اس کو منافق بنانا ہے اور نفاق کی سزا کفر سے بھی زیادہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ[3]

(بے شک منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہیں۔)

---

[1] ۔ ایضاً، ج۵، ص۴۶۰

[2] ۔ سورۃ آل عمران ۳:۱۵۹

[3] ۔ سورۃ النساء ۴:۱۴۵

اس لیے اسلام تو خیر خواہی کا دین ہے اور پیغمبر اسلام رحمۃ اللعالمین ہیں۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[1]

(کچھ زبردستی نہیں ہے دین میں۔)

اور پیغمبر اسلام ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ کے ذمہ صرف پیغام پہنچا دینا ہے حساب لینا نہیں:

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ[2]

(بہر حال تم پر تو صرف پہنچانا (تبلیغ) ہے اور حساب لینا ہمارا ذمہ۔)

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ[3]

(تم کچھ ان پر کڑوڑا (نگہبان) نہیں۔)

تاریخ شاہد ہے کہ ہادیِ برحق ﷺ نے کبھی کسی ایک شخص کو بھی جبراً مسلمان نہیں بنایا۔

۵۔امن و آشتی:

نوعِ انسانی میں جناب آدم کے بیٹے قابیل سے لے کر اب تک امن و امان کی ضرورت و اہمیت کو شدت سے محسوس کیا گیا ہے۔ انسانی تاریخ کا کوئی بھی عہد امن کی طلب سے خالی نہیں رہا۔ فساد و تشدد کا پودا از خود نہیں اگتا بلکہ اس میں اپنی کارستانیاں کار فرما ہوتی ہیں۔ جس کی طرف قرآن حکیم نے یوں اشارہ کیا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ[4]

(چمکی خرابی خشکی اور تری میں اُن برائیوں سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمائیں۔)

---

[1]۔سورۃ البقرہ ۲:۲۵۶

[2]۔سورۃ الرعد ۱۳:۴۰

[3]۔سورۃ الغاشیہ ۸۸:۲۲

[4]۔سورۃ الروم ۳۰:۴۱

اسلام نے امن و امان اور صلح و آشتی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ حکم ربانی یہی ہے کہ اگر دشمن مصالحت اور جنگ بندی کے لئے آمادہ ہو تو خدا کے بھروسہ پر مصالحت کرلی جائے تاکہ جنگ کی فضا ختم ہو اور اس کے لامتناہی نقصانات سے بچا جا سکے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ[1]

(اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔)

بسا اوقات دشمن صلح کی آڑ میں جنگ چاہتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں تک فرمایا کہ اگر صلح کے نام پر دشمن فریب بھی دینا چاہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صلح کی پیشکش کا خیر مقدم کرنا بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۚ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ[2]

(اور اگر وہ تمہیں فریب دیا چاہیں تو بے شک اللہ تمہیں کافی ہے وہی ہے جس نے تمہیں زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا۔)

۶۔ فلاحِ انسانیت:

پیغمبر اسلام کو اللہ تعالیٰ نے عالمین کے لئے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ﷺ کی رسالت تا قیامت آنے والے سب انسانوں کے لئے ہے۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا[3]

(آپ فرماؤ! اے لوگو میں تم سب کی طرف، اس اللہ کا رسول ہوں۔)

---

[1]۔ سورۃ الانفال ۸:۶۱

[2]۔ سورۃ الانفال ۸:۶۲

[3]۔ سورۃ الاعراف ۷:۱۵۸

سورۃ آل عمران میں امت محمدیہ ﷺ کے سپوتوں کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[1]

(تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں ۔)

محبوبِ کریم ﷺ کا تعارف، اللہ رب العزت نے اس انداز سے کروایا ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ[2]

(بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان۔)

اسلام نے انسانوں کی ذہنی و قلبی مشکلات حل کرنے اور اخلاقی برائیوں کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے رنج و غم کو سکھ اور مسرت میں بدلنے کے لئے نیکی کا ایک جامع پروگرام دیا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر انسانیت فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ-وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِۙ-وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِی الرِّقَابِۚ-وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَۚ-وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْاۚ-وَ الصّٰبِرِيْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا-وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ[3]

(اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو! ہاں اصل نیکی یہ ہے کہ ایمان لاؤ اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور

---

[1]۔ سورۃ آل عمران ۳:۱۱۰

[2]۔ سورۃ التوبہ ۹:۱۲۸

[3]۔ سورۃ البقرہ ۲:۱۷۷

پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو اور گردنیں آزاد کروانے میں اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت یہی ہیں جنہوں نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیز گار ہیں۔)

اس آیت میں مفصلاً نیکی اور دین داری کا تصور بیان کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں ایمانیات ،عبادات اور اخلاقی اصولوں کا تذکرہ ہے وہاں انسانی فلاح و خدمت، ان کے دکھ درد میں شرکت اور ان کی حاجت روائی کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ یہی چیز دینِ اسلام کی روح، اس کا خمیر اور جوہر ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو مشرکین مکہ کی زندگیوں سے نکل چکا تھا اور وہ انسانی فلاح وخدمت کے جذبے سے بالکل عاری ہو چکے تھے۔

قرآن ان کی زندگی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ
وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا[1]

(یوں نہیں بلکہ تم یتیم کی عزّت نہیں کرتے اورآپس میں ایک دوسرے کو مسکین کے کھلانے کی رغبت نہیں دیتے اور میراث کا مال ہپ ہپ کھاتے ہو اور مال کی نہایت محبّت رکھتے ہو۔)

رسالتمآب ﷺ نے اُس جہالت زدہ معاشرے میں حقیقی خداپرستی اور انسانی خدمت و فلاح کی تحریک بپا کی تو مشرکینِ عرب، توحید خداوندی اور خدمت انسانی کے تمام منصوبوں کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

---

[1] ۔ سورۃ الفجر ۸۹:۲۰۔۱۷

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ-قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ-اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ[1]

(اور جب ان سے فرمایا جائے اللہ کے دیئے میں سے کچھ اس کی راہ میں خرچ کرو تو کافر مسلمانوں کے لیے کہتے ہیں کہ کیا ہم اسے کھلائیں جسے اللہ چاہتا تو کھلا دیتا۔ تم تو نہیں مگر کھلی گمراہی میں۔)

مشرکوں کی دگرگوں حالت تو ایسی ہی تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا بالخصوص حال برا تھا۔ ان کے مذہبی رہنماؤں کی حالت بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھی۔ ان کی سرمایہ دارانہ اور استحصالی ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ[2]

(اے ایمان والو بے شک بہت پادری اور جوگی لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ کہ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں خوش خبری سناؤ دردناک عذاب کی۔)

فلاح و بہبودِ انسانیت کی بجائے مال باطل طریقے سے کھانا اور اللہ کی راہ سے روکنا ان مذہبی پیشواؤں کا ایسا کارنامہ تھا جو ان کو مشرکوں کے مشابہ بنا دیتا تھا۔ اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا رویہ خدا پرستی، انسان دوستی اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں کے یکسر خلاف تھا۔ حالانکہ اللہ رب العزت نے ان کو نہ صرف خدا پرستی اور فلاح انسانیت کے کاموں کا حکم دیا تھا بلکہ ان سے عہد بھی لیا۔ اسی عہد کا تذکرہ سورۃ البقرۃ میں اسطرح کیا گیا ہے:

1۔ سورۃ یٰسین ۳۶:۴۷

2۔ سورۃ التوبہ ۹:۳۴

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ-ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ[1]

(اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو پھر تم پھر گئے مگر تم میں کے تھوڑے اور تم روگرداں ہو)

انسانی فلاح و بہبود اور خدمت انسانی کے بغیر اللہ کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک دشوار گھاٹی ہے جسے پار کیے بغیر اللہ کی رضامندی کی بلندی تک پہنچانا ممکن ہے۔ فرمایا گیا:

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ[2]

(پھر بے تامّل گھاٹی میں نہ کودا اور تو نے کیا جانا وہ گھاٹی کیا ہے کسی بندے کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا دینا، رشتہ دار یتیم کو یا خاک نشین مسکین کو پھر ہو اان سے جو ایمان لائے اور انہوں نے آپس میں صبر کی وصیتیں کیں اور آپس میں مہربانی کی وصیتیں کیں یہ دہنی طرف والے ہیں۔)

۷۔وسعت قلبی:

وسعت قلبی اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ جس بندے کو ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور اسے وسعت قلبی کی دولت سے مالا مال کر دیا جاتا ہے جبکہ اللہ جس کو اس کی بد اعمالیوں کی بنا پر گمراہ کرنا چاہے اس کے سینے کو تنگ کر

---

[1]۔ سورۃ البقرہ ۲:۸۳

[2]۔ سورۃ البلد ۹۰:۱۸۔۱۱

دیتا ہے۔ جس کی بنا پر اس کیلئے حق قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایسے دشوار ہو جاتا ہے جیسے آسمان کی بلندیوں میں چڑھنا۔ اس واضح حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ[1]

(اور جسے اللہ راہ دکھانا چاہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ خوب رکا ہوا کر دیتا ہے گویا کسی کی زبردستی سے آسمان پر چڑھ رہا ہے۔)

جب رسالتمآب ﷺ نے حنین کے موقع پر مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا:

ما ارادلهذه القسمة وجه الله[2]

(یہ تقسیم اللہ کی رضامندی کے لئے نہیں۔)

یہ انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ آپ ﷺ اس الزام پر سزا بھی دے سکتے تھے۔ سخت رویہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن وہ مردِ خلیق ﷺ کمال وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گویا ہوئے:

رحم الله موسى لقد اوذى باكثر من هذا فصبر[3]

(اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم کرے ان کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا اور انھوں نے صبر کیا۔)

۸۔ قرابت داری اور ہمسائیگی:

سماج میں انسان کا تعلق سب سے بڑھ کر اپنے اعزاء و اقرباء اور پڑوسیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ دینِ متین میں پڑوسی (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کی بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ سورۃ النساء

1۔ سورۃ الانعام ۶:۱۲۵

2۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف، رقم الحدیث: ۴۳۳۶

3۔ ایضاً، رقم الحدیث: ۴۳۳۶

میں اللہ رب العزت نے رشتے داروں اور ہمسائیوں سے حسن سلوک اور ان کی اقسام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا[1]

(اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ سے بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پاس کے ہمسائے اور دور کے ہمسائے اور کروٹ کے ساتھیاور راہ گیر اور اپنی باندی غلام سے بے شک اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا بڑائی مارنے والا۔)

اس آیت کی تفسیر میں جناب مفتی محمد شفیع، معارف القرآن میں لکھتے ہیں:

"بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ جار ذی القربی وہ پڑوسی ہے جو اسلامی برادری میں داخل اور مسلمان ہے اور جار جنب سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے۔ الفاظ قرآن ان سب معانی کو متحمل ہیں اور حقیقت کے اعتبار سے بھی درجہ میں فرق ہو جانا امر معقول ہے اور معتبر ہے اور پڑوسی کے رشتہ دار یا غیر ہونے کے اعتبار سے بھی اور مسلم اور غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریب ہو یا بعید، رشتہ دار ہو یا مسلم ہو یا غیر مسلم، بہر حال اس کا حق ہے بقدر استطاعت کے امداد و اعانت اور خبر گیری لازم ہے۔"

1۔ سورۃ النساء ۴:۳۶

درج بالا قرآنی آیت کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہمسائیوں سے متعلق جو بھی احکام ہیں یہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو شامل ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> عن ابی ھریرۃ،عن رسول اللہ ﷺ قال: من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیقل خیر اولیصمت، ومن کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیکرم جارہ،ومن کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ[1]
>
> "جو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے، اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے ہمسائے کی عزت کرے اور جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔"

قرابت داری کے حوالے سے قرآن مجید کے بحر ذخار کو دیکھا جائے تو اس سے بڑھ کر حسنِ قرابت داری کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ رب العزت نے اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ سورۃ المائدہ آیت ۵ میں اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠- وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ-وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ-وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ[2]
>
> (آج تمہارے لیے پاک چیزیں حلال ہوئیں اور کتابیوں کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کے لیے حلال ہے اور پارسا

1۔ مسلم، ابوالحسین مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الحث علی الاکرام الجار، رقم الحدیث:۷۴

2۔ سورۃ المائدۃ۵:۵

(پاک دامن) عورتیں مسلمان اور پارسا عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی جب تم انہیں ان کے مہر دو قید میں لاتے ہوئے نہ مستی نکالتے اور نہ آشنا بناتے اور جو مسلمان سے کافر ہو اس کا کیا دھرا، سب اکارت (ضائع) گیا اور وہ آخرت میں زیاں کار ہے۔)

۹۔ انسانی جان کی حرمت:

غیر مسلموں سے معاشرتی تعلقات کے اصولوں میں سے ایک اصول حرمت ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنے نائب کا درجہ دیا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً[1]

(میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو معزز اور مکرم پیدا کیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ[2]

(اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی۔)

کفار کے ساتھ معاشرتی برتاؤ کی بہترین مثال ہمیں اسوہ رسول ﷺ میں نظر آتی ہے۔

حدیث پاک ہے:

حَدَّثَنَا آدَمُ، حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ مُرَّةَ, قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ أَبِي لَيْلَى, قَالَ: كَانَ سَهْلُ بْنُ حُنَيْفٍ، وَقَيْسُ بْنُ سَعْدٍ قَاعِدَيْنِ بِالْقَادِسِيَّةِ فَمَرُّوا عَلَيْهِمَا بِجَنَازَةٍ فَقَامَا، فَقِيلَ لَهُمَا: إِنَّهَا مِنْ أَهْلِ الْأَرْضِ أَيْ مِنْ أَهْلِ الذِّمَّةِ، فَقَالَا: إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّتْ بِهِ جِنَازَةٌ فَقَامَ, فَقِيلَ لَهُ: إِنَّهَا جِنَازَةُ يَهُودِيٍّ، فَقَالَ: أَلَيْسَتْ نَفْسًا[3]

1۔ سورۃ البقرہ ۲:۳۰

2۔ سورۃ الاسرائیل ۱۷:۷۰

3۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب الجنائز، باب من قام جنازۃ یہودی، رقم الحدیث: ۱۳۱۲

"سہل بن حنیف اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہما قادسیہ میں کسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں کچھ لوگ ادھر سے ایک جنازہ لے کر گزرے تو یہ دونوں بزرگ کھڑے ہو گئے۔ عرض کیا گیا کہ جنازہ تو ذمیوں کا ہے (جو کافر ہیں) اس پر انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے اسی طرح سے ایک جنازہ گزرا تھا۔ آپ ﷺ اس کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پھر آپ ﷺ سے کہا گیا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا انسان نہیں ہے؟"

سورۃ التین میں ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ[1]

(بے شک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا۔)

اگر کوئی شخص نسل انسانی کے کسی ایک فرد کو ناحق قتل کر دیتا ہے تو اللہ رب العزت کے نزدیک یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے اس قبیح فعل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا[2] الخ

(اس سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کئے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے ایک جان کو جِلا لیا اس نے گویا سب لوگوں کو زندگی بخش دی۔)

1۔ سورۃ التین ۹۵:۴

2۔ المائدہ ۵:۳۲

ناحق قتل، مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا، قرآنِ پاک دونوں کے لئے یکساں سزا تجویز کرتا ہے۔ اسکی وضاحت سورۃ النساء میں ملتی ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا[1]

(اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے اور اللہ نے اس پر غضب کیا اور اس پر لعنت کی اور اس کے لیے تیار رکھا بڑا عذاب۔)

انسانی جان کے تقدس کے حوالے سے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اسلام میں کسی کی جان لینا حرام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جان لینا یعنی خودکشی کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت نے نہی فرمائی:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ[2]

(اور نہ ہلاک کرو اپنے آپ کو)

امام فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"یہ آیت کریمہ کسی شخص کو ناحق قتل کرنے، خود کشی کرنے اور خود کشی کرنے کی ممانعت پر دلیلِ شرعی کا حکم رکھتی ہے۔"[3]

اسلام نے جسم وجاں کے تحفظ کا حکم دیتے ہوئے تمام افرادِ معاشرہ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ وہ زندگی کو اہم جانیں اور اسکی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان سمجھیں۔ جسے اللہ نے تکریم کی چادر پہنائی ہو اس کے ساتھ تکریم سے پیش آنا ہی انسانیت کا حُسن ہے۔

1۔ سورۃ النساء ۴:۹۳

2۔ سورۃ النساء ۴:۲۹

3۔ رازی، فخر الدین، التفسیر الکبیر، مکتبہ علوم اسلامیہ، اردو بازار، لاہور، ج ۴، ص ۵۸

اصول بیان کرنے کے بعد اب ہم قرآن کریم اور تفاسیر کی روشنی میں غیر مسلموں کے معاشرتی حقوق اور نبی کریم ﷺ نے اس بارے جو تعلیمات وہدایات دیں ہیں ان کا جائزہ پیش کرتے ہیں:۔

غیر مسلم کو بھائی کہنا:

انسان دنیا میں اپنے لیے ایسی جگہ کا محتاج ہوتا ہے جہاں اس کا مستقل قیام ہو سکے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ جہاں پیدا ہوتا ہے اور بودوباش اختیار کرتا ہے اس سرزمین سے اسے ایک محبت اور خصوصی نسبت سی ہو جاتی ہے۔ یہ محبت مذموم عمل نہیں ہے۔ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو سرزمین مکہ سے بڑی محبت تھی جب آپ نے مکہ سے ہجرت کی تو مکہ سے نکلتے ہوئے ارضِ مکہ کو خطاب فرمایا:

"ما أطيبك من بلد وأحبك إليّ، ولولا أن قومي أخرجوني منك ما سكنت غيرك".[1]

"تو کتنا پاکیزہ اور مجھے کس قدر محبوب شہر ہے اگر میری قوم نے مجھے تیری زمین سے نکالا نہ ہوتا تو میں کہیں اور مقیم نہ ہوتا۔"

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ سے ایسی محبت ہوئی کہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ کے کنارے پر واقع کوہ احد پر نظر پڑتی تو آپ کا روئے انور چمک اٹھتا اور سواری کی رفتار تیز ہو جاتی۔ الغرض وطن سے محبت اگر شرعی حدود میں ہو اور ناانصافی اور تعصب کا باعث نہ بنے تو بری بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وطن سے محبت ہو گی تو اہل وطن سے محبت ہونا بھی فطری بات ہے اب ان میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہوں گے۔ اسی لیے اسلام میں اخوت کا ایک دائرہ مسلمانوں کے درمیان ہے۔ اسی طرح جو ہم وطن ہیں وہ بھی ہمارے بھائی ہیں۔ بعض حضرات کو خیال گزرتا ہے کہ غیر مسلموں کو کیسے بھائی کہا جا سکتا ہے؟ لیکن قران مجید کی تعبیر کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ خیال

---

[1]۔ ابن حبان، امام ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد، صحیح ابن حبان، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۳

درست نہیں۔ ہم وطن ایک قبیلہ ہونے کے ناطے غیر مسلم کو بھائی کہہ سکتے ہیں۔اس سلسلہ میں درج ذیل آیات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں:

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ[1]

(نوح کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب کہ ان سے ان کے ہم قوم نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں۔)

كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ[2]

(عاد نے رسولوں کو جھٹلایا جب کہ اُن سے اُن کے ہم قوم (بھائی) ہود نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں)

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ[3]

(ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا جب کہ اُن سے ان کے ہم قوم (بھائی) صالح نے فرمایا کیا ڈرتے نہیں)

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ-الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ[4]

(لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا جب کہ اُن سے ان کے ہم قوم (بھائی) لوط نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں)

قرآن نے جہاں اہل مدین میں حضرت شعیب کا ذکر کیا وہاں رشتہ اخوت کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا[5]

(اور مدین کی طرف ان کی برادری سے شعیب کو بھیجا۔)

1۔ سورۃ الشعراء ۱۰۶:۲۶۔۱۰۵

2سورۃ الشعراء ۱۲۴:۲۶۔۱۲۳

3سورۃ الشعراء ۱۴۲:۲۶۔۱۴۱

4۔سورۃ الشعراء ۱۶۲:۲۶۔۱۶۱

5سورۃ الاعراف ۵۸:۷

اور جہاں اصحاب ایکہ میں دعوت کا ذکر ہے وہاں رشتہ اخوت کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ جناب شعیب علیہ السلام وہاں کے رہنے والے نہ تھے۔

كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡـئَيۡكَةِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۖ اِذۡ قَالَ لَهُمۡ شُعَيۡبٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ[1]

(بَنۡ (جنگل) والوں نے رسولوں کو جھٹلایا جب اُن سے شعیب نے فرمایا کیا ڈرتے نہیں)

علامہ غلام رسول سعیدی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا اس آیت میں حضرت ہود علیہ السلام کو قومِ عاد کا بھائی فرمایا ہے اور یہ بات معلوم تھی کہ حضرت ہود علیہ السلام ان کے دینی بھائی نہ تھے اور نہ ہی وہ ان کے نسبی بھائی تھے۔ ان کو قوم عاد کا بھائی صرف اس وجہ سے فرمایا کہ وہ ان کے قبیلے کے فرد تھے۔[2]

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:۔

والمراد اخاھم فی النسب والقبیلة لا فی الدین لان ھوداً کان رجلا من قبیلہ عاد فیقال للرجل یا اخا العرب ولمراد رجل منھم[3]

(اخاھم ھودا سے) مراد یہ ہے کہ ان کے نسب اور قبیلہ کے اعتبار سے بھائی ہیں نہ کہ دینی بھائی۔ کیونکہ حضرت ہود قبیلہ عاد کے ایک فرد تھے تو جو عرب قبیلہ کا ہو اس کو یا اخا العرب کہہ دیا جاتا ہے اے عرب کے بھائی! مراد ہوتا ہے اے عربی!

غرض کہ جیسے انسانی اخوت کا عالمگیر رشتہ پوری دنیا کے انسانوں کے درمیان وسیع تر بھائی چارہ کی تشکیل کرتا ہے اسی طرح ایک دائرہ، وطن کا، خاندان کا، محلہ داری کا اور اخوت کا بھی

1۔ سورۃ الشعراء۲۶:۱۷۶۔۱۷۷

2سعیدی، علامہ غلام رسول، سعیدی، تبیان القرآن، ج۵، ص۵۶۴-۵۶۳

3زحیلی، ڈاکٹر وھبہ الزحیلی، التفسیر المنیر، ج۶، ص۴۰۵

ہے جو تمام کو بھائی بھائی قرار دیتا ہے۔ خواہ مذہب کے اعتبار سے ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہو۔

غیر مسلم سے تحائف کے تبادلے کا جواز:

تحائف کا تبادلہ، سماجی اور معاشرتی زندگی کا ایک اہم تقاضہ ہے۔ اس سے تعلقات کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ محبت بڑھتی ہے۔ اور بعض اوقات سیاسی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بلقیس کا قول ذکر فرمایا:

وَاِنِّىۡ مُرۡسِلَةٌ اِلَيۡهِمۡ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌ ۢبِمَ يَرۡجِعُ الۡمُرۡسَلُوۡنَ[1]

(اور میں ان کی طرف ایک تحفہ بھیجنے والی ہوں پھر دیکھوں گی کہ ایلچی کیا جواب لے کر پلٹے)

اس آیت کی تفسیر میں ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں۔

كان النبي ﷺ يقبل الهدية ويثيب عليها، ولا يقبل الصدقة، و كذلك كان سليمان عليه السلام وسائر الأنبياء صلوات الله عليهم أجمعين[2]

"نبی کریم ﷺ ہدیہ قبول کرتے تھے۔ اس پر ثابت رہے اور صدقہ قبول نہ فرماتے حضرت سلیمان علیہ السلام اور باقی انبیاء کا بھی یہی معمول تھا۔"

تفسیر قرطبی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ انسانیت کے ناطے، کسی کی دلجوئی کے لئے اور معاشرہ میں محبت کو عام کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ تحفہ قبول فرمالیا کرتے تھے اگرچہ تحفہ دینے والا کافر اور غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔

حدیث مبارکہ میں ہے:

1۔ سورۃ النمل ۲۷:۳۵

2 قرطبی، ابو عبد اللہ، محمد بن احمد قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج ٦، ص ١٥٩

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو دومہ (تبوک کے نزدیک ایک جگہ) کے ایک عیسائی نے دبیز ریشم کا جبہ ہدیہ کیا۔ لوگوں کو اس پر تعجب ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے؛ جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ [1]

اس حدیث پاک میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک غیر مسلم عیسائی کا تحفہ قبول کیا اور اس کو رد نہیں فرمایا۔ صحیح بخاری کی حدیثِ پاک ہے:

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کے ساتھ ہجرت کی وہ ایک ایسے شہر میں داخل ہوئے جس میں ظالم بادشاہ تھا۔ بادشاہ نے (غلاموں کو حکم دیا) کہا: حضرت سارہ کو ہاجرہ دے دو۔ [2]

ابو حمید نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہم غزوہ تبوک میں شریک تھے۔ ایلہ کے بادشاہ (یُحنّہ بن روبہ) نے نبی ﷺ کو سفید خچر اور چادر ہدیہ کی اور آپ ﷺ نے اسے ایک چادر بطور خلعت کے اور ایک تحریر کے ذریعہ اس کو اس کے ملک پر اسے ہی حاکم باقی رکھا۔" [3]

اس حدیث پاک میں بھی صراحۃ مذکور ہے کہ ایلہ کا بادشاہ یحنا بن روبہ جو کہ غیر مسلم تھا اس کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کو ایک خچر اور ایک چادر تحفہ میں دیا گیا اور آپ ﷺ نے

---

[1] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الھبۃ و فضلھا والتحریض علیھا، باب قبول الھدیۃ من المشرکین، رقم الحدیث: ۲۶۱۶

[2] ۔ ایضاً، رقم الحدیث: 2217

[3] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعہ، باب اذا وادع الامام ملک القریۃ ھل یکون ذلک لبقیتھم: رقم الحدیث: 3161

اس تحفہ کو قبول فرمایا۔ معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کافر، غیر مشرک کے تحفہ کو رد نہ فرماتے بلکہ اس کی دلجوئی کے لئے اس کو قبول فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

هدى كسرى لرسول الله ﷺ فقبل منه[1]

کسریٰ نے رسول اللہ ﷺ کو تحفہ دیا تو آپ ﷺ نے قبول کیا۔

متعدد بادشاہوں نے حضور اکرم ﷺ کی طرف تحائف بھیجے اگرچہ بھیجنے والے مسلمان نہ تھے پھر بھی حضور اکرم ﷺ نے ان کے تحائف قبول فرمائے۔

مذکورہ بالا جن واقعات کا ذکر کیا گیا ان کا تعلق ملوک و سلاطین سے ہے۔ اس کا بھی ثبوت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی غیر مسلم خاتون کا ہدیہ قبول فرمایا جس کا تعلق دشمن قوم سے تھا اور جس نے خود بھی انتہائی مذموم اور ناپاک ارادہ سے ہدیہ پیش کیا تھا۔

جنگ خیبر کے بعد جب حالات پر سکون ہو گئے تو مشہور یہودی سلام بن مشکم کی بیوی زینت بنت الحارث نے لوگوں سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو بکری کے گوشت کا کون سا حصہ پسند ہے؟ اسے بتا دیا گیا کہ آپ بازو (دستی) پسند کرتے ہیں۔ اس نے گوشت بھونا اور اس میں زہر ملا دیا اور بازو والے حصہ کو زیادہ زہر آلودہ کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے جیسے ہی بھنا ہوا بازو چکھا فوراً تھوک دیا اور صحابہ کرام سے فرمایا کہ یہ ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔ لہٰذا اسے مت کھاؤ۔[2]

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ نے صرف غیر مسلم بادشاہوں اور سلاطین کے تحفے قبول نہیں کیے بلکہ ایک عام غیر مسلم عورت کا تحفہ بھی قبول فرمایا ہے۔ قبول کیوں نہ فرماتے جبکہ ہادیِ اعظم ﷺ نے خود تحائف کے تبادلے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] احمد بن حنبل، المسند، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ، باب قبول الھدیہ من الکفار، رقم الحدیث: ۶۲۷۷

[2]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب السیر وحدہ، رقم: ۲۹۹۸

تصافحو ایذہب الغل و تہادوا تحابوا[1]

" ایک دوسرے سے مصافحہ کرو !اس سے کینہ دور ہو گا۔ ایک دوسرے کو ہدیہ دو!اس سے ایک دوسرے سے محبت کرو۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ایک دوسرے کو ہدیہ دو! کیونکہ ایک دوسرے کے سینہ سے کینہ کو دور کرے گا اور کوئی عورت اپنی پڑوس کے ہدیہ کو حقیر نہ سمجھے خواہ وہ بکری کے دھڑ کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔"[2]

نبی کریم ﷺ کی بعض غیر مسلموں کے تحائف قبول نہ کرنے کی وجہ:

بعض روایات ایسی بھی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم کا تحفہ قبول کرنے سے انکار فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے قبول اسلام سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک اونٹ بطور ہدیہ پیش کیا آپ نے مجھ سے پوچھا کیا تم اسلام لائے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

انی نہیت عن ھدی المشرکین۔[3]

"مجھے مشرکوں کے تحائف اور عطیات سے روک دیا گیا۔"

یہ حدیث ماقبل بیان کردہ تمام احادیث کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ غیر مسلم سے تحفہ قبول نہیں کرتے تھے جبکہ ماقبل سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ تحفہ قبول فرمایا کرتے تھے۔ اس کے علماء نے کئی جواب دیے ہیں۔

مفسرِ شہیر، امام قرطبی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] المثنی التمیمی، امام احمد بن علی، مسند ابو یعلی، رقم ۶۱۴۸

[2] بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الھبۃ و فضلھا والتحریض علیھا، رقم ۲۵۶۶

[3] ۔ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، سنن ترمذی، دار الفکر، بیروت، رقم ۱۵۸۳

قال جماعة من العلماء بالنسخ فیھا،[1]

بعض علماء نے ان دونوں میں نسخ کا قول کیا ہے۔ یعنی بعض نے کہا ہے کہ جواز کی حدیث ناسخ اور ممانعت والی منسوخ اور بعض نے کہا کہ ممانعت والی احادیث ناسخ اور جواز والی منسوخ۔ مگر یہ دونوں باتیں مجرد دعویٰ ہیں، جس پر دلیل نہیں ۔ کیونکہ کسی حکم کو ناسخ ماننے کے لئے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ منسوخ پہلے ہے جبکہ یہاں پر ثبوت نہیں۔

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیشِ نظر اسلام اور مسلمانوں کا عقیدہ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے جن لوگوں کے بارے میں دیکھا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں گے اور ان کی تالیف قلب ہو گی ان کے تحائف قبول فرمالیے اور انہیں جواباً تحفے دیے لیکن جہاں اس طرح کی مصلحت نہیں تھی وہاں آپ ﷺ نے تحفے رد کر دیے۔[2]

غیر مسلم کی عیادت اور تعزیت:

دنیا کا ایک طبقہ ہماری ہمدردیوں کا نہایت مستحق ہے اگرچہ وہ امیر ہو یا غریب۔ اسلامی معاشرہ میں جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے تو تکلیف کے لمحات میں اس کو تنہائی اور اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ اس کے ارد گرد تیمارداری اور عیادت کرنے والوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں انسانی ترقی ہے کہ ایک انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لئے خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات موجود ہوں۔ خصوصاً اس وقت جب وہ حزن و کرب اور بیماری میں مبتلا ہو۔ مریض کی عیادت سے مریض اور اس کے اہل خانہ پر گہر انفسیاتی اثر پڑتا ہے جس سے اس کو جلد شفایاب ہونے کی امید بندھتی ہے اور اس کے اہل خانہ کو ایک گونہ تسلی اور اطمینان ہوتا ہے کہ مریض جلد شفایاب ہو جائے گا۔

بدیں وجہ سے سرکار دوعالم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم مریضوں کی عیادت میں سستی اور کوتاہی نہ کرتے اور ان کی مزاج پرسی کرتے ہوئے دعا اور غم خواری کے

---

[1] ۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن ابو بکر، الجامع لاحکام القرآن، ص ۱۶۰ ج ۱۶

[2] ایضاً، ج ۶، ص ۱۶۰

کلمات کا اظہار فرماتے ۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کی بھی عیادت کی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

أَنَّ غُلَامًا مِنَ اليَهُودِ كَانَ يَخْدُمُ النَّبِيَّ ﷺ فَمَرِضَ، فَأَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُودُهُ، فَقَعَدَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَقَالَ: أَسْلِمْ. فَنَظَرَ إِلَى أَبِيهِ وَهُوَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَقَالَ لَه: أَطِعْ أَبَا القَاسِمِ ﷺ. فَأَسْلَمَ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ وَهُوَ يَقُولُ: الحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْقَذَهُ مِنَ النَّارِ[1]

"ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتا تھا ایک مرتبہ وہ بیمار ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ عیادت کے لئے آئے۔ آپ ﷺ نے اس کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا اسلام قبول کر لو! اس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے والد کی طرف دیکھا۔ والد نے کہا ابو القاسم ﷺ کی بات مان لو تو وہ اسلام لے آیا۔ نبی ﷺ باہر تشریف لائے اور فرمایا تمام تعریفیں اللہ کے لئے جس نے اس کو جہنم سے بچایا۔"

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

وفيه جواز عيادة أهل الذمة، لا سيما إذا كان الذمي جاراً له، فإن في ذلك إظهار محاسن الإسلام وزيادة التاليف بينهم ليرغبوا في الإسلام[2]

"اس حدیث سے ذمی کی عیادت کا جواز معلوم ہوتا ہے خصوصاً جب وہ پڑوسی ہو کیونکہ یہ اسلام کے محاسن سے ہے اور زیادہ محبت کا ذریعہ ہے۔ تاکہ وہ اسلام کی طرف راغب ہو جائے ان عبادات سے معلوم ہوا کہ کافر کی عیادت حدیث سے ثابت ہے اور علامہ عینی کے مطابق اس میں اسلامی محاسن کا اظہار اور کفار کے لئے ترغیب اسلام ہے۔"

---

[1] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات، رقم:۱۳۵۶

[2] ۔ عینی، بدرالدین، محمد بن احمد عمدۃ القاری، دارالکتب العلمیہ بیروت، ج۸، ص ۲۴۲

ارشاد ہوتا ہے:

وجاز عیادته ای عیادة مسلم ذمیا لو نصرانیا اویهودیا[1]

مسلمان کے لئے ذمی کی عیادت جائز ہے خواہ وہ عیسائی ہو یا یہودی۔

کیونکہ ان کی عیادت کرنا ان کے حق میں خیر خواہی ہے اور ہمیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ حضور علیہ السلام کے پڑوسی میں ایک یہودی بیمار ہو گیا تو آپ نے اس کی عیادت کی۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ویُقال فی تعزیة المسلم بالکافر: أعظم الله أجرك، وأحسن عزاءك".[2]

"مسلمان جب کافر کی تعزیت کرے تو کہے: 'اللہ تمہیں اجرِ عظیم عطا کرے اور تمہیں بہترین صبر و سکون عطا کرے۔"

ان سب احادیث مبارکہ اور فقہی عبارات سے معلوم ہوا کہ کافر کی عیادت بھی جائز ہے اور مرنے کی صورت میں تعزیت بھی روا ہے۔ہاں تعزیت کے وقت ایسے کلمات ادا نہیں کرنے چاہیے جو مسلمان کے عقیدے کے خلاف ہو۔اس کے علاوہ غیر مسلم کی تعزیت کرنا، اس کے لواحقین کے ساتھ غم کا اظہار کرنا ایک سماجی تقاضہ بھی ہے اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق بھی۔

غیر مسلم والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک:

انسانی تعلقات کے احکام کا پہلا قدم صلہ رحمی ہے۔اس کا تعلق خونی رشتوں سے ہے۔اسلام نے ان رشتوں کو بہت اہمیت دی ہے۔اسکی تعلیمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انسان کے درمیان فطری طور پر جو رشتے، ناطے ہیں ان کا احترام ہو۔ان سے بہتر اور خوش گوار تعلقات ہوں۔ان کے حقوق پہچانے جائیں اور ان کے ساتھ ظلم اور زیادتی سے احتراز کیا

---

[1] الترمذی، محمد بن عیسیٰ، سنن ترمذی، ج۵، ص۳۸۸

[2] ۔ ملا نظام الدین الفتاوی، الھندیہ، المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، ج۵، ص۳۴۸

جائے۔ اگر انسان کا اپنے قریب کے حلقہ میں بہتر سلوک ہو تو توقع ہے کہ وسیع حلقے میں بھی اس کا سلوک، اخوت اور ہمدردی کا ہو گا۔ لیکن اگر قرابت دار بھی انسان کے ظلم کا شکار ہونے لگیں تو جن افراد سے اس کا دور کا واسطہ ہے وہ اس کی زیادتیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ارشاد ربانی ہے:

وبالوالدین احساناً[1]

(اور والدین سے حسن سلوک کرو۔)

حقیقت یہ ہے کہ صلہ رحمی کے بغیر محبت، شرافت اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ قربت اور رشتہ داری کی بنیاد والدین ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی خاص تاکید کی ہے۔ اس میں گویا کہ غیر مسلم بھی آتے ہیں لیکن غیر مسلم والدین کی طرف سے کبھی جارحانہ رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے اور نزول قرآن کے وقت مسلمان نوجوان اسی رویہ سے دوچار تھے۔ اس لیے ہدایت کی گئی کہ عقیدہ ہر چیز پر مقدم ہے۔ ماں باپ اگر توحید کے مقابل شرک اور کفر کی دعوت دیں اور اس پر اصرار کرنے لگیں تو ان کی بات ناقابل قبول ہو گی۔ وہ کسی حال میں نہیں مانی جائے گی۔ لیکن ان کی زیادتیوں کے باوجود ان کے دنیوی حقوق ادا کیے جائیں گے اور وہ کبھی نظر انداز نہ ہوں گے۔ والدین کے ساتھ چاہے وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں حسنِ سلوک کیا جائے گا ان کے شرک و کفر کی وجہ سے کسی قسم کی بدسلوکی روانہ ہو گی۔

ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں۔

والا یة دلیل علی صلة الا بوین الکافرین بما امکن من المال ان کان فقیرین والینة القول والدعاء الی الاسلام برفق[2]

---

[1]۔ سورۃ الانبیاء ۱۷:۲۱

[2]۔ قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج۱۷، ص۴۷۶

" آیت دلیل ہے اس بات کی کہ کافر ماں باپ کے ساتھ مال کے ذریعے ممکن حد تک صلہ رحمی کی جائے گی اگر وہ محتاج ہوں اور ان کے ساتھ گفتگو میں نرمی برتی جائے گی اور اسلام کی طرف نرمی سے انہیں دعوت دی جائے گی۔"

رسول اللہ ﷺ نے بھی مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس کا ثبوت حضرت اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہا کے مشہور واقعہ سے ملتا ہے۔

من اسماء بنت ابی بکر رضی الله عنهاقالت قدمت علی امی وهی مشرکة، فی عهد رسول الله صلی الله علیه و سلم، فاستفتیت رسول الله صلی الله علیه و سلم، قلت: ان امی قدمت وهی راغبة افاصل امی؟ قال: نعم، صلی امك[1]

"حضرت اسماء بنت ابی بکر کہتی ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے بعد جب امن قائم ہوا) رسول اللہ ﷺ کے عہد میں میری مشرکہ والدہ آئیں۔ میں نے آپ ﷺ سے اس بارے فتویٰ پوچھا اور عرض کیا کہ وہ مجھ سے کچھ توقع لے کر آئی ہیں تو کیا میں اپنی والدہ سے صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا! ہاں اپنی والدہ سے صلہ رحمی کرو"

قرآن مجید نے والدین کے ساتھ رشتہ داروں کے حقوق بھی بیان کیے ہیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی ہے۔ احادیث میں بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے اور اس میں مسلم غیر مسلم دونوں آتے ہیں۔ بعض قانونی احکام میں ان کے درمیان فرق ہے لیکن حسن سلوک، تعاون اور ہمدردی کے غیر مسلم رشتہ دار بھی مستحق قرار دیے گئے ہیں۔

کتابُ اللہ میں رشتہ دار، اہل ایمان اور مہاجرین کی نسبت ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں مگر یہ کہ تم اپنے رفیقوں کے ساتھ کچھ بھلائی کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔

---

[1] مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۳۲۵

علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔

قال محمد بن حنفیہ نزلت فی اجازۃ الوصیۃ للیھودی والنصرانی[1]

محمد بن حنفیہ نے کہا یہ آیت اس سلسلہ میں نازل ہوئی کے مسلمان یہودی اور عیسائی کو وصیت کر سکتا ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہو گیا کہ بندہ اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتا ہے۔صلہ رحمی میں کئی چیزیں شامل ہیں۔تنگ دست ہو تو قرض معاف کرنا، تحفہ دینا، بیمار ہو تو عیادت کرنا وغیرہ سب شامل ہیں۔

اسلام چاہتا ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ سماجی تعلقات رکھے جائیں اور ان کے ساتھ محبت ہمدردی اور تعاون کا رویہ اختیار کیا جائے اس کا ایک ذریعہ تحفہ دینا بھی ہے۔اس کا ثبوت ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے ملتا ہے۔واقعہ یہ ہے:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو ریشمی حلہ بیچتے ہوئے دیکھا تو نبی ﷺ سے عرض کی کہ اس حلہ کو خرید لیجئے تاکہ جمعہ کے دن اور جس دن وفد آئے آپ پہنیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو وہم پیتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس چند حلے لائے گئے ان میں سے ایک حلہ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا حضرت عمر نے کہا میں اسے کیونکہ پہنوں جب کہ آپ اس کے متعلق ایسا فرما چکے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تم کو پہننے کے لئے نہیں دیا بلکہ اس کو بیچ دو یا کسی کو دے دو! چنانچہ اس حلہ کو حضرت عمر نے اپنے ایک بھائی کو جو کہ مکہ میں تھا اور ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا بھیج دیا۔"[2]

---

[1] قرطبی، ابو عبد اللہ محمد قرطبی، الجامع لا احکام القرآن، ج ۱، ص ۶۷

[2] بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الھبۃ، باب الھدیۃ للمشرکین، رقم الحدیث: ۲۶۱۹

امام نووی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

وفی هذا کله دلیل لجواز صلة الاقارب الکفار والاحسان وجواز الهدیة الی الکفار۔[1]

"اس سب میں دلیل ہے کہ کافر قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک جائز ہے۔ اس میں کفار کو ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کا کہ جواز بھی موجود ہے۔"

غیر مسلم والدین اور قرابت داروں سے خونی رشتہ بہر حال ہوتا ہے۔ اسلام نے اس کے احترام کی تعلیم دی ہے۔ ان کے دکھ درد میں کام آنے، ان سے خوشگوار تعلقات رکھنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے لیکن اگر وہ دین سے پھرنے کی کوشش کریں اور معصیت سے بغاوت کی راہ پر لے جانا چاہیں تو ان کی اطاعت کسی قیمت پر نہیں کی جائے گی۔ البتہ دنیوی حقوق ادا کیے جاتے رہیں گے وہ پامال نہ ہوں گے۔

غیر مسلم کو سلام کرنا:

دنیا کی مختلف اقوام اور گروہوں میں ملاقات کے وقت محبت، احترام یا عزت کے اظہار کے لیے مخصوص جملے یا اعمال کا رواج رہا ہے، اور یہ آج بھی موجود ہیں۔ عیسائیوں میں عام طور پر سلام کے لیے 'ہیلو'، 'گڈ مارننگ' یا اسی طرح کے دیگر دوستانہ جملے کہنے کا رواج ہے۔ یہودی سلام کے لیے 'شلوم (Shalom) ' کہتے ہیں، جو امن اور خیر سگالی کی دعا ہے۔ مجوسیوں کے ہاں جھک کر تعظیم بجا لانے کا طریقہ رائج تھا۔ عرب 'حیاک اللہ' (اللہ تمہیں زندگی عطا کرے) کہتے تھے، جب کہ مسلمانوں کا سلام 'السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کا یہ طریقہ دیگر تمام طریقوں سے افضل اور بہتر ہے، کیونکہ یہ نہ صرف محبت اور خیر سگالی کا اظہار ہے بلکہ مخاطب کے لیے ایک دعا بھی ہے کہ اللہ تمہیں ہر قسم کی آفات، مصائب اور تکالیف سے محفوظ رکھے۔ اس کے ساتھ یہ یقین دہانی بھی شامل ہے کہ سلام

---

[1] ۔ نووی، یحیٰی بن شرف، شرح مسلم، مصطفٰی البابی واولادہ، مصر، ج۵، ص۳۹

کرنے والے کی طرف سے کوئی نقصان یا تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ کلمات محبت، دعا اور امن کا ایک جامع پیغام پیش کرتے ہیں۔

سلام کی فضیلت:

﴿أن رجلاً سأل رسول الله ﷺ: أي الإسلام خير؟ قال: تُطعِمُ الطعامَ، وتَقْرَأُ السلامَ على من عرفتَ ومن لم تعرفْ.[1]﴾

" ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اسلام میں کونسا عمل زیادہ اچھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا (ایک) یہ کہ تم اللہ کے بندوں کو کھانا کھلاؤ (دوسرا) یہ کہ جس سے جان پہچان ہو اس کو اور جس سے جان پہچان نہ ہو اس کو بھی سلام کرو۔

﴿عن ابی اما مة قال قال رسول الله ﷺ ان اولی الناس بالله من بدء بالسلام[2]﴾

"ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں اللہ کے قرب اور اسکی رحمت کا زیادہ مستحق وہی ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔"

سماجی تقاضوں کے تحت غیر مسلم کو سلام کا جواز:

مسلمانوں کے ساتھ تو ہر موقع اور ہر ملاقات پر سلام کرنے کا حکم ہے۔ غیر مسلموں کے بارے اس طرح کی ہدایات تو نہیں ملتیں البتہ سماجی تقاضوں کے تحت غیر مسلم کو سلام کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جب آدمی کو اس سے کام ہو یا کوئی ذمہ داری ادا کرنی ہو، صحت یا سفر کا حق ادا کرنا ہو یا پڑوس کا حق ادا کرنا ہو تو اس کو سلام کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

---

[1] ابو داؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابو داود، کتاب الادب ، باب فی فضل من بدا بالسلام، رقم الحدیث:۵۱۹۷

[2] ۔ ایضاً، کتاب الادب، باب فی افشاء السلام، رقم الحدیث:۵۱۹۴

"حضرت علقمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود کے ساتھ ایک سفر میں تھے بعض ذمی کافر بھی شریک سفر تھے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کا راستہ الگ ہو گیا وہ چلنے لگے تو حضرت عبد اللہ بن مسعود نے انہیں سلام کیا۔ میں نے عرض کی کیا: ذمیوں کو سلام کرنا ناپسندیدہ نہیں ہے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے جواب دیا:

ولكن حق المحبة[1]

"لیکن یہ تو حقِ محبت ہے"

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مشترک مجمع کو سلام کرنا:

اگر مجلس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں موجود ہوں تو سلام کیا جاسکتا ہے۔ حدیث پاک ہے:

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ ایک گدھے پر سوار تھے، جس پر زین رکھی ہوئی تھی اور اس کے اوپر فدک کی بنی ہوئی چادر پڑی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے پیچھے حضرت اسامہ کو بٹھار کھا تھا۔ راستے میں ایک مجلس کے قریب سے گزر ہوا، جہاں مسلمان، مشرکین، بت پرست، اور یہودی سب موجود تھے۔ اس مجلس میں عبد اللہ بن ابی، جو منافقین میں سے تھا، اور صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن رواحہ بھی شریک تھے۔ جب آپ ﷺ مجلس کے قریب پہنچے تو گدھے کی سواری کی وجہ سے گرد و غبار اٹھنے لگی۔ عبد اللہ بن ابی نے اپنی چادر سے ناک ڈھانپ لی اور کہا: "ہم پر گرد و غبار نہ اڑاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو سلام کیا، سواری سے اترے، اور انہیں اللہ کی طرف بلایا۔ آپ ﷺ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ عبد اللہ بن ابی نے گستاخی سے کہا: "اگر آپ کی بات حق ہے تو یہ بہترین بات ہو سکتی ہے، لیکن آپ ہمیں ہماری مجلسوں میں آکر پریشان نہ کریں۔ آپ اپنے مقام پر رہیں، اور جو آپ کے پاس آنا چاہے، اسے اپنی بات سنائیں۔

---

[1] الزحیلی، الدکتور وھبہ، التفسیر المنیر، ج ۸، ص ۲۵۴

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "ہم چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہماری مجالس میں آئیں اور ہمیں اپنی تعلیمات پیش فرمائیں، کیونکہ ہم آپ کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد مجلس میں موجود مسلمان، مشرکین، اور یہودی ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور بات مارپیٹ تک جا پہنچی۔ رسول اللہ ﷺ نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے انہیں سکون اور خاموشی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ پھر آپ ﷺ اپنی سواری پر سوار ہو کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اے سعد! کیا تم نے ابو حباب (عبد اللہ بن ابی) کی باتیں سنیں؟ اس نے یہ اور یہ کہا ہے۔" حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ اسے معاف فرما دیجیے۔ قسم بخدا، اللہ نے آپ کو بہت اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔ مدینے کے لوگوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ اسے اپنا سردار بنائیں گے، لیکن اللہ نے آپ کے ذریعے حق کا بول بالا کر کے اس کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ اس لیے اس کا دل تنگ ہو گیا ہے اور یہ اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے۔" چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے درگزر فرمایا۔[1]

ڈاکٹر وھبہ زحیلی اس حدیث پاک کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسا مجمع جس میں کافر اور مسلمان دونوں موجود ہو ان کو سلام کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کافروں کے پاس تبلیغ دین کے لئے جاتے ہوئے ان کو سلام کیا جاسکتا ہے۔[2]

غیر مسلم کو ممانعت سلام کی نوعیت:

سلام کو چونکہ مسلمانوں کے درمیان عام کرنے کا حکم ہے اس سے یہ استدلال کیا گیا کہ غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جائے گا۔ اسکی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

1۔ بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب الصلاۃ قبل المغرب، رقم الحدیث: ۱۱۸۴

2 الزحیلی، ڈاکٹر وھبہ الزحیلی، التفسیر المنیر، ج۸، ص ۴۵۲-۴۵۱

﴿لا تبدؤا الیهود و النصاری بالسلام فاذالقیتم احدهم فی طریق فاضطروہ الی اضیقه[1]﴾

"یہود و نصاریٰ کو سلام کا آغاز تمہاری طرف سے نہ ہو ان میں سے کسی سے راستے میں تمہاری ملاقات ہو جائے تو اسے اسکے تنگ حصہ میں چلنے پر مجبور کرو!"

اس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو سلام میں پیش قدمی نہیں کی جائے گی اور انہیں راستے کے کنارے چلنے پر مجبور کیا جائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حکم کسی خاص موقع کے لئے تھا؟ وہبہ زحیلی تفسیر المنیر میں لکھتے ہیں:

﴿وربما کان هذاالحدیث لواقعة معینة﴾

شاید یہ حدیث کسی خاص واقعہ کے لئے تھی (یہ حکم عام نہیں ہے) کیونکہ پوچھا گیا کہ کیا کافر کو سلام کیا جا سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں ! اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرٰهِيمَ[2]﴾

(بے شک تمہارے لیے اچھی پیروی تھی ابراہیم۔)

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کافر کو سلام کیا ہے یہ قرآن سے صراحۃً ثابت ہے چنانچہ آپ نے اپنے (عرفی) باپ کو خطاب فرمایا سَلامٌ عَلَیک تجھ پر سلام ہو۔

اس تمام بحث کا خلاصہ کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں کہ ہماری تحقیق یہ ہے کہ کسی کافر یا فاسق کو ابتداءً سلام کرنا، دعا کے معنی میں، جائز ہے، جیسے اللہ تمہیں اسلام کی ہدایت دے۔ یہ سلام تعظیم کی نیت سے نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک، پرورش کے حق کی ادائیگی، ہمسائیگی، یا صحبت کی وجہ سے کیا جائے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ کچھ نوجوان دین دار وضع اختیار کرتے ہیں اور اپنے والد کو، جو داڑھی منڈواتے ہیں، فاسقِ معلن

---

[1] ۔ مسلم بن حجاج، القشیری، صحیح مسلم، ج۶، ص۲۹۶، رقم الحدیث:۵۶۵۵

[2] ۔ سورۃ الممتحنہ ۶۰:۴

قرار دے کر انہیں سلام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ رویہ دین میں سختی اور غیر ضروری شدت کا مظہر ہے۔ کفار اور منافقین کو ابتداءً سلام کرنے کی بہت سی صحیح وجوہات موجود ہیں، خاص طور پر اگر اس سے ان کے دل نرم ہوں یا دعوتِ دین کا ذریعہ بنے۔ دین میں اعتدال اور حکمت سے کام لینا چاہیے اور تشدد یا افراط سے بچنا چاہیے۔ [1]

غیر مسلموں کو سلام کرنے یا ان کے سلام کا جواب دینے میں خلاصہ بحث:

میری رائے میں جن فقہاء نے غیر مسلموں کو سلام کرنے یا ان کے سلام کا جواب دینے کی ممانعت بیان کی یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان غالب تھے۔ عصرِ حاضر میں مسلم اور غیر مسلم کا باہمی تعلق بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے اداروں اور ملکوں میں ملازمتیں بھی کرتے ہیں۔ حکومتی و صنعتی اداروں اور سِول سوسائٹی کی سطح پر روابط بھی قائم ہوتے ہیں۔ بین المذاہب مکالمہ بھی ہوتا ہے اس لیے سلام میں پہل کرنا پڑتی ہے۔ سلام کا جواب بھی دینا پڑتا ہے۔ بعض اوقات مصافحہ اور معانقہ بھی ضروری ہو جاتا ہے جس میں ظاہراً کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

---

[1] ۔ سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن، ج۷، ص۲۸۶

فصل دوم:

غیر اسلامی ریاست میں ہجرت وقیام سے متعلق احکام

ہجر، وصل کی ضد ہے اس کا لغوی معنی ہے "چھوڑ دینا" کہا جاتا ہے ھجرتُ شیئاً۔ پھر اس کا غالب اطلاق ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف نکلنے اور دوسری زمین کی خاطر پہلی زمین کو ترک کرنے پر کیا جانے لگا اور قیام کا معنی ہے ٹھہرنا، سکونت اختیار کرنا۔[1]

مطالعہ قرآن سے ہجرت کی دو قسمیں واضح ہوتی ہیں: ایک ہجرت وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ[2]﴾

(بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے جان و مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔)

ایک شخص نبی ﷺ کے پاس اپنے اہل و عیال اور مال چھوڑ کر آجاتا اور ان میں سے کسی چیز کی طرف رجوع نہ کرتا اور جس جگہ ہجرت کی تا حیات وہیں رہتا۔ نبی ﷺ اس بات کو نا پسند کرتے تھے کہ کوئی شخص اس جگہ مر جائے جہاں سے اس نے ہجرت کی تھی۔ اسی بنا پر آپ ﷺ نے حضرت سعد بن خولہ کی مکہ میں موت پر افسوس کیا۔ وہ حج کے لئے مدینہ سے مکہ آئے اور وہیں وفات پا گئے۔[3]

جب مکہ دار الاسلام بن گیا تو وہ مثلِ مدینہ ہوا اور ہجرت منقطع ہو گئی۔

ہجرت کی دوسری قسم وہ ہے جو اہل دیہہ نے کی اور مسلمانوں کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے۔ لیکن انہوں نے اس طرح کے افعال نہیں کیے جس طرح پہلی ہجرت کرنے والوں نے کیے تھے۔ وہ مہاجر تو ہیں لیکن مہاجرین اولین کی فضیلت میں داخل نہیں ہیں۔

---

[1]۔ ابن منظور، علامہ، لسان العرب، ج۹، ص ۲۴-۲۵

[2]۔ سورۃ التوبہ ۹:۱۱۱

[3]۔ بخاری، ابو عبد اللہ، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب رثی النبی ﷺ سعد ابن خولۃ، رقم الحدیث: ۱۲۹۵

ہجرت کی اقسام سے پہلے ہم علامہ ابن قیم کی "احکام اہل الذمہ" اور ابن عابدین کی "شامی" سے تلخیصاً "دار" کی تعریف اور اسکی تقسیم واضح کرتے ہیں:

دار کی تعریف:

دار اس ملک کو کہتے ہیں، جو تین چیزوں کو شامل ہو:

۱: اِقلیم :(Country) یعنی محدود جغرافیائی مقام۔

۲: سکان:(Population) یعنی اس علاقہ کے آباد لوگ۔

۳: سلطنت :(Kingdom)وہ قیادت جو اس منطقہ میں قائم ہو۔

دار کی تقسیم:

نفاذ قوانین کے اعتبار سے حکومت کی دو قسمیں ہیں:

۱: دار الاسلام ۲: دار الکفر

پھر دار الاسلام کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱: دار الاسلام حقیقی (جہاں عملاً احکامِ اسلامیہ کا نفاذ ہو)

۲: دار الاسلام حکمی (جہاں عملاً احکامِ شرعیہ کا نفاذ نہ ہو)

دار الاسلام کے حوالے سے ابو زہرہ کہتے ہیں:

دار الاسلام وہ ملک ہے جس کا نظامِ حکومت مسلم حکمران کے کنٹرول میں ہو اور اسکی فوجی و دفاعی طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔[1]

دار الحرب کی تعریف سے پہلے ہم ہجرت کی اقسام واضح کرتے ہیں۔

---

[1] ابو زہرہ، محمد، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، القاہرہ، دار الفکر العربی، مصر، ۱۹۹۵ء، ص ۵۶

ہجرت کی اقسام:

۱: دار الخوف سے دار الامن کی طرف ہجرت، جیسا کہ مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی یا اب کشمیر کے مسلمان، ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آکر انگلینڈ، ولایت متحدہ امریکہ یا مغربی جرمنی کی طرف ہجرت کر جائیں۔

۲: دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا، جیسا کہ فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یا اب برما سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنا۔ اسی طرح جو شخص دار الکفر میں اظہارِ دین پر قادر نہ ہو اس کا دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا۔

۳: قرب قیامت میں فتنوں کے ظہور کی وقت مسلمانوں کا ملک شام کی طرف ہجرت کرنا۔

> ابو داؤد میں ہے حضرت عبد اللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عنقریب ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت ہو گی، تو روئے زمین کے اچھے لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت کی جگہ (شام) چلے جائیں گے اور باقی زمین پر بدترین لوگ رہ جائیں گے۔[1]

۴: برائیوں اور گناہوں سے ہجرت کرنا۔[2]

غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت و عدم ہجرت کے جواز و عدم جواز کو سمجھنے کے لئے چند اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے۔ اصلاحی احکام میں بلادِ عالم کو وہاں کے رہنے والے لوگوں اور ان کے مذاہب کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے حالات کا اعتبار کرتے ہوئے مختلف اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے: مثلاً دار الاسلام، دار الحرب، دار المعاہدہ۔

یاد رہے کہ مغربی ممالک دار الحرب نہیں ہیں لہذا ان سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے البتہ بوقتِ ضرورت ان کی طرف ہجرت کرنا جائز ہے۔

---

[1] ۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی سکنی الشام، رقم الحدیث: ۲۴۸۲

[2] ۔ عینی، بدر الدین، عمدۃ القاری، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، ج ۱، ص ۳۵

دار الاسلام کی تعریف:

ائمہ نے کچھ فرق کے ساتھ دار الاسلام کی تعریف کی ہے۔ ان تعریفات کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ علامہ ابو یعلی حنبلی المعتمد فی اصول الدین میں لکھتے ہیں:

﴿و کل دار کانت الغلبۃ فیھا لا حکام الاسلام دون احکام الکفر فھی دار الاسلام[1]﴾

"ہر وہ ملک جہاں احکام کفر کی بنسبت احکام اسلام کا غلبہ ہو دار الاسلام کے زمرے میں آتا ہے۔"

علامہ ابن قیم حنبلی لکھتے ہیں۔

﴿قال الجمھور دار الاسلام ھی التی نزلھا المسلمون و جرت علیھا احکام الاسلام[2]﴾

"جمہور کا قول ہے کہ دار الاسلام سے مراد وہ ملک ہے جہاں مسلمان آباد ہوں اور وہاں اسلامی احکام بھی جاری ہوں۔"

دار الحرب کی تعریف:

شمس الائمہ سرخسی دار الحرب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خلاصہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک دار الحرب کی تین شرطیں ہیں۔ اولاً: اس پورے علاقے میں کافروں کی حکومت ہو اور درمیان میں مسلمانوں کا کوئی ملک نہ ہو۔ ثانیاً: اسلام کی وجہ سے کسی مسلمان کی جان مال و عزت محفوظ نہ ہو اسی طرح ذمی بھی محفوظ نہ ہو۔ ثالثاً اس میں شرک کے احکام ظاہر ہوں۔[3]

---

[1]۔ ابو یعلی، محمد بن حسن، المعتمد فی اصول الدین، دار لمشرق، بیروت، لبنان، ۱۹۷۴ء

[2]۔ ابن قیم، محمد بن ابو بکر، احکام اھل الذمۃ، دار ابن حزم، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷، ج ۲، ص ۲۲۸

[3] السرخسی، محمد بن احمد ابو بکر دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، ج ۱۰، ص ۱۱۴

دار الحرب کے لئے سخت شرائط:

امام اعظم ابو حنیفہ سمیت دیگر علماء کی مذکورہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ کسی بھی اسلامی ملک کو دار الکفر یا دار الحرب میں تبدیل کرنے کے لیے چند شرائط ہیں:

۱: دار الاسلام میں شرکیہ اور کفریہ احکام کا غلبہ ہو جائے یعنی وہاں توحید کی بجائے بت پرستی غالب ہو۔ اللہ جل جلالہ اور رسول اکرم ﷺ کے احکام کی بجائے غیر مسلموں کے احکام مکمل نافذ ہو جائیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ اور اعمال اس سرزمین پر ممنوع قرار دیئے جائیں۔

۲: وہاں کے رہنے کی بھی مسلم یا غیر مسلم کو، پہلی اسلامی حکومت کے دور کی امان اور تحفظ حاصل نہ رہے یعنی وہاں کا ملاً کسی غیر مسلم حکومت کا عملی نفاذ ہو جائے۔

:۳ وہاں سے شعائر اسلام اذان، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ کو مٹایا جائے۔

:۴ مسلم قوم غالب اکثریت میں نہ رہے۔ یہ تمام شرائط جب کسی ملک میں پائی جائیں تب اسکی اسلامی حیثیت مجروح ہو گی بصورت دیگر کسی بھی ملک کو دار الحرب کہنا جائز نہیں ہو گا۔

دار الحرب کے لیے سخت شرائط لگانے میں حکمت:

امام علاؤالدین کاسانی امام اعظم کا فتویٰ درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے جب کبھی دار کی اضافت اسلام کی طرف کی اور دار الاسلام فرمایا، اور کبھی کفر کی طرف کی اور دار الکفر کہہ دیا، تو اس سے مراد ہر گز عین اسلام اور عین کفر نہیں، بلکہ اس سے مقصود امن اور خوف ہے۔ (یعنی ذکر کا مفہوم یہاں وصف مشہور کے طور پر لیا گیا ہے، جیسے عربی میں کہا جاتا ہے: لکل فرعون موسیٰ، جس کا مطلب ہے: ہر مبطل کا مقابلہ کرنے والا محق ہے)۔ لہذا وہ ملک جس میں مسلمانوں کے لیے امان اور کافروں کے لیے خوف ہو، وہ دار الاسلام کہلائے گا۔ ہر وہ ملک جس میں کافروں کے لیے امان اور مسلمانوں کے لیے خوف ہو، وہ دار الکفر، دار الحرب کہلائے گا۔ لہذا مدار امن اور خوف پر ہے، اسلام اور کفر پر نہیں"[1]

---

[1]۔ کاسانی، علاء الدین ابو بکر کاسانی، بدائع الضائع، دار الکتب العربی، بیروت، ۱۹۸۲ء، ج ۲ ص ۱۳۱

فرضیت ہجرت کی حکمت:

تقریباً چھ صدیوں تک (۶۲۳-۱۲۵۸ء) دار الاسلام وسیع اور طاقتور رہا۔ اس دور میں جو مسلمان غیر مسلموں کے علاقوں میں رہتے تھے، ان کے لیے مکی دور کی ہجرت کی مثال قابل تقلید تھی۔ یعنی اگر کوئی شخص دار الکفر میں مسلمان ہوتا اور اس کے پاس وسائل بھی ہوتے، تو اس پر لازم تھا کہ وہ دار الاسلام کی طرف ہجرت کرے۔ اس کی ہجرت دار الکفر کو دار الاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔[1]

کیا مغربی ممالک دار الحرب ہیں؟

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں کہ:

دار الحرب کی یہ تعریف اس ملک پر صادق آتی ہے جس سے مسلمان عملاً جنگ میں ہوں، جہاں اس ملک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم نہ ہوں اور وہاں کسی مسلمان کی جان، مال اور عزت اس کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے محفوظ نہ ہو، جیسا کہ اسپین کے ماضی میں تھا، جہاں مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا اور اسلام پر قائم رہنا قانوناً جرم تھا۔ ایسے ملک سے مسلمانوں پر ہجرت کرنا فرض ہے۔ فقہاء احناف نے حربی کافروں کی جان و مال کو مباح قرار دیا، اور اس سے مراد دار الحرب ہے۔

وہ ممالک جہاں مسلمانوں کے ساتھ سفارتی تعلقات، تجارت اور دیگر معاہدے ہوں، پاسپورٹ اور ویزے کے ذریعے ایک دوسرے کے ممالک میں آنا جانا ہو، اور جہاں مسلمانوں کی جان، مال اور عزت محفوظ ہو، بلکہ انہیں اپنے مذہبی شعائر پر عمل کرنے کی آزادی بھی ہو، جیسے امریکا، برطانیہ، ہالینڈ، جرمنی اور افریقی ممالک، یہ دار الحرب نہیں بلکہ دار الکفر کہلاتے ہیں۔ فقہاء احناف نے اسلامی احکام پر عمل کرنے کی آزادی کے پیش نظر

---

[1] Majid Khaduri, war and peace in the law of islam,boltimore: john hopkings, ۱۹۵۵,.P.۱۴۴

ایسے ممالک کو دار الاسلام کہا ہے، حالانکہ یہ حقیقتاً دار الکفر ہیں۔ بعض اوقات فقہاء دار الکفر پر دار الحرب کا اطلاق بھی کرتے ہیں، اور کبھی اسلام کے احکامات پر عمل کرنے کی آزادی کی بنا پر انہیں دار الاسلام قرار دیتے ہیں [1]

دار الحرب میں مقیم مسلمانوں کی قانونی حیثیت:

حالت جنگ میں دار الحرب میں قیام پذیر مسلمانوں کی قانونی حیثیت کے بارے فقہاء میں اختلاف ہے، بیشتر احناف اور مالکیہ کے نزدیک ان سے غیر مسلموں کی طرح ہی برتاؤ کیا جائے گا۔ ان کی ذات، خاندان اور املاک محترم نہیں رہتیں۔ ایسے مسلمانوں کی حیثیت کا تعین اس علاقے پر لاگو ہونے والے معیارات کے مطابق ہو گا۔ [2]

دوسرے فقہاء اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک اسلام، دار الحرب میں قیام پذیر مسلمان کی ذات، خاندان اور املاک کو محترم قرار دیتا ہے۔ [3]

دار المعاہدہ والصلح کی تعریف:

دار المعاہدہ سے مراد وہ غیر اسلامی ملک ہے جس کی حکومت کسی اسلامی ملک کی حکومت کے ساتھ بعض شرائط پر صلح اور امن کا معاہدہ کرلے دوسرے لفظوں میں جس غیر اسلامی ملک نے کسی بھی اسلامی ملک کے ساتھ چند شرائط پر صلح کرلی ہو اسے معاہدہ یا صلح کی سرزمین کہتے ہیں۔ مسلمانوں کو امن و سلامتی کی بحالی کے لئے صلح پر امادہ کرتے ہوئے سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِىۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ [4]

---

[1] ۔سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج۱، ص۹۹۱-۹۹۲

[2] ۔ابن العربی، ابو بکر، احکام القرآن، دار المعارف، بیروت، ۱۹۷۲ء، ج۱، ص۴۸۶

[3] ۔الشافعی، محمد ادریس، کتاب الام، مکتبہ امیریہ، قاہرہ، ۱۹۷۲ء، ج۵، ص۸۴

[4] سورۃ الانفال ۸:۶۲۔۶۱

(اور اگر کفار مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جایئے اس کی طرف اور بھروسہ کیجیے اللہ تعالیٰ پر بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے اوراگر وہ ارادہ کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں (تو آپ فکر مند کیوں ہوں) بے شک کافی ہے آپ کو اللہ وہی ہے جس نے آپ کی تائید کی اپنی نصرت اور مومنوں (کی جماعت) سے۔)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی لکھتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اصحاب رسول اللہ ﷺ نے کفار سے صلح کی اور ان کے بعد بہت سے ائمہ نے بلاد عجم کے کفار سے صلح کی ان سے جزیہ قبول کیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ وہ ان کو جڑ سے اکھاڑنے پر قادر تھے اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بہت سے کافر شہروں سے کچھ مال کی ادائیگی پر صلح کی ان میں سے خیبر بھی ہے۔ آپ نے خیبر فتح کرنے کے بعد وہ زمین ان لوگوں کے حوالے اس شرط پر کر دی کہ وہ اس زمین کا نصف پیداوار آپ کو ادا کریں گے لہذا اگر کفار کے ساتھ صلح کرنے میں کوئی منفعت ہو یا مقصود کسی ضرر کو دفع کرنا ہو تو پھر صلح کی ابتداء کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[1]

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

امان کی دو قسمیں ہیں۔

۱: امان عام، ۲: امان خاص

---

[1]۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج۴، ص۵۰۷-۵۰۴

امان عام: ایسی امان جو غیر مخصوص جماعت کے لئے ہو۔ اس طرح کی امان، امام یا اس کا نائب جاری کر سکتا ہے۔

امان خاص: ایسی امان جو فرد واحد یا محدود افراد جیسے دس افراد کے لئے ہو۔[1]

علامہ علاء الدین کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> "یعنی امان دو قسم پر ہے:۔ا: وقتی:۲ دائمی۔ وقتی پھر دو قسم پر ہے:
>
> ا: **وقتی معروف:** وہ یہ ہے کہ فوجی کافروں کے کسی شہر قلعہ کا محاصرہ کر لے پھر کفار امان طلب کر لے اور وہ ان کو امان دے دے۔
>
> ۲: **وقتی موادعہ:** وہ یہ کہ دونوں جنگ نہ لڑنے پر صلح کر لے جیسا کہ جب دو آدمی اپنی لڑائی ختم کر دیں تو عربی میں کہتے ہیں۔ تعاھدالفریقان (دونوں نے جنگ ختم کرنے پر صلح کر لی۔)"[2]

مغربی ممالک کا دار الامان دار الصلح اور حکماً دار الاسلام ہونا:

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی حکومتوں کا نظام پہلے سے مختلف ہو گیا۔ ہماری دانست میں، کسی بھی ملک میں کسی مذہب پر کوئی پابندی نہیں بلکہ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ادارہ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا جس کی قرار دادوں کی روشنی میں طے پایا کہ کوئی بھی طاقتور ملک کسی کمزور ملک کے لیے خطرہ نہیں ہو گا بلکہ عالمی پیمانے پر صلح و امن پر سب کا اتفاق ہوا تا کہ دنیا کو جنگی لعنت سے بچایا جا سکے۔

---

[1]۔ زحیلی، وھبہ، الدکتور، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۸، ص ۳۵۱

[2] کاسانی، علاء الدین ابو بکر، بدائع الصنائع، ج ۲، ص ۱۵۷

ادارہ اقوام متحدہ:

دوسری جنگ عظیم،انسانوں کے قتل و خون اور غارت گری، بربریت ،حیوانیت اور ہولناکیوں میں پہلی جنگ عظیم سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ اس میں صرف یہی نہیں کہ ہوائی جہازوں نے سینکڑوں دیہات اور شہر دم کے دم میں برباد کر کے رکھ دیے ، لاکھوں نہتے شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ایٹم بم نے لاکھوں جاپانیوں کا چشم زدن میں کام تمام کر دیا۔ اس ہولناک جنگ کے بعد اس خیال کا پیدا ہونا لازمی تھا کہ اب دنیا کو اس قسم کی ہولناک جنگ سے محفوظ رکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ کسی طرح سے کوئی بڑی طاقتور مملکت امن عالم کے لئے خطرہ نہ بن سکے اور دنیا کو جنگ میں مبتلا نہ کر سکے۔لہذا جیسے اتحادی ملکوں کو یورپ کے محاذ پر کامیابی ہوتی گئی ان کے مدیروں نے اس قسم کے بین الملکی ادارے کے قیام کے بارے سوچنا شروع کیا۔ فرانس تو جنگ کے ختم ہونے تک جرمنی کے زیر اثر رہا۔ باقی چار بڑی طاقتوں کے نمائندے یعنی انگلستان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، روس اور چین جمع ہوئے اور انہوں نے ایک بین الملکی ادارے کا ایک مینو فسٹو تیار کیا جسے ۱۹۴۵ء میں ۵۱ ملکوں نے منظور کیا اور ایک نئے بین الملکی ادارے کی بنیاد پڑی جو اقوام متحدہ (UNO) نام سے نمائع ہوا۔ اقوام متحدہ کے منشور میں یہ بیان کیا گیا کہ اس کے ذریعے دنیا کو جنگ کی لعنت سے بچایا جاسکے اور ساتھ ہی ساتھ معاشی سماجی، تمدنی اور دوسرے انسانی مسئلوں کو بین الملکی ادارے کے ذریعے حل کیا جائے اور ایسے حالات پیدا کیے جائے کہ چھوٹے اور بڑے شہریوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔[1]

اس تمام بحث سے معلوم ہوا کہ ملکوں کے بارے فقہاء نے جو تقسیم بیان کی تھی اب تو وہ حالات نہ رہے۔ اب ہر ملک میں جمہوری نظام ہے اور ہر ملک میں ہر مذہب کو آزادی حاصل ہے لہذا اب دار الصلح اور دار الامن کے الفاظ استعمال کرنے چاہیے کیونکہ جو مذہبی و معاشرتی

---

[1] قدوائی، ڈاکٹر محمد ھاشم، مبادی سیاسیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا، ص۳۱۹-۳۱۸

اور معاشی و سماجی آزادی مسلمانوں کو مغربی ممالک میں حاصل ہے ان میں سے اکثر آزادیاں مسلمانوں کو عالم اسلام کے اکثر ممالک، خصوصاً عرب ممالک میں بھی میسر نہیں۔ اس کے برعکس مغربی دنیا میں آپ کو ہر آزادی حاصل ہے۔ سماجی اور معاشی آزادی حاصل ہے۔ اپنے تعلیمی ادارے بنانے کے علاوہ مساجد اور اسلامک سنٹرز تعمیر کرنے کی بھی اجازت ہے۔ گرانٹس اور دیگر سہولیات بھی میسر ہیں۔ لہذا فقہائے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ایسے معاشرے دار الصلح اور دار الاسلام کہلانے کے حقدار ہیں۔

غیر مسلم ممالک کی طرف جوازِ ہجرت و قیام:

حضرت عبد اللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿لا هجرة ولكن جهاد و نية وإذا استنفرتم فانفروا[1]﴾

"(فتح مکہ کے بعد) ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت ہے اور جب تم کو جہاد کے لئے طلب کیا جائے تو تم جہاد کے لئے روانہ ہو جاؤ۔"

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم ممالک سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے تو پھر ان کی طرف ہجرت کرنا وہاں پر سکونت اختیار کرنا جائز ہو گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر لیثی بیان کرتے ہیں:

" ہم نے نبی کریم ﷺ سے ہجرت کے متعلق سوال کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: " آج کل ہجرت نہیں ہے۔ "[2]

پہلے مومنین اپنے دین کی حفاظت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے پاس بھاگ کر آتے تھے اس خوف سے کہ کہیں وہ دین کی وجہ سے کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں لیکن آج اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرما دیا ہے آج وہ جہاں چاہے اپنے رب کی عبادت کر لیں لیکن جہاد اور اسکی نیت باقی ہے۔

---

[1] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب جزاء الصید، باب لایحل القتال بمکۃ، رقم الحدیث: ۱۸۳۴

[2] ۔ ایضاً، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی المدینہ، رقم الحدیث: ۳۹۰۰

یہ الفاظ قابل غور ہیں: " وہ جہاں چاہے اپنے رب کی عبادت کرے" اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ جگہ یا ملک جہاں مسلمان کو عبادت کرنے کی آزادی ہو، شعائر دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہو وہاں پر جانا اور وہاں قیام کرنا جائز ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک بدو اور بے باک اعرابی آیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ اپکی طرف ہجرت کس جگہ ہے؟ آپ جہاں پر ہو یا کسی خاص سرزمین کی طرف یا کسی خاص قوم کی طرف یا جب آپ وفات پا جائینگے تو ہجرت منقطع ہو جائیگی؟ رسول اللہ ﷺ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ہجرت کے بارے سوال کرنے والا کون ہے؟ اس نے کہا میں یہاں ہوں یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہجرت یہ ہے کہ تم بے حیائی کے کاموں کو ترک کر دو خواہ وہ کام ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور تم نماز پڑھو اور زکوۃ ادا کرو تو تم مہاجر ہو خواہ تم حضرت موت میں فوت ہو۔[1]

ان تمام احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب پورے عرب میں امن قائم ہو گیا اور مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی تو ہجرت کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ حکم صرف مکہ مکرمہ کے لئے نہیں بلکہ ہر وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کو ان کے اسلامی امور کی بجا آوری میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے اس میں داخل ہے۔ علامہ شوکانی کہتے ہیں: ابتدائے اسلام میں چونکہ مسلمان تعداد میں کم اور منتشر تھے اس لیے ضرورت تھی کہ ان کو کسی ایک مقام پر جمع کیا جائے۔ اس وقت، اس حکمت کے پیش نظر ہجرتِ مدینہ کا حکم دیا گیا لیکن جب مسلمان تعداد میں بڑھ گئے اور ان کی قوت بھی کافی حد تک مستحکم ہو گئی جس کا علامتی مظاہرہ فتح مکہ کی صورت میں ہوا تو ہجرت مدینہ کا یہ حکم اٹھالیا گیا۔

---

[1]۔ احمد بن حنبل، مسند، رقم الحدیث: ۷۰۹۵

علامہ غلام رسول سعیدی مذکورہ احادیث کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ سے قبل بعض صحابہ کو مکہ میں رہنے کی اجازت دی۔ جب کہ فتح مکہ سے قبل مکہ دار الکفر تھا، مثلاً اپنے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب کو حضور ﷺ نے مکہ میں رہنے کی اجازت دی اس لیے کہ ان کے بارے دینی فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہیں تھا اور ذاتی وجاہت اور خاندانی اثر ورسوخ کی وجہ سے کفار ان کو جانی ومالی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔[1]

اسی طرح حضرت نعیم رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم (بنو عدی) ان کے پاس گئی اور کہا تم اپنے دین پر قائم رہو اور ہمارے پاس ٹھہرو اور جو شخص تمہیں اذیت پہنچانے کا ارادہ کرے گا ہم تمہیں اس سے محفوظ رکھیں گے اور تم جو ہماری کفالت کیا کرتے تھے وہ کرتے رہنا۔ (حضرت نعیم، بنو عدی کی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کیا کرتے تھے) تو ایک مدت تک انہوں نے ہجرت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: تمہاری قوم میری قوم سے بہتر ہے۔ میری قوم نے مجھے میرے وطن سے نکال دیا اور میرے قتل کا ارادہ کیا اور تمہاری قوم نے تمہاری حفاظت اور حمایت کی اور تمہیں جانے نہ دیا۔ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آپکی قوم نے آپکو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دشمن کے خلاف جہاد کی طرف نکالا اور میری قوم نے مجھے ہجرت اور اللہ کی عبادت سے روک لیا۔[2]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کا مکہ ہی میں مقیم رہنا جبکہ باقی تمام صحابہ کا مدینہ شریف کی طرف ہجرت کرنا جبکہ ہجرت ان پر فرض تھی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر دار الکفر میں بندے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور احکام پر عمل کرنا ممکن ہو اور کسی

---

[1]۔ سعیدی، غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، ج۳، ص۲۶۹

[2]۔ ابن قدامہ، عبد اللہ بن احمد مقدسی، المغنی، ج۹، ص۲۳۶-۲۳۷

قسم کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا خوف نہ ہو تو پھر اس کے لئے اس دار الکفر سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے۔

بعض صحابہ نے مکہ میں کفار کی اذیتوں سے مجبور ہو کہ حبشہ کی عیسائی سلطنت کا رخ کیا اور وہیں مقیم ہو گئے اور جب تک اللہ تعالیٰ نے ہجرتِ مدینہ کی سبیل پیدا نہیں کی وہیں مقیم رہے یہاں تک کہ بعض صحابہ رسول اللہ ﷺ کے ہجرت فرمانے کے بعد بھی وہیں مقیم رہے اور یہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کی مرضی اور آپکے حکم سے ہوا تھا کیونکہ صحابہ کے حالات دیکھ کر آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا تھا:

﴿لو خرجتم الی ارض الحبشه فان بها ملکا لا یظلم عنده احد وهی ارض صدق حتی یجعل الله لکم فرجا مما انتم فیه فخرج عند ذلك المسلمون من اصحاب رسول الله ﷺ الی ارض الحبشه[1]﴾

اگر تم لوگ حبشہ کی سرزمین کی طرف نکل جاؤ تو وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے پاس کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا، اور وہ سچائی کی سرزمین ہے، یہاں تک کہ اللہ تمہارے لیے اس معاملے سے نجات اور آسانی پیدا کر دے جس میں تم مبتلا ہو۔ چنانچہ اس کے بعد آقا ﷺ کے صحابہ میں سے مسلمان حبشہ کی سرزمین کی طرف نکل گئے۔

بلکہ خود نجاشی مسلمان ہونے کے بعد اپنی غیر اسلامی سلطنت میں مقیم رہا جب کہ وہ اپنے وسائل کی بدولت مدینہ ہجرت کرنے کی قدرت رکھتا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے وہ حبشہ میں رہا اور جب اس کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اسکی نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ سعید بن میسر بیان کرتے ہیں کہ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کے پاس ایک وفد بھیجا نبی کریم ﷺ نے ان کے سامنے قرآن پڑھا اور وہ مسلمان ہو گئے پھر وہ وفد نجاشی کے پاس گیا اور

---

[1]۔ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، ابن ہشام، الیسوۃ النبویۃ مصطفیٰ، مصر، ج۱، ص ۳۲۱

اس کو خبر دی تو نجاشی بھی مسلمان ہو گیا اور وہ تادم مرگ مسلمان رہا (اور جب فوت ہوا) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿مات الیوم رجل فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمۃ[1]﴾

"آج کے دن نیک آدمی فوت ہو گیا کھڑے ہو جاؤ اور اپنے بھائی اصحمہ پر نماز جنازہ پڑھو۔"

پھر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں نماز پڑھی اور نجاشی (کا جنازہ) اس وقت حبشہ میں تھا۔[2]

مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں کہ میں نے عسید بن عمیر کے ساتھ مل کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کی اور ان سے ہجرت کے بارے سوال کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"اب ہجرت کا حکم نہیں ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کا حکم اس وقت تھا جب مسلمانوں کے لئے دینی اعتبار سے فتنے کا اندیشہ تھا اس لیے مسلمان مختلف علاقوں سے سمٹ کر رسول اللہ ﷺ کے زیرِ سایہ مجتمع ہو گئے لیکن اب اللہ نے اسلام کو فروغ دے دیا ہے اس لیے اب جو شخص جہاں چاہے رہ کر اپنے رب کی عبادت کرے البتہ جہاد اور نیت کا حکم اب بھی باقی ہے۔"[3]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت کا حکم مطلق نہیں ہے بلکہ فتنہ کی علت کے ساتھ معلول ہے۔ جہاں پر علت پائی جائے گی حکم بھی پایا جائے گا اور جہاں پر نہیں وہاں پر حکم بھی نہیں لہذا وہ ممالک جہاں پر دینی اعتبار سے مسلمانوں کے لے فتنہ نہیں ہے وہاں پر اقامت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہاں مقیم مسلمانوں کو اس ملک

---

[1]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب موت النجاشی، رقم الحدیث: ۳۸۷۷

[2]۔ سعیدی، غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، ج۳، ص۲۶۹

[3]۔ ایضاً، ج۳، ص۲۶۹

سے ہجرت کرنا واجب نہیں تو جب ان ملکوں میں رہنا جائز ہے تو پھر ان کی طرف ہجرت کرنا بھی جائز ہو گا۔

جو احادیث متقدمین علماء نے غیر مسلم ممالک کے بارے میں بیان کی ہیں موجودہ زمانے میں تو حالات بالکل مختلف ہیں۔ آج ان ممالک میں فکر و عقیدہ اور اظہار خیال کی جو آزادی ہے وہ بہت سے اسلامی ملکوں میں بھی میسر نہیں ہے۔ آج وہاں اسلامی ادارے، مساجد، مدارس اور دینی تحریکات و تنظیمات کی خاصی تعداد خدمت دین میں مصروف عمل ہیں اور ان کے لئے کوئی سیاسی یا قانونی رکاوٹ نہیں ہے۔ بڑے بڑے اہل علم اور اہل تحقیق موجود ہیں جو مختلف ممالک سے مختلف اسباب کے تحت وہاں پہنچ گئے اس لیے آج ان ممالک میں نہ تو اسلام کے لئے خطرہ ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے، پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا جائے اور اس طرح تمام غیر اسلامی ممالک کو اسلام اور مسلمانوں کے وجود سے خالی کر دیا جائے اس طرح کی بات کم از کم آج کے دور میں کوئی دانشمند شخص نہیں کہہ سکتا۔

عدم جواز کے دلائل اور ان کا رد:

جو علماء غیر مسلم ممالک کی ہجرت کو ناجائز کہتے ہیں وہ درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

پہلی دلیل:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبه ولا تنقطع التوبة حتىٰ تطلع الشمس من مغربها[1]﴾

"ہجرت اس وقت تک ختم نہیں ہو گی جب تک کہ توبہ کا دروازہ بند نہ ہو اور توبہ کا دروازہ اس وقت تک بند نہیں ہو گا جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو جائے۔"

[1]۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی، سنن ابی داود، رقم الحدیث: ۲۴۷۹

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا عمل تا قیامت جاری رہے گا اور اب ظاہر ہے کہ اس حکم کے مخاطب غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمان ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی بھی غیر مسلم ملک میں سکونت اختیار نہ کریں تو جس وقت غیر مسلم ملک میں حکومت اختیار کرنا جائز نہیں تو پھر ان کی طرف ہجرت کرنا کیسے جائز ہو گا۔

دوسری دلیل:

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿لا تساکنوا المشرکین ولا تجامعوھم فمن ساکنھم او جامعھم فھو مثلھم[1]﴾

مشرکوں کے ساتھ نہ رہو اور نہ ان کے ساتھ اکٹھے ہو جو ان کے ساتھ رہے گا یا اکھٹا ہو گا وہ انہی کی طرف سمجھا جائے گا۔

ان روایات سے صراحۃً غیر مسلموں کے درمیان رہنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔

تفسیر تبیان القرآن اور غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت:

علامہ غلام رسول سعیدی نے مذکورہ بالا روایات کا مسکت جواب دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ جن احادیث میں غیر مسلموں کے درمیان سکونت کی ممانعت کا ذکر ہے وہ احادیث سنن کی ہے اور جن میں اجازت کا ذکر ہے وہ احادیث، صحاح کی ہیں اور اصولِ حدیث یہ ہے کہ صحاح کی احادیث کو سنن کی احادیث پر ترجیح ہوتی ہے لہذا صحاح کی احادیث کو ترجیح حاصل ہے اور غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت کرنا منع نہیں ہو گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ساتھ رہنے سے بیزاری کا اظہار فرمایا اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں رہنے سے مسلمانوں کو اپنے دین، جان و مال اور عزت و آبرو کی بربادی کا خطرہ ہو۔ جہاں اسلامی شعائر فرائض اور واجبات سے

---

[1] ۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، سنن ترمذی، ج ۵ ص ۲۳۰

ممانعت ہو جہاں کی تہذیب کلچر اور سوسائٹی کے برے اثرات سے مسلمان محفوظ نہ رہیں ایسی جگہ سے ہجرت کرنا ضروری ہے۔ برخلاف اس غیر مسلم ملک کے جس میں مسلمانوں کے عقائد کو خطرہ نہ ہو وہ آزادی کے ساتھ اپنے عبادات کو انجام دے سکیں۔ وہاں مسلمانوں کے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے مزید لکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا کیونکہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور انہیں جمعیت کی ضرورت تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح کرادیا اور لوگ فوج در فوج میں اسلام میں داخل ہونے لگے تو مدینہ طرف ہجرت منسوخ ہوگئی۔[1]

عقلی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو عدم جواز کے دلائل کی معنویت آج کے دور میں باقی نہیں ہے۔ اس لیے کہ تمام اقوام و ممالک نے اپنے اپنے آئین میں مذہبی آزادی کا اصول تسلیم کر لیا ہے۔ ہر ملک میں ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دی گئی۔ اس لیے آج کے حالات میں کسی غیر اسلامی ملک کے زیرِ اثر زیادہ سے زیادہ جن مسائل کا سامنا ہے وہ اقتصادی مسائل ہیں مگر ان کا بڑا حصہ قانون اسلامی سے متصادم نہیں۔

ہجرت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے۔ جتنی خود تاریخ انسانی بلکہ آدم علیہ السلام کا جنت سے نکلنا اور زمین پر آباد ہونا بھی ایک عظیم ہجرت کا نتیجہ تھا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾[2]

((اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اُترو تم میں ایک دوسرے کا دشمن ہو۔)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا﴾[3]

(فرمایا تم دونوں مل کر جنت سے اُترو)

---

[1] سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج ۴، ص ۷۱۹-۱۴۷

[2] ۔ سورۃ الاعراف ۲۴:۷

[3] ۔ سورۃ طہ ۱۲۳:۲۰

حضرت آدم علیہ السلام کی یہ ہجرت جنت سے نکل کر اس مقام پر سکونت اختیار کرنے سے عبارت ہے جس مقام کے لئے انہیں پیدا کیا گیا اور جہاں انہیں خلافت ارضیہ نصیب ہونی تھی۔ گویا اس کرہ ارض پر انسانی تہذیب کا نقطہ آغاز ہی ہجرت تھی۔ کتابِ زندگی کے پہلے باب کا آغاز ہی لفظ ہجرت سے ہوتا ہے۔

ہجرت وقیام کے بنیادی اسباب:

ہجرت اختیار کرنے کے بنیادی اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف، ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت کیوں کرتا ہے؟ اس کو احکام القران میں علامہ ابو بکر محمد عبد اللہ المعروف ابن عربی نے بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ ان اسباب کو ہم مختصراً ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے بعض کی تفصیل بھی ذکر کرینگے۔

۱: دار الحرب سے ہجرت کرنا۔

۲: اہل بدعت کا غلبہ ہونے کی وجہ سے ہجرت کرنا

۳: حرام کاموں کا غلبہ ہونے کی وجہ سے ہجرت کرنا

۴: اس علاقہ میں جانی نقصان کا خطرہ ہونے کی وجہ سے ہجرت کرنا

۵: کسی علاقہ کے آثارِ عذاب دیکھنے کے لئے ہجرت کرنا

۶: حج کرنے کے لئے ہجرت کرنا

۷: جہاد کے لئے ہجرت کرنا

۸: رزق حلال کے حصول اور تجارت کے لئے ہجرت کرنا

۹: علم دین اور علم نافع کے لئے ہجرت کرنا

۱۰: متبرک مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہجرت کرنا[1]

[1]۔ قرطبی، احکام القرآن، ج۱، ص ۶۱۲-۶۱۱

رزق حلال کے لئے ہجرت وقیام:

ہجرت کا بنیادی سبب عموماً معاشی خوشحالی کی تلاش ہے۔ آج روزگار کی تلاش میں لوگ ترقی یافتہ ممالک میں نقل مکانی پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ اپنے اہل وعیال کے لئے آسودہ لمحات تلاش کرنے کے سلسلہ میں غیر مسلم ممالک کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ آسودہ زندگی کی تلاش کا یہ سفر آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

رزق حلال کی تلاش میں ہجرت کرنے والا اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والا ہے اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً[1]﴾

(اور جو اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر نکلے گا وہ زمین میں بہت جگہ اور گنجائش پائے گا)

معاشی ضروریات کی وجہ سے ہجرت وقیام:

اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہو جائے۔ بے روزگار پھر رہا ہو۔ تلاشِ بسیار کے باوجود اس کو اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں اور ہر طرف سے مایوسی کا سامنا ہو ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے تو رزق حلال حاصل کرنے کے لئے اس کا اپنے ملک کو چھوڑنا اور غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرنا جائز ہے کیونکہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں تک ہو رزقِ حلال تلاش کرو! چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا[2]﴾

1۔ سورۃ النساء ۴:۱۰۰

2۔ سورۃ الملک ۶۷:۱۵

(وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین رام (تابع) کردی تو اس کے رستوں میں چل۔)

جائز طریقے سے کسب و تجارت کے ذریعے اپنے خاندان کے لئے رزق حلال کا حصول اور اس کی طلب انسانی ضرورت ہے اور قرآن پاک میں متعدد مقامات پر رزقِ حلال حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تعبیر کرتے ہوئے اسکی تلاش و جستجو جاری رکھنے کی ترغیب بھی دی اور اس کا حکم بھی دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ[1]﴾

(تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔)

روزگار کی تلاش:

حضرت سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرور عالم ﷺ ایک روز صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ساتھ تشریف فرما تھے اتنے میں ایک نوجوان قریب سے گزرا صحابہ کرام نے ایک طاقتور اور مضبوط جسم والے نوجوان کو دیکھا تو کہا کاش اسکی جوانی اور طاقت اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ ہوتی اس پر رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

۱: اگر یہ شخص اپنے چھوٹے بچوں کے لئے رزق کی تلاش میں نکلا ہے تو یہ اللہ کی راہ میں ہے۔

۲: اگر یہ اپنے بوڑھے والدین کے لئے رزق کی تلاش میں نکلا ہے تو یہ اللہ کی راہ میں ہے۔

۳: اور اگر یہ خود کو (لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے یا حرام کھانے سے) بچانے کے لئے رزق کی تلاش میں نکلا ہے تو بھی یہ اللہ کی راہ میں ہے۔

۴: البتہ اگر یہ دکھاوے اور فخر کے لئے نکلا ہے تو یہ شیطان کی راہ میں ہے۔[2]

حدیث مبارکہ ہے:

---

[1]۔ سورۃ الجمعۃ: ۶۲:۱۰

[2]۔ طبرانی، ابو القاسم، سلیمان بن احمد طبرانی، المعجم الاوسط، ج ۵ ص ۱۳۶، رقم الحدیث: ۶۸۳۵

﴿من طلب الدنیا حلالا استعفا فا عن السئوال وسعیا علی اهله وتعطفا علی جارہ لقی اللہ ووجھه کالقمر لیلة البدر[1]﴾

"جس نے خود کو سوال سے بچانے، اپنے اہل خانہ کے لئے بھاگ دوڑ کرنے اور اپنے پڑوسی پر مہربانی کرنے کے لئے حلال طریقے سے دنیا طلب کی وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہو گا۔"

علوم عصریہ کے حصول کے لئے ہجرت وقیام:

ڈاکٹر زحیلی نے ہجرت کے جائز ہونے کے تین اسباب بیان کیے ہیں۔ آپ نے جو تیسرا سبب بیان کیا ہے ہم صرف اسی کو یہاں پر ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿الاعداد لاقامة دولة الاسلام﴾

"ملت اسلامیہ کو قائم اور مضبوط کرنے لئے ہجرت کرنا جہاں پر یہ سبب پایا جائے گا وہاں پر ہجرت کرنا جائز ہو گا۔"

یعنی ایسے علوم جن کو حاصل کر کے ملک وملت کی خدمت کی جاسکتی ہو، ان کی وجہ سے ملک کی ترقی اور خوشحالی حاصل ہو سکتی ہو اور وہ علوم اپنے اسلامی ملک میں کما حقہ حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو ان کو حاصل کرنے کے لئے غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت کرنا جائز ہے۔

علوم جدیدہ کی ضرورت واہمیت:

دور حاضر میں عصری تعلیم کی ضرورت وافادیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ؟ صنعت و حرفت اور اقتصاد و معیشت میں ترقی، عصری تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ ملت اسلامیہ کو قابل اور باصلاحیت ڈاکٹروں کی ضرورت ہے اور قانون کے ماہر وکلاء کی بھی، تعلیمی میدان میں کام کرنے کے لئے مسلمان ماہرینِ تعلیم درکار ہیں اور مختلف علوم وفنون میں پیشہ ورانہ صلاحیت کے حاصل عظیم اسکالر، امت مسلمہ اپنے ہمہ جہت ترقی کے لئے ماہرین معاشیات کی بھی

---

[1]۔ ابن ابی شبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد، المصنف، مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۰ھ، ج۵، ص۲۵۸، رقم الحدیث: ۷

محتاج ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی پر عبور رکھنے والے افراد کی بھی۔ الغرض امت مسلمہ کے لئے عصری علوم کی ضرورت ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ اسلام کسی بھی علم کے حصول کا مخالف نہیں بس اسلام حدود و قیود متعین کرتا ہے۔ لہذا یہ علوم فی نفسہ مباح ہیں۔ ان میں سے بیشتر علوم میں کسی نہ کسی حوالے سے انسان کی فلاح ہے۔ اگر کوئی شخص ان علوم کو اس لیے حاصل کرتا ہے کہ ان سے دنیا کمائے، عیش و عشرت کرے، نفسانی شہوات و خواہشات کو پورا کرے تو یہ راستہ معصیت کا راستہ ہے۔ اگر کوئی ان جدید علوم کو اس لیے حاصل کرتا ہے کہ ان کے ذریعے حلال طریقے سے اپنی اور اپنے زیرِ کفالت افراد کے لئے حلال روزی کمائے تو یہ نیک عمل ہے۔ وہ اس پر ماجور ہو گا اور اگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نیت کر لیتا ہے کہ ان علوم میں کمال حاصل کر کے ملت اسلامیہ کو ترقی، مسلمانوں کو غالب اور باطل کو مغلوب کرے، اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لائے تو یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ اگر ایسا شخص عام زندگی مین دینی فرائض واجبات اور سنن کا پابند ہے اور بقیہ وقت نیک نیتی کے ساتھ غلبہ اسلام کے لئے علوم جدیدہ میں مہارت کے لئے صرف کرتا ہے تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نفل نمازیں پڑھنے والے، نفلی روزے رکھنے والوں سے زیادہ اجر عطا فرمائے۔

ایٹمی ہتھیار بنانے کے لئے تفکر اور سائنسی علوم میں مہارت افضل ترین عبادت:

حضرت عقبہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: بے شک اللہ عزوجل ایک تیر کے سبب سے تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

۱: تیر بنانے والا جو تیر بنانے میں ثواب کی نیت کرتا ہو

۲: تیر کو حاصل کرنے والا

۳: تیر اندازی کرنے والا

تم تیر اندازی کرو! اور شہ سواری کرو! اگر تم تیر اندازی کرو تو وہ میرے نزدیک گھڑ سواری سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ کھیل میں صرف تین چیزیں پسندیدہ ہیں: کسی شخص کا اپنے گھوڑے کو سدھانا، کسی شخص کا اپنی زوجہ سے دل لگی کرنا اور کمان سے دل لگی کرنا اور پکڑنا۔ [1]

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تیر اندازی سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی بہت تاکید فرمائی کیونکہ اس زمانہ میں یہ دشمن کے خلاف بہت بڑا اور موثر ہتھیار تھا۔ آج کے زمانے میں تیر اندازی کی جدید شکل میزائل ہے۔ جس طرح تیر کو کمان میں رکھ کر ہدف پر مارتے ہیں اسی طرح میزائل وار ہیڈ میں ایٹم بم رکھے جاتے ہیں اور لانچنگ پیڈ سے میزائل کو ہدف پر داغا جاتا ہے تو جس طرح اُس زمانہ میں تیر اندازی کا علم حاصل کرنا اور اسکی مشق کرنا ضروری تھا اسی طرح عصر حاضر میں ایٹم بم کی تیاری کا علم اور میزائل بنانے کا علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ عصرِ حاضر میں جب تک کسی ملک کو ایٹمی صلاحیت حاصل نہ ہو اسکی بقا کی ضمانت نہیں دی جاسکتی دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کے دو شہر: "ہیروشیما اور ناگاساکی" پر ایٹم بم گرائے تھے۔ جس سے وہ شہر تباہ ہوگئے اور جاپان وہ جنگ ہار گیا۔ اگر اس وقت جاپان کے پاس بھی ایٹم بم ہوتے تو امریکہ کبھی جاپان پر ایٹم بم نہیں گرا سکتا تھا۔ امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ کے زمانے مین شدید مخالفت کے باوجود امریکہ نے روس، چین پر ایٹمی حملہ کی جسارت نہیں کی کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ ان ملکوں کے پاس بھی ایٹم بم ہے۔ اس لیے آج کل مسلمانوں کو اپنی بقا کے لئے اور دنیا میں عزت و آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم حاصل کرنا ضروری بلکہ اہم اور مقدم فرض ہے۔ [2]

سعیدی صاحب کی بحث سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جدید علوم کا حصول نہ صرف ملک کی ترقی بلکہ اس کی سلامتی کے لیے بھی انتہائی ضروری اور اہم ترین فرض ہے۔ اگر ہم عراق،

---

[1] ۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابو داود، کتاب الجہاد، باب فی الرمی، رقم الحدیث: ۲۵۱۳

[2] ۔ سعیدی، علامہ غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، ج ۴، ص ۶۶۵-۶۶۴

شام، لیبیا، فلسطین اور دیگر اسلامی ممالک کا جائزہ لیں جو آج دشمن کے تسلط میں ہیں، تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ جدید علوم اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ گئے۔ ان کے پاس ایسے جدید ہتھیار اور وسائل موجود نہیں تھے جو دشمن کا مؤثر مقابلہ کر سکتے۔

حالات اس حد تک خراب ہو چکے ہیں کہ ان ممالک کے لوگ اپنے ہی وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ عبادات کی ادائیگی اپنی جگہ، لیکن ان کے لیے اپنے وطن میں جان و مال کی حفاظت بھی ممکن نہیں رہی۔ وہ ممالک، جن کی طرف ہجرت کو ہمارے قدیم فقہاء نے ناجائز قرار دیا تھا، آج ان ہی کی طرف ہجرت کرنے اور وہاں پناہ لینے پر مجبور ہیں۔

مختصر یہ کہ موجودہ دورِ سائنس اور ٹیکنالوجی میں عصری تعلیم سے دوری نے مسلمانوں کو ہر میدان میں دوسروں کا محتاج بنا دیا ہے۔ اس صورت حال سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جدید علوم کو اپنائیں اور ان شعبوں میں مہارت حاصل کریں جو ہمارے دین، وطن اور قوم کی بقا کے لیے ناگزیر ہیں۔

جان و مال اور اولاد کی حفاظت یا علاج کے لئے غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت:

جب کسی شخص کو اپنے ملک میں جان کا خطرہ ہو، یہ اندیشہ ہو کہ وہ قتل کر دیا جائے گا، یا اپنی زندگی کا تحفظ ممکن نہ ہو، اور وہ وہاں رہ کر اپنا دفاع بھی نہ کر سکے اور نہ ہی اسے ملک میں کوئی محفوظ پناہ گاہ میسر ہو، تو ایسے حالات میں اس کے لیے ہجرت کرنا اور کسی پر امن مقام کی طرف جانا جائز ہے۔

یہ اجازت شریعت کے اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا کی بقا اور معاشرتی نظام کے تحفظ کے لیے پانچ بنیادی امور کو کلیدی حیثیت حاصل ہے:۔

۱: دین، ۲: جان، ۳: عقل، ۴: نسب، ۵: مال۔

باقی چیزیں انہیں پانچ امور سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ ہیں۔

جان بچانے کے لئے کلمہ کفر کہنا:

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نفس مسلم کی بہت زیادہ قدر و قیمت ہے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی حالات ایسے بن جائیں کہ ایک مسلمان کو خطرہ ہو کہ اگر میں نے یہاں پر اسلام کو ظاہر کیا تو مجھے مار دیا جائے تو اس کو اختیار ہے کہ کلمہ کفر کہہ دے۔ بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَلٰكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ‌ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ﴾[1]

(جو ایمان لا کر اللہ کا منکر ہوا سوا اس کے جو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو ہاں وہ جو دل کھول کر کافر ہو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا عذاب ہے ۔)

علامہ غلام رسول سعیدی، علامہ واحدی کی اسباب نزول القرآن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت عمار بن یاسر کے بارے نازل ہوئی۔ مشرکوں نے آپ کو پکڑ لیا اور آپکے والد اور والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا کو پکڑ لیا انہیں بہت ستایا اور انہیں اذیتیں پہنچائی۔ حضرت سمیہ کو اونٹوں کے درمیان باندھ دیا گیا اور ان کی شرمگاہ میں نیزہ مارا گیا اور انہیں کہا گیا بے شک تو نے ان مردوں کی وجہ سے اسلام قبول کیا ہے پھر انہیں شہید کر دیا گیا اور ان کے خاوند حضرت یاسر کو بھی شہید کر دیا یہ دونوں اسلام میں پہلے مقتول ہیں اور رہے۔ حضرت عمار نے تو اپنی زبان سے ان کے سامنے وہ کہہ دیا جو انہوں نے ارادہ کیا پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کو بیان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ آپ نے اپنے دل کو کیسے پایا؟ تو انہوں نے عرض کی وہ بالا یمان مطمئن ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر وہ دوبارہ اس طرح کریں تو تم دوبارہ کہہ دو۔

---

[1] سورۃ النحل ١٦:١٠٦

اس سے معلوم ہوا کہ بندہ مجبوری کی حالت میں ہو یا اس کی جان کو خطرہ ہو تو کلمہ کفریہ کہہ سکتا ہے۔ تو جب جان بچانے کے لئے کلمہ کفریہ کہنا جائز ہے تو پھر جان بچانے کے لئے غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت کرنا کیوں جائز نہیں؟

مسلمانوں کا حبشہ کی طرف ہجرت و قیام:

نبوت کے پانچویں سال جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ کفار کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و ستم دن بدن بڑھتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا مکہ میں رہنا مشکل ہو گیا ہے تو آپ نے اپنے صحابہ سے فرمایا:

﴿لو خرجتم الی ارض الحبشه فان بها ملکا لا یظلم عنده احد و هی ارض صدق حتی یجعل الله لکم فرجا مما انتم فیه فخرج عند ذلك المسلمون من اصحاب رسول الله ﷺ ارض الحبشه مخا لفة الفتنة و فرارا الی الله[1]﴾

یعنی اگر تم حبشہ کی زمین کی طرف ہجرت کرو (تو تمہارے لیے بہتر ہو گا) کیونکہ اس کے بادشاہ کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا وہ سچ کی زمین ہے اللہ تعالیٰ تمہیں مصیبتوں سے نجات دلا دے گا۔ جن میں تم مبتلا ہو پس فتنوں سے بچنا اور اللہ کے لئے اپنے دین کو بچانے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی یہ اسلام میں سب سے پہلی ہجرت تھی۔

ابن ہشام نے جو ہجرت حبشہ کی وجہ ذکر فرمائی ہے "مخالفۃ الفتنۃ" یہ لفظ کئی امور کو شامل ہے۔ یعنی اگر کسی ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ آدمی کو اپنی جان، مال، اولاد یا بلا وجہ کی قید کا خطرہ ہو تو ایسے حالات میں اس ملک سے پر امن ملک کی طرف ہجرت کرنا جائز ہے اس کو فقہاء کی اصطلاح میں دار الخوف سے دار الامن کی طرف ہجرت کرنا کہتے ہیں۔

---

[1] ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک بن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج ۱، ص ۳۲۱

انسان کی قدر و قیمت اسلام کی نظر میں:

کئی ایسی حرام چیزیں ہیں جن کے ارتکاب پر اگر کسی مسلمان کو مجبور کر دیا جائے، اور اسے غالب گمان ہو کہ اگر اس نے ان حرام چیزوں کو نہیں کیا تو اس کی جان چلی جائے گی یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، تو ایسی صورت میں ان چیزوں کا کرنا جائز ہے۔

1: اگر کسی مسلمان کو شراب پینے، خون پینے، مردار کا گوشت کھانے، یا سور کا گوشت کھانے پر مجبور کیا جائے اور اسے دھمکی دی جائے کہ اگر وہ ان حرام کاموں کو نہیں کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا یا اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، تو اپنی جان بچانے کے لیے ان کاموں کا کرنا اس کے لیے فرض ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ صبر کرتے ہوئے ان کاموں کو نہ کرے اور اس کے نتیجے میں مر جائے تو وہ گناہ گار ہو گا۔

2: اسی طرح اگر کسی کو کفر پر مجبور کیا جائے اور کہا جائے کہ اگر وہ کفر کا اظہار نہیں کرے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا، تو جان بچانے کے لیے زبان سے کلمہ کفر کہنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔[1]

ان مثالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں جان کی حفاظت کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ حکم یہ ہے کہ اگر جان بچانے کے لیے کوئی اور چارہ نہ ہو، تو حرام چیزیں کھانے کی اجازت ہے تاکہ زندگی محفوظ رہے۔ لہٰذا، جب حرام چیزیں کھانا جان بچانے کے لیے جائز ہو سکتا ہے، تو غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت کر کے جان اور پناہ حاصل کرنا کیوں جائز نہ ہو گا۔

انسان کو بچانے کے لئے نماز توڑنا جائز ہے:

ایک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اگر ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہو اور وہ دیکھے کہ ایک نابینا راستے پر جا رہا ہے آگے کنواں ہے اور وہ نابینا اس کنویں میں گر جائے گا۔ اس طرح اس کی موت واقع ہو جائے گی تو حکم یہ ہے کہ نماز توڑ دے اور اس کی جان بچالے۔ اسی طرح اگر لیڈی ڈاکٹر

---

[1]۔ اعظمی، امجد علی اعظمی، بہار شریعت، ج ۱۵، ص ۱۲۰

نماز میں مشغول ہو اور وہ سمجھے کہ اگر میں نماز مکمل کرونگی تو پیدا ہونے والے بچے کی جان چلی جائے گی تو اس کے لئے بھی حکم یہی ہے کہ نماز توڑ دے اور بچے کی جان بچالے۔
نور الایضاح مع مراقی الفلاح میں ہے:

> "نماز توڑنا جائز ہے جب خوف ہو نابینا یا اس کے مثل کا کنویں میں گرنے کا یا نماز میں چھت سے گرنے کا اور جب گرنے کا گمان غالب ہو تو نماز توڑنا واجب ہے اگرچہ فرض نماز کیوں نہ ہو جیسا کہ دایہ جب بچے کے مرنے کا خوف کرے۔"[1]

بعض جدید مفکرین کے نزدیک دار الاسلام اور دار الکفر کی اصطلاحات مرور زمانہ کے ساتھ دم توڑ چکی ہیں۔ اب ساری دنیا دار الدعوۃ ہے۔ لہذا فریضہ دعوت کی انجام دہی کے لئے عصرِ حاضر میں کوئی مسلمان مبلغ دنیا کے کسی خطے میں فروکش ہو جائے تو اس کے لئے نا صرف جائز بلکہ باعثِ اجر و ثواب ہے۔

فریضہ دعوت کی انجام دہی کے لئے دار الکفر میں قیام جائز ہے:

مفکرِ عرب ڈاکٹر سعید رمضان البوطی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان کے لئے دار الکفر یا دار الحرب میں اپنے دین پر علانیہ عمل ممکن نہ ہو تو وہاں اس کے لئے ٹھہرنا جائز نہیں، اور اگر دین پر علانیہ عمل ممکن ہو تو بھی وہاں ٹھہرنا مکروہ ہے۔ واضح ہو کہ اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ دار الکفر میں اس کا ٹھہرنا وہاں دعوتِ اسلامی کا فریضہ انجام دینے کی غرض سے ہو۔ یہ جہاد کی ایک قسم ہے جس کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر بطور فرض کفایہ عائد ہوتی ہے۔ یعنی اگر بعض مسلمان اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دے دیں تو بقیہ مسلمانوں سے یہ ساقط ہو جائے گی اور اگر کوئی اسے انجام نہ دے تو سب لوگوں پر اس کا گناہ ہو گا۔[2]

---

[1] ۔نور الایضاح مع مراقیالفلاح، حسن بن عمار، مکتبہ المدینہ ، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۱

[2] البوطی، ڈاکٹر محمد سعید رمضان، فقہ السیرۃ النبویۃ، مترجم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، نشریات، اردو بازار، لاہور، ص ۳۴۵ .

باب سوم

مسلم اقلیات کے معاشرتی مسائل اور ان کا حل

فصل اول: عبادات کی ادائیگی سے متعلق معاشرتی مسائل اور ان کا حل

فصل دوم: نکاح وطلاق سے متعلق معاشرتی مسائل اور ان کا حل

فصل سوم: تہذیب وثقافت سے متعلق معاشرتی مسائل اور ان کا حل

فصل اول:

عبادات کی ادائیگی سے متعلق معاشرتی مسائل اور ان کا حل

غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیات کو درپیش پانی کا مسئلہ:

مسلم ممالک میں مسلمانوں کو عبادات کے حوالے سے جن مسائل کا سامنا ہوتا ہے ان میں سے ایک مسئلہ پانی کا بھی ہے۔ دین اسلام میں پانچ وقت کی نماز ہر مسلمان پر فرض ہے اور وضو نماز کے لیے شرط ہے جبکہ وضو کے لئے پانی شرط ہے گویا کہ پانی کا وجود نماز کے لئے ضروری ہے۔ غیر مسلم ممالک میں سے بعض ممالک جیسے برطانیہ وغیرہ ایسے بھی ہیں جہاں زمین سے پانی نکالنے پر پابندی ہے۔ ایسے اور اس کے علاوہ ممالک میں گندے پانی کو فلٹر اور مشینوں کے ذریعے قابل استعمال بنایا جاتا ہے۔ ایسا پانی فلٹر ہونے کے بعد بالکل صاف و شفاف نظر آتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا پانی وضو کے لئے، کھانے پینے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر اس ایسے پانی کے ساتھ کوئی شخص وضو کر کے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ہو گی یا نہیں؟ اس پانی کا حکم بیان کرنے سے پہلے بطور تمہید دو باتیں عرض کرتے ہیں۔ تمہید اول: حسن بن عمار علی مصری لکھتے ہیں:

﴿المياه على خمسة أقسام: طاهر مطهر غير مكروه، وهو الماء المطلق، وطاهر مطهر مكروه، وهو ما شربت منه الهرة ونحوها وكان قليلاً، وطاهر غير مطهر، وهو الماء الذى استعمل فى رفع حدث، وماء نجس، وهو الذى حلت فيه نجاسة وكان راكداً قليلاً، والقليل ما دون عشر فى عشر، فإن لم يظهر أثرها فيه، أو كان جارياً ولم يظهر أثرها، والأثر يكون فى الطعم أو اللون أو الريح، وماء مشكوك فى طهوريته، وهو ما شرب منه الحمار أو البغل[1]﴾

---

[1] ۔الشرنبلالی، حسن بن عمار بن علی، نورُ الایضاح، المدینہ العلمیہ کراچی، الطبعۃ الاولی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۷-۳۱

”پانی کی پانچ قسمیں ہیں:۱:خود پاک ہو،پاک کرنے والا ہو۔اسکا استعمال مکروہ نہ ہو، وہ مطلق پانی ہے۔۲:خود پاک ہو، دوسرے کو پاک کرنے والا ہو،(لیکن اس کا استعمال) مکروہ ہو۔یہ وہ پانی ہے کہ اس میں سے بلی نے پی لیا ہو یا اس جیسے دوسرے جانور نے اس حال میں کہ وہ تھوڑا ہو۔۳:وہ پانی جو خود پاک ہو دوسرے کو پاک کرنے والا نہ ہو۔یہ وہ پانی ہے جس کو حدث دور کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہو۔۴: چوتھی قسم ناپاک پانی ہے۔یہ وہ پانی ہے کہ اگر جائے اس میں ناپاکی اور وہ ٹھہرا ہوا تھوڑا ہو تھوڑا وہ پانی ہے جو دہ در دہ(سو ہاتھ / پچیس گز / دو سو پچیس فٹ) سے کم ہو لہذا یہ ناپاک ہو جائے گا اگرچہ ناپاکی کا اثر اس میں ظاہر نہ ہوا ہو یا پانی تو جاری ہو مگر ناپاکی کا اثر اس میں ظاہر ہو گیا ہو اور اثر؛مزہ، رنگ اور بو ہے۔۵:وہ پانی کہ جس کے مطہر ہونے میں شک کیا گیا ہو۔یہ وہ پانی ہے کہ اس میں سے گدھے یا خچر نے پیا ہو۔“

مذکورہ بحث سے معلوم ہو یا کہ اگر پانی دہ در دہ سے کم ہو اور اس میں نجاست گر جائے مثلا ٹینکی یا بالٹی یا لوٹے میں پیشاب یا خون کا ایک قطرہ گر جائے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔اگرچہ نجاست کا اثر اس میں ظاہر نہ ہو۔اگر پانی زیادہ ہو اور اس میں نجاست گر جائے تو پانی ناپاک تب ہو گا جب ناپاکی کا اثر بو، رنگ، ذائقہ اس میں ظاہر ہو جائے۔لہذا گٹر کا پانی نجس ہو گا کیونکہ نہ تو اس کا ذائقہ پانی کا ہوتا ہے نہ رنگ اور نہ ہی اس کی بو صاف پانی کے مثل ہوتی ہے۔تمہید ثانی:اگر کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کر دیا جائے یا اسے ایک وصف سے دوسرے وصف میں ڈھال دیا جائے تو وہ شے پاک ہو جاتی ہے۔

استحالہ کا لغوی معنیٰ:

﴿الاستحالة لغة تغير الشيء من حال الى حال و من وصف الى وصف كما تطلق ايضا على عدم الامكان۔[1]﴾

"استحالہ کا لغوی معنیٰ ہے شئ کا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف اور ایک وصف سے دوسرے وصف کی طرف منتقل ہونا۔ اسی طرح استحالہ کا اطلاق اس چیز پر بھی کیا جاتا ہے جو ممکن نہ ہو۔"

استحالہ کا اصطلاحی معنیٰ:

﴿هي تغيّر العين النجسة وانقلاب حقيقتها إلى حقيقة أخرى، كانقلاب الخمر خلاً، والنحنز إلى ملح، والسرجين إلى رماد[2]﴾

"استحالہ کا اصطلاحی معنیٰ ہے نجس العین کا تبدیل ہو جانا اور ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف نکل جانا جیسا کہ شراب کا سرکہ ہو جانا، گندگی کا نمک ہو جانا اور گوبر کا راکھ ہو جانا۔"

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے استحالہ کی جو تعریف کی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی ناپاک چیز اپنی ماہیت بدل لے یا اس کے وصف میں تبدیلی واقع ہو، تو فقہاء کے نزدیک اس پر استحالہ کا اطلاق ہو گا۔ ماہیت بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ شراب سرکہ بن جائے یا گوبر راکھ میں تبدیل ہو جائے، اور اسی کو استحالہ کہا جاتا ہے۔

اگر وصف میں تبدیلی ہو، تو اس کی مثال یہ ہے کہ مستعمل پانی (استعمال شدہ پانی) جب بالٹی میں ایک لوٹے کی مقدار ہو، تو وہ طہارت کا فائدہ نہیں دیتا۔ لیکن جب اس میں دو لوٹے صاف پانی مزید ڈال دیا جائے، تو اس کی صفت بدل جاتی ہے، اور اب وہ طہارت کا فائدہ دینے

---

[1] ۔ فیوسی، احمد بن محمد المصباح المنیر، المکتبۃ العلمیہ، بیروت، ج ا، ص ۱۵۷

[2] ۔ شامی، محمد امین بن عمر، رد المختار علی الدر المختار، دار عالم الکتب الریاض ۲۰۰۳ء، ج ا، ص ۵۳۴

کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک وصف سے دوسرے وصف کی طرف تبدیلی کی مثال ہے، اور فقہاء کے نزدیک اسے بھی استحالہ کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، بعض غیر مسلم ممالک میں جو گٹر کے گندے پانی کو فلٹر اور مشینوں کے ذریعے صاف کیا جاتا ہے، اس پر بھی استحالہ کا اطلاق ہو گا۔

اب نفسِ مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ گٹر کے آلودہ اور ناپاک پانی کو اگر مشینوں کے ذریعے اس طرح پاک کیا جائے کہ نجاست کا رنگ، ذائقہ، اور بو ختم ہو جائیں، تو کیا وہ پاک ہو جائے گا یا نہیں؟ اس مسئلے پر علماء کے دو قول ہیں، جنہیں ہم دلائل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

پہلا قول: ناپاک چیز کا استحالہ کے ساتھ پاک ہونا

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ[1]﴾

اور ستھری چیزیں ان کے لیے حلال فرمائے گا اور گندی چیزیں اُن پر حرام کرے گا۔

درج بالا آیت سے معلوم ہوا کہ پاکیزہ چیزیں حلال ہیں۔ ان کا استعمال جائز ہے لہذا ناپاک پانی جب مشینوں کے ذریعے پاک کیا جائے اور کیمیکل کے ذریعے اس کی گندگی اور نجاست کا رنگ، ذائقہ، اور بو ختم کر دی جائے تو وہ بھی پاک ہو گا اور وضو کے لیے اس کا استعمال جائز ہو گا۔ اگر احادیث مبارکہ پر نظر ڈالی جائے تو یہی چیز سامنے آتی ہے کہ جو چیز ناپاک ہو جب اسکی حقیقت بدل جائے اور وہ ناپاک سے پاک ہو جائے تو اس کا استعمال جائز ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: نعم الادام الخل[2] "سرکہ بہترین سالن ہے۔"

---

[1]۔ سورۃ اعراف ۷:۱۵۷

[2]۔ مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، تحقیق محمد فواد عبد الباقی، دار احیاء التراث، بیروت، کتاب الاشربۃ، باب فضیلۃ الخل، رقم الحدیث ۲۰۵۲:

علامہ برہان الدین المرغینانی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"شراب کو جب سرکہ بنا دیا جائے تو وہ حلال ہے کیونکہ سرکہ بن جانے کی وجہ سے اس کا جو وصف مفسد تھا (نشہ دینا) وہ ختم ہو گیا۔ اب نقصان کی بجائے یہ فائدہ دے گا۔ لہذا یہ اس طرح ہو جائے گا جیسا کہ کھال کو دباغت کے ساتھ صاف کیا جائے۔ جس طرح کھال سے گندگی دور کی جائے اور اس کو نمک وغیرہ لگا کر دھوپ میں خشک کر دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شراب بھی سرکہ بن جانے کے ساتھ پاک ہو جائے گی۔"[1]

قیاس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جب نجس پانی کو صاف کیا جائے تو وہ پاک ہو کیونکہ اس کی ماہیت اور حقیقت بدل گئی اور ہر چیز جس کی ماہیت اور حقیقت بدل جائے اس کے لیے حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے جیسے شراب جب سرکہ بن جائے۔ صفت بدل گئی حکم بھی بدلے گا کہ شراب حرام، سرکہ حلال۔ گندگی کھانے والی مرغی کا گوشت اور انڈا کھایا جائے تو جائز ہے کیونکہ گندگی جب گوشت اور انڈے کی صورت میں بدل گئی، حکم بھی بدل جائے گا۔ اسی طرح باغ کو جب گندے پانی کے ساتھ سیراب کیا جائے تو پانی تو ناپاک تھا مگر وہی پانی جو مختلف مراحل سے گزر کر پھلوں میں تبدیل ہو گیا وہ پاک ہے۔ ابن تیمیہ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اسی طرح گوبر ناپاک ہے لیکن جب اس کو جلا دیا جائے اور وہ راکھ بن جائے تو وہ راکھ پاک ہے۔"[2]

درج بالا بحث سے معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جس کی حقیقت بدل جائے، یا اس کے اوصاف بدل جائیں تو حکم بھی بدل جائے گا جیسے: گوبر ناپاک ہے جب جلا کر راکھ کر دیا جائے تو

---

[1] ۔ برھان الدین ابو الحسن علی بن ابو بکر انو غانی المرغینانی الھدایۃ، مکتبہ رحمانیہ در دو بازار لاہور، ج ۴، ص ۱۱۵

[2] ۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ المصحف الشریف، المدینۃ المنورہ ۲۰۰۴ء، ج ۲۱، ص ۶۰۱

پاک۔ گندگی ناپاک ہے جب یہ مرغی کے پیٹ میں چلی جائے گوشت اور انڈے میں بدل جائے تو پاک۔ شراب ناپاک ہے جب اس کی حقیقت بدل جائے اور سرکہ بن جائے تو پاک۔ نجس اور گندا پانی ناپاک ہے جب اس کے ساتھ کھیت اور باغوں کو سیراب کیا جائے تو اس کی وجہ سے جو فصل پودے پیدا ہونگے وہ پاک۔

اسی طرح جو پانی ناپاک ہو۔ جب اس کو ادویات اور کیمیکل کے ذریعے پاک کیا جائے اور اس پانی سے نجاست کا رنگ، ذائقہ اور بو کو دور کیا جائے تو وہ پانی بھی پاک ہو گا۔ اس سے وضو کرنا جائز ہو گا نہ صرف وضو بلکہ وہ قابل استعمال ہو گا اور وہ صاف شفاف پانی کے حکم میں ہو گا۔ مواہب الجلیل میں ہے:

﴿وقد سُئل مالك رحمه الله عن جباب تحفر فستقط فيها الميتة فتغير لونه وريحه ثم يطيب الماء بعد ذلك؟ فاجاب انه لاباس به[1]﴾

"امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اگر بڑا کنواں کھودا جائے پھر اس میں کوئی چیز گر کر مر جائے، اس کا رنگ اور بو بھی تبدیل ہو جائے پھر اس پانی کو پاک کر دیا جائے (تو کیا حکم ہے) آپ نے جواب دیا کوئی حرج نہیں"۔

ناپاک چیز کا استحالہ کے ساتھ پاک نہ ہونا:

بعض علماء کا قول ہے کہ ناپاک پانی کو اگر پاک کر دیا جائے گا پھر بھی وہ پانی پاک نہیں ہو گا۔ امام ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

﴿السرجين والعذرة تحترق فتصير رمادا تطهر عنده خلافا لابی یوسف[2]﴾

"گوبر اور پاخانہ کو جب جلا دیا جائے اور راکھ بن جائے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وہ پاک ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک ناپاک ہے۔

---

[1]۔ خطاب، ابو عبد اللہ محمد بن محمد المغربی، مواھب الجلیل، دار عالم الکتب، بیروت، ج۱، ص ۱۱۹

[2]۔ کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف ابن الھمام شرح فتح القدیر دار افکر بیروت لبنان، ج۱، ص ۲۰۰

"ابن قدامۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ظاهر المذهب أنه لا يطهر شيء من النجاسات بالاستحالة إلا الخمرة إذا انقلبت بنفسها خلاً، وما عداها لا يطهر، كالنجاسات إذا احترقت وصارت رماداً، والخنزير إذا وقع في الملاحة وصار ملحاً، والدخان المتصاعد من وقود النجاسة، والبخار المتكاثف من الماء النجس، فإذا اجتمعت منه نداوة على جسم صقيل ثم تقطّر، فهو نجس[1]﴾

"ظاہر مذہب یہ ہے کہ شراب کے علاوہ کوئی بھی نجس چیز استحالہ کے ذریعے پاک نہیں ہوتی۔ شراب بھی صرف اس وقت استحالہ کے ذریعے پاک ہو گی جب وہ خود بخود سرکہ بن جائے۔ شراب کے علاوہ دیگر نجس چیزیں، مثلاً اگر وہ جل کر راکھ بن جائیں، یا خنزیر نمک میں گر کر نمک بن جائے، یا نجس لکڑیوں سے اٹھنے والا دھواں، اور ناپاک پانی سے اٹھنے والا بخار جو کسی جگہ جم کر قطرے بن کر ٹپکنا شروع کر دے، یہ سب چیزیں نجس ہی رہتی ہیں۔"

ابن قدامۃ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ حنابلہ علماء کا مذہب یہ ہے کہ شراب کے علاوہ کسی بھی ناپاک چیز کی اگر حقیقت اور ماہیت بدل جائے تو وہ ناپاک ہی رہے گی۔ جیسا کہ گوبر راکھ بن جائے تو وہ راکھ ناپاک ہی ہو گی۔ ناپاک پانی سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ جب جمع ہو جائیں پھر اس سے پانی ٹپکے تو وہ پانی بھی نجس ہی ہو گا۔

ان دو اقوال میں راجح پہلا قول معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم ماقبل ذکر کر چکے کہ جاری پانی اس وقت ناپاک ہو گا جب اس میں نجس چیز رنگ، ذائقہ یا بو محسوس ہو اور اگر یہ چیزیں محسوس نہ ہوں تو صرف نجاست گرنے سے ناپاک نہیں ہو گا۔ لہذا اس پانی سے جب نجاست کا اثر بالکل زائل کر دیا جائے تو پاک ہونا چاہیے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر صاف پانی موجود ہو تو اسی پاک، صاف پانی سے وضو اور غسل کیا جائے۔

---

[1]۔ ابن قدامۃ، عبد اللہ بن احمد قدامۃ المقدسی، المغنی، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۹۹۷ء، ج ۱، ص ۹۷

بلغاریہ اور قطبین میں اوقاتِ نماز:

نماز دین اسلام کا دوسرا اہم رکن ہے۔ ہر مسلمان، مرد و عورت، عاقل، بالغ پر دن اور رات میں پانچ نمازیں، وقتِ مقررہ پر فرض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا[1]﴾

(بے شک نماز مسلمانوں پر مقررہ وقت میں فرض ہے۔)

اس طرح نماز کو قضاء کرنا اور وقت سے موخر کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ[2]﴾

(توان نمازیوں کی خرابی ہے جو اپنی نماز سے بھولے بیٹھے ہیں۔)

اوقاتِ نماز پانچ ہیں۔ ان اوقات کا تعلق سورج کے طلوع اور غروب کے ساتھ ہے۔ طلوعِ شمس سے پہلے فجر کی نماز، زوال کے بعد ظہر کی نماز، سورج ڈھل جانے کے بعد عصر کی نماز، غروب آفتاب کے بعد مغرب اور روشنی کے آثار بالکل مٹ جانے کے بعد عشاء کی نماز۔[3]

قطبین میں نماز اور روزے کے مسائل واحکام:

جن علاقوں میں سورج معمول کے مطابق طلوع اور غروب ہوتا ہے اور پانچوں وقت پائے جاتے ہیں، ان لوگوں پر تو پانچ نمازیں فرض ہوں گی۔ لیکن جن علاقوں میں مذکورہ پانچ اوقات موجود نہیں ہوتے، ان کے لیے کیا حکم ہوگا؟ کیا ان پر بھی پانچ نمازیں فرض ہوں گی یا صرف وہی نمازیں فرض ہوں گی جن کے اوقات پائے جاتے ہیں؟

مثال کے طور پر بلغاریہ کا ایک علاقہ، جہاں سال کے بعض ایام میں عشاء کا وقت ظاہر نہیں ہوتا۔ غروبِ شمس کے بعد شفق کے غائب ہونے سے پہلے ہی فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

---

[1]۔ سورۃ النساء ۴:۱۰۳

[2]۔ سورۃ الماعون ۵:۱۰۷۔۴

[3]۔ ملا نظام الدین، الفتاویٰ الھندیہ، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ج ۱، ص ۵۷

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں پر عشاء کی نماز فرض ہو گی؟ یا وقت نہ پائے جانے کی وجہ سے یہ ساقط ہو جائے گی؟ یا انہیں عشاء کی قضا کرنی ہو گی؟

اسی طرح قطبین کے علاقے، جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے، وہاں کے لوگ دن اور رات میں کتنی نمازیں پڑھیں گے؟

اس مسئلے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، جنہیں ہم ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

القول الاول:

وہ علاقے جن میں نمازوں کا وقت نہیں آتا یا چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے۔ ان پر بھی پانچ نمازیں فرض ہیں۔ دلیل حدیث مبارکہ ہے:

﴿قلنا :یا رسول الله! وما لبثه فی الأرض؟ قال أربعون یوماً،یوم کسنة،ویوم کشهر،ویوم کجمعة،وسائر أیامه کأیامکم قلنا: یا رسول الله! فذلك الیوم الذی کسنة،أتکفینا فیه صلاة یوم قال لا،اقدروا له قدره﴾[1]

"ہم نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! دجال زمین میں کب تک رہے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: چالیس دن تک۔ ایک دن ایک سال کے برابر ہو گا۔ ایک دن ایک ماہ کے برابر اور ایک دن ایک ہفتے کے برابر اور باقی ایام تمہارے عام دنوں کی طرح ہونگے۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ جو دن ایک سال کی طرح ہو گا کیا اس میں ہمیں ایک دن کی نماز پڑھنا کافی ہو گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں تم اس کے لئے ایک سال کی نمازوں کا اندازہ کر لینا۔"

اس حدیث پاک کے مطابق خروج دجال کے زمانہ میں جب ایک دن ایک سال کا ہو گا۔ اس میں حضور اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ پانچ نمازیں ہی کافی ہیں بلکہ فرمایا کہ اندازہ کر کے

---

[1] ۔ مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب في ذکر الدجال، رقم الحدیث:۲۹۳۷

نمازیں پڑھنا۔ معلوم ہوا کہ جن مقامات پر چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے ان پر بھی پانچ نمازیں فرض ہیں اور اندازے سے مقرر کر کے پڑھی جائیں گی۔ اب حدیث پاک میں جو لفظ ہیں "فاقدروالہ قدرہ "اس کا مطلب ہے اور اندازے کے ساتھ اوقات کیسے مقرر کیے جائینگے۔ اس کے علماء نے مختلف مطالب بیان کیے ہیں۔

المطلب الاول:

اس کا مطلب یہ ہے کہ بلغاریہ اور قطبین جیسے علاقوں میں، قریبی ملک کے اوقات کے اعتبار سے اپنی نمازوں کا وقت مقرر کیا جائے گا۔ ان علاقوں کے قریب جس ملک میں چوبیس گھنٹے کے بعد سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے، اس ملک کے اوقات کے مطابق نماز کے اوقات مقرر کیے جائیں گے اور اسی ملک کے حساب سے روزے رکھے جائیں گے۔

اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں کہ اگر فی الواقع قطبین کے افق پر چوبیس گھنٹے کے بعد سورج اور چاند کا طلوع اور غروب ہوتا ہے، اور وقت کی باقی علامات افق پر ظاہر ہوتی ہیں جن سے ظہر اور عصر کا تعین کیا جا سکتا ہے، تو وہاں چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازیں فرض ہیں، رمضان کے روزے بھی فرض ہیں اور لیلۃ القدر بھی متحقق ہو گی۔ اگر وہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے، اور سورج اور چاند کا طلوع اور غروب چھ ماہ کے بعد ہوتا ہے، تو وہاں کے رہائشیوں پر نہ تو پانچ نمازیں فرض ہوں گی اور نہ رمضان کے روزے، اور نہ وہاں شب قدر کا وجود ہو گا کیونکہ یہ تمام چیزیں سورج کے طلوع اور غروب پر موقوف ہیں۔ البتہ نماز اور روزے میں عبادت کی مشابہت اختیار کرنی چاہیے اور قطبین کے قریب جس ملک میں چوبیس گھنٹے کے بعد سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے، اس کے اوقات کے مطابق نماز کے اوقات مقرر کیے جائیں اور اسی ملک کے حساب سے روزے رکھے جائیں اور شب قدر کو بھی اس ملک کے حساب سے منایا جائے۔ یعنی جب اس قریبی ملک میں رمضان ہو، تو وہاں بھی رمضان کا اعتبار کیا جائے اور اسی ملک کے اوقات کے لحاظ

سے سحر و افطار کا تعین کیا جائے لیکن یہ تشبہ فی العبادات ہے اور عبودیت اور بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم نے بعینہ نماز کے اوقات اور رمضان کا مہینہ نہیں پایا، لیکن اس کے مشابہ اوقات میں ہم ان عبادات کو کر رہے ہیں۔ آخر کار وہاں دنیا کے دوسرے تمام کاموں کے اوقات مقرر کیے جاتے ہیں: کاروبار، سیر و تفریح، کھانے پینے اور سونے جاگنے کے اوقات معین کیے جاتے ہیں۔ صبح سے شام تک کام کرنے والے لوگ وہاں چھ ماہ کے دن میں مسلسل کام کرتے ہیں، نہ کہ چھ ماہ سوتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا اور زندگی کے باقی معمولات کو وہاں کے غیر معمولی حالات اور اوقات میں معین کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عبادات کے نظام کو بھی قریب ترین ملک کے اوقات کے لحاظ سے ترتیب دینا چاہیے، جہاں معمول کے مطابق طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ لہذا وہاں کے رہنے والوں پر پانچ نمازیں اور سال کے بعد روزے فرض عین تو نہیں، لیکن فرض کے مشابہ ضرور ہیں۔ لہذا وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کو یہ عبادات کسی حال میں ترک نہیں کرنی چاہییں۔"[1]

سعیدی صاحب کی اس بحث سے معلوم ہوا کہ ان علاقوں کے لوگ جس طرح باقی معاملات جیسے سونے جاگنے، سیر و تفریح اور معمولات زندگی کے اوقات کو معین کرتے ہیں، اسی طرح قریبی ملک کے اعتبار سے نمازوں کے اوقات بھی معین کر سکتے ہیں اور ان کے حساب سے نمازیں ادا کر سکتے ہیں۔ علمائے شافعیہ سے جب پوچھا گیا کہ بلغاریہ کے لوگ نماز کیسے پڑھیں گے، کیونکہ ان علاقوں میں سورج تھوڑی دیر کے لیے غروب ہوتا ہے پھر طلوع ہو جاتا ہے، تو جواب دیا گیا:

﴿یعتبر صومھم و صلاتھم باقرب البلاد الیھم﴾[2]

"ان کے روزوں اور نمازوں کا اندازہ قریبی شہروں کے اعتبار سے لگایا جائے گا۔"

---

[1] ۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، فرید بک سٹال، لاہور، ج ۲، ص ۸۵ے

[2] ۔ البجیرمی، سلیمان بن محمد، حاشیۃ البجیرمی علی الخطیب، دار الکتب العلمیہ، بیروت، الطبعۃ الاولی ۱۹۹۶، ج ۲، ص ۲۴

شیخ الاسلام زکریا انصاری فرماتے ہیں:

﴿ومن لا عشاء لهم بأن يكونوا في بلاد لا يغيب فيها شفقهم، يقدرون قدر ما يغيب فيه الشفق في القرى القريبة منهم[1]﴾

جن کے لیے عشاء کا وقت نہیں ہوتا، کہ وہ ایسی جگہوں پر ہیں جہاں شفق غروب نہیں ہوتی، وہ اپنے قریب ترین ملک کے مطابق شفق غروب ہونے کا وقت طے کر کے عشاء کا وقت مقرر کریں گے۔

امام نووی اور ابن حجر الہیثمی کا بھی یہی مذہب ہے۔

المطلب الثانی:

بعض علمائے حدیث جیسا کہ ملا علی قاری، دجال کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جو فرمایا کہ ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ حقیقۃً ایک سال کے برابر ہوگا بلکہ وہ دن ایک ہی دن اور رات ایک ہی رات کے برابر ہوگی لیکن دجال لوگوں کو اس طرح مسحور کر دے گا کہ انہیں سورج کے متعدد طلوع و غروب اور سورج و چاند کی ایک سالہ گردش نظر نہیں آئے گی۔ راتوں کے اندھیرے انہیں محسوس ہونگے اور نہ وہ سال کے لیل و نہار کو ایک دن خیال کریں گے۔ ملا علی قاری مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ دجال کو ایسے شبہات دے کر بھیجا جائے گا۔ اس کے ہاتھوں سے ایسی ملمع کاری بکثرت ظاہر ہوگی جس سے عقل والوں کی عقل مسلوب ہو جائے گی اور ارباب بصیرت کی آنکھیں پھٹ جائیں گی لہذا اس حدیث کی تاویل یہ ہوگی کہ وہ لوگوں کی سماعت اور بصارت کو سلب کر دیگا حتیٰ کہ ان کے دلوں میں یہ خیال ڈال دے گا کہ زمانہ ایک حالت پر قائم

---

[1] ۔ زکریا انصاری، دار الکتب العلمیہ الطبعۃ الاولی، ج۱، ص ۱۱۷

ہے۔ بغیر اندھیرے کے روشنی ہے اور بغیر شام کے صبح ہے۔لوگ گمان کرینگے کہ رات نے اپنا سائبان ان پر نہیں بچھایا اور سورج نے اپنی روشنی ان سے منقطع نہیں کی۔ وہ زمانہ کے طول سے حیران ہونگے اور لیل ونہار کے اختلاف کی نشانیاں ان سے مخفی رہیں گی۔"[1]

ملا علی قاری کی اس طویل عبارت سے واضح ہوا کہ عہدِ دجال میں ایک سال کے دن اور رات برابر آتے رہیں گے۔ لیکن دجال کی ملمع کاری کی وجہ سے لوگوں کو دن اور رات کا آنا جانا معلوم نہیں ہوسکے گا۔

المطلب الثالث:

بعض علماء جیسا کہ علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ دجال کے زمانے میں بھی حقیقۃً ایک سال کا دن ہو گا۔ البتہ حدیث خلافِ قیاس ہونے کی وجہ سے اپنے مورد میں محصور رہے گی۔ اور قطبین کے ایام کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہو گا۔علامہ شامی رقم طراز ہیں:

﴿والقياس على ما في حديث الدجال غير صحيح، لأنه لا مدخل للقياس في وضع الأسباب. ولئن سُلِّم، فإنما هو فيما لا يكون على خلاف القياس، والحديث ورد على خلاف القياس. فقد نقل الشيخ أكمل الدين في شرح المشارق عن القاضي عياض أنه قال: هذا حكمٌ مخصوصٌ بذلك الزمان شرعه لنا صاحب الشرع، ولو وُكِلْنا فيه إلى اجتهادنا لكانت الصلاة فيه على الأوقات المعروفة، واكتفينا بالصلوات الخمس﴾[2]

"حدیثِ دجال پر قیاس کرنا صحیح نہیں، کیونکہ اسباب کے مقرر کرنے میں قیاس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر قیاس کو مان بھی لیا جائے، تو وہ صرف ایسی صورت میں ہو گا جو خلافِ قیاس نہ ہو، جبکہ حدیث خلافِ قیاس وارد ہوئی

---

[1]۔ ملا علی قاری، مرقاۃ المناجیح، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ج ۱۰، ص ۱۹۵

[2]۔ شامی، محمد امین بن عمر الشہیر بابن عابدین، ردالمختار، ج ۱، ص ۳۶۷

ہے۔ شیخ اکمل الدین نے شرح المشارق میں قاضی عیاض سے نقل کیا ہے کہ یہ حکم دجال کے زمانے کے ساتھ خاص ہے، جسے شارع نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے۔ اگر ہمیں اس معاملے میں اجتہاد کا اختیار دیا جاتا، تو ہم اوقاتِ معروفہ میں نماز پڑھتے اور صرف پانچ نمازوں پر اکتفا کرتے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اوقات نماز کے بارے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ سورج کے طلوع سے پہلے فجر، نصف النہار سے زوال کے بعد ظہر، دو مثل سایہ ہونے کے بعد عصر، غروبِ آفتاب کے بعد مغرب اور شفق غائب ہونے کے بعد عشاء کی پڑھی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی قاعدہ کی تعلیم دی ہے لہذا طلوع آفتاب کے بعد اور نصف النہار سے پہلے فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء پڑھنا غیر معمول اور خلاف قیاس ہے۔"

دجال کے زمانے میں، جب ایک دن ایک سال کے برابر ہو گا، تو رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر اس دن میں ایک سال کی نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے اس دن کے لیے یہ حکم نہ دیا ہوتا، تو ہم قاعدے کے مطابق اس دن صرف ایک ہی نماز پڑھتے۔ چونکہ ایامِ دجال کے علاوہ کسی اور دن کے لیے آپ ﷺ نے ایسا حکم نہیں دیا، اس لیے باقی دنوں میں نمازیں اپنے قاعدے کے مطابق ہی ادا کی جائیں گی۔ لہذا، قطبین میں ایک دن اور ایک رات میں صرف پانچ نمازیں ہی فرض ہیں، چاہے وہ دن اور رات ایک سال کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس بنیاد پر یہ فتویٰ دینا کہ اہلِ بلغار اور قطبین پر پانچ نمازیں فرض ہیں اور وہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد اور نصف النہار سے پہلے فجر، ظہر، عصر، مغرب، اور عشاء ادا کر لیں، نہ صرف قاعدۂ شرعیہ کے خلاف ہے بلکہ قرآن کریم کی نصِ صریح، احادیثِ متواترہ، اور اجماعِ امت کے بھی خلاف ہے۔

القول الثانی:

بعض علماء کہتے ہیں کہ بلغاریہ کا وہ علاقہ جہاں غروبِ شمس کے بعد شفق غائب ہونے سے پہلے فجر ہو جاتی ہے، وہاں کے لوگوں پر چونکہ عشاء کا وقت نہیں آتا، اس لیے ان پر عشاء فرض بھی نہیں ہو گی۔ جب فرض ہی نہیں ہے تو قضاء کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا[1]﴾

(بے شک نماز مسلمانوں پر وقت باندھا ہوا فرض ہے)

عشاء کا وقت غروبِ آفتاب کے تقریباً ایک گھنٹہ اور 18 منٹ بعد اس وقت متحقق ہوتا ہے جب شفق کی سفیدی غائب ہو کر مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے۔ چونکہ اہلِ بلغاریہ نے عشاء کا وقت پایا ہی نہیں، اس لیے ان پر نہ عشاء کی نماز فرض ہے اور نہ ہی اس کی قضاء کرنے کی حاجت۔ اسی طرح قطبین کے لوگ، جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات ہوتی ہے، ان پر بھی قاعدۂ شرعیہ کے مطابق ایک دن اور ایک رات میں صرف پانچ نمازیں فرض ہیں۔ طلوعِ فجر کے بعد صبح کی نماز (فجر)، سورج کے نصف النہار سے ڈھلنے کے بعد ظہر، دو مثل سایہ ہونے کے بعد عصر، غروبِ آفتاب کے بعد مغرب، اور غروبِ شفق کے بعد عشاء فرض ہو گی، خواہ ان اوقات کے درمیان کئی ماہ کا وقفہ کیوں نہ ہو۔

القول الثالث:

بعض علماء کہتے ہیں کہ اہلِ بلغاریہ پر، اگرچہ عشاء کا وقت نہ آتا ہو، پھر بھی ان پر عشاء کی نماز فرض ہے۔ ہاں، ان کے لیے یہ تخفیف ہے کہ وہ دو نمازیں اکٹھی کر کے پڑھ لیں، مثلاً مغرب اور عشاء کو اکٹھا ادا کر لیں۔ اسی طرح اہلِ قطبین پر، جہاں پانچ نمازوں کے اوقات کافی دیر سے آتے ہیں ان کے لیے بھی یہ سہولت ہے کہ وہ دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھ لیں۔

---

[1]۔ سورۃ النساء ۴:۱۰۳

دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کا جواز حدیثِ رسول ﷺ سے ثابت ہے:

﴿عن ابن عباس قال: صلی رسول الله ﷺ الظهر والعصر جميعًا، والمغرب والعشاء جميعًا، في غير خوف ولا سفر[1]﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر سفر اور خوف کے ظہر اور عصر کو اکٹھا پڑھا اور مغرب اور عشاء کو اکٹھا پڑھا۔

مذکورہ بالا حدیثِ رسول سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے بغیر سفر اور بغیر خوف کے دو نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھا۔ لہٰذا دو نمازوں کو اکٹھا پڑھنا جائز ہے۔

﴿عن عبد الله بن شقيق قال: خطبنا عبد الله بن عباس رضي الله عنهما يومًا بعد العصر حتى غربت الشمس وبدت النجوم، وجعل الناس يقولون: الصلاة، الصلاة. قال: فجاءه رجل من بني تميم لا يفتر ولا ينثني يقول: الصلاة، الصلاة. فقال ابن عباس: أتعلمنا بالسنة؟ لا أم لك! ثم قال: رأيت رسول الله ﷺ جمع بين الظهر والعصر، والمغرب والعشاء. قال عبد الله بن شقيق: فحاك في صدري من ذلك شيء، فأتيت أبا هريرة رضي الله عنه فسألته فصدق مقالته[2]﴾

"عبد اللہ بن شقیق روایت کرتے ہیں کہ ایک دن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عصر کے بعد ہمیں خطاب دیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور ستارے ظاہر ہو گئے۔ لوگ بار بار کہنے لگے: نماز، نماز۔ پھر بنی تمیم کا ایک شخص آیا جو مسلسل اور بغیر رکے یہی کہتا رہا: نماز، نماز۔ اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا تم ہمیں سنت سکھاؤ گے؟ تمہاری ماں تمہیں کھوئے! پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ

1۔ مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب جواز الجمع بین الصلاتین فی السفر، رقم الحدیث: ۱۶۲۷

2۔ ایضاً، کتاب الصلوۃ المسافرین وقصرھا، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر، رقم الحدیث: ۱۶۳۵

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے ظہر اور عصر کو، اور مغرب اور عشاء کو جمع کیا تھا۔ عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں: یہ بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی، چنانچہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے پوچھا تو انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کی تصدیق کی۔

مذکورہ بالا حدیثِ پاک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی عذر کے بغیر بھی دو نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض علماء کا یہ استدلال کئی وجوہات کی بنا پر ضعیف ہے:

1: جو احادیث پیش کی گئیں، فقہاء کے نزدیک یہ مؤول ہیں، یعنی انہیں جمع صوری پر محمول کیا گیا ہے۔

2: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانے میں ایسے واقعات ایک یا دو مرتبہ پیش آئے ہیں۔ اگر یہ عمل بغیر کسی عذر کے جائز ہوتا تو ان سے ضرور منقول ہوتا۔[1]

خلاصۃ البحث:

ان تمام اقوال کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل بلغار و قطبین کا مسئلہ نیا ہے۔ حدیث میں یا صحابہ اور تابعین سے اس کے بارے میں کوئی امرِ صریح مذکور نہیں ہے۔ لہذا جس کو جو قول آسان لگے اس پر عمل کرے۔

راقم کے نزدیک اولیٰ اور افضل یہی ہے کہ قریبی ممالک کے حساب سے وقت متعین کیا جائے اور انہی اوقات کے اعتبار سے نماز، روزہ اور دیگر عبادات کا اہتمام کیا جائے۔

کافر کو زکوۃ دینا:

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات، انسان و حیوان کو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا[2]﴾

---

[1] ۔الخطابی، ابو سلیمان محمد بن محمد، معالم السنن، دار الحرمین، القاہرہ، الطبعۃ الاولی، ج ا، ص ۲۶۵

[2] ۔ سورۃ الھود ۱۱:۶

(اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ پر نہ ہو۔)

اور ساتھ اپنی حکمتِ بالغہ سے ایسا نہیں کیا کہ سب کو رزق میں برابر کر دیا۔ غنی و فقیر کا فرق باقی نہ رکھا۔ بلکہ کسی کو مالدار بنایا اور کسی کو غریب و فقیر بنایا تا کہ نظام عالم بر قرار رہے۔ پھر مالداروں کے مال میں غریبوں کا حصہ مقرر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَفِيٓ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ﴾[1]

(اور ان کے مالوں میں حق تھا منگتا اور بے نصیب کا)

زکوۃ کی فرضیت کی حکمت جب فقیر کی حاجت روائی ہے اور غریب صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ کافروں میں بھی پائے جاتے ہیں تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان کے لیے کافر کو زکوۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟

مصارف زکوۃ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں زکوۃ کے آٹھ مصارف بیان فرمائے ہیں جن کو زکوۃ دینا جائز ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰكِيۡنِ وَ الۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَ الۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِيۡنَ وَ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ ابۡنِ السَّبِيۡلِ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ﴾[2]

(صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ

---

[1]۔ سورۃ الذاریات ۵۱:۱۹

[2]۔ سورۃ التوبہ ۹:۲۰

کرنا چاہیئے یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کردیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے)

اس آیت کریمہ میں ۸ قسم کے لوگوں کا بیان ہوا کہ صرف ان کو زکوۃ دینا جائز ہے:

۱: فقیر، ۲: مسکین، ۳: زکوۃ کو وصول کرنے والے، ۴: مؤلفۃ القلوب، ۵: مقروض، ۶: غلام کو آزاد کرنے میں، ۷: اللہ کے راستے میں، ۸: مسافر

کفار کو زکوۃ چونکہ مؤلفۃ القلوب کے تحت دی جاتی تھی اسی بناء پر ہم فقیر اور مسکین میں فرق ذکر کرنے کے بعد مولفۃ القلوب کے وضاحت کریں۔

فقیر اور مسکین میں فرق:

امام ابو جعفر طحاوی آیت مذکورہ کی تفسیر میں فقیر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿فَأَمَّا الفَقْرُ فَهُوَ ضِدُّ الغِنَى، وَلَيْسَ بِأَنْ يَكُونَ الَّذِي يَقَعُ عَلَيْهِ هَذَا الاسْمُ لا يَمْلِكُ شَيْئًا وَلَكِنَّهُ عَلَى مَنْ لَا يَمْلِكُ مَا يَكُونُ بِهِ.[1]﴾

"فقر یہ غنا کی ضد ہے۔ فقیر اس کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا مالک نہ ہو یعنی اس کے پاس اتنا نہ ہو جو اسے غنی بنادے۔"

امام حسن بصری کے نزدیک فقیر وہ ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے، اور مسکین وہ ہے جو سعی کرتا رہے۔ جناب ابن عباس نے فرمایا: مساکین وہ ہیں جو گھومتے پھرتے ہیں اور فقراء مسلمین ہیں۔ جابر بن زید کہتے ہیں: فقیر وہ ہے جو اپاہج ہو، اور مسکین وہ ہے جو تندرست اور محتاج ہو۔ عکرمہ نے کہا کہ فقراء کا اطلاق مسلمین پر ہوتا ہے، اور مساکین کا اطلاق اہلِ کتاب کے مساکین پر ہوتا ہے۔ امام ابو جعفر طبری کا مختار مذہب یہ ہے کہ جو سوال نہیں کرتے وہ فقراء ہیں، اور جو سوال کرتے ہیں وہ مساکین ہیں۔[2]

---

[1]۔ طحاوی، ابو جعفر احمد بن محمد الازدی، احکام القرآن الکریم، تحقیق: الدکتور سعد الدین اونال، النوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی، ۲۰۱۴ء، ج ۱ ص ۳۵۷

[2]۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج ۱۰ ص ۲۰۵۔۲۰۲

امام اعظم ابو حنیفہ کی رائے میں فقیر وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ مال ہو لیکن وہ نصاب زکوٰۃ سے کم ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ جبکہ امام شافعی کا قول اس کے برعکس ہے اور امام مالک بن انس کے نزدیک فقیر اور مسکین مساوی ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل کا مذہب بھی امام شافعی کے مطابق ہے۔ [1]

مؤلفۃ القلوب سے مراد:

مولفۃ القلوب کے حوالے سے تفسیر اللباب میں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> "مولفۃ القلوب" سے مراد وہ آزاد اور معزز لوگ ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے جنگ حنین میں عطا فرمایا تھا۔ یہ پندرہ آدمی تھے:
>
> ۱: ابو سفیان، ۲: اقرع بن حابس، ۳: عیینہ بن حصن، ۴: حویطب بن عبد العزی، ۵: سہل بن عمر، ۶: حارث بن ہشام، ۷: سہیل بن عمر الحجبی ۸: ابو السنابل، ۹: حکیم بن حزام، ۱۰: مالک بن عوف، ۱۱: صفوان بن امیہ، ۱۲: عبد الرحمٰن بن یربوع، ۱۳: جد بن قیس، ۱۴: عمرو بن مرداس، ۱۵: العلاء بن الحارث۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کو سو اونٹ دیے اور انہیں اسلام کی ترغیب دی، ماسوا عبد الرحمٰن بن یربوع کے، جسے آپ نے پچاس اونٹ دیے، اور حکیم بن حزام کو سترہ اونٹ دیے۔ حکیم بن حزام نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! میرے خیال میں آپ کی عطا کا مجھ سے زیادہ کوئی اور مستحق نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے اسے بھی سو اونٹ پورے کر دیے۔ [2]

---

[1] ۔ محمد الجوزی، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی، زاد المسیر، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ، ج ۳ ص ۴۵۶

[2] ۔ ابن عادل، ابو حفص عمر بن علی، الدمشقی الحنبلی، اللباب فی علوم الکتاب، دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان، الطبعۃ الاولی، ۱۹۹۸ء، ج ۱۰، ص ۱۲۵

مولفۃ القلوب کی قسمیں:

مولفۃ القلوب کی دو قسمیں ہیں:۔ مسلمان اور کافر

مسلمانوں کو صدقات اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ ان کا ایمان مضبوط ہو یا ان کے مثل لوگ اسلام کی طرف راغب ہو جائیں۔ کفار کو زکوۃ اور صدقات اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں یا ان کے شر سے بچا جاسکے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے جب صفوان بن امیہ کی اسلام کی طرف رغبت کو محسوس کیا تو آپ نے انہیں کچھ عطا فرمایا۔[1]

تفسیر اللباب کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ مولفۃ القلوب میں مسلمان اور کافر دونوں شامل ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے جو کافروں کو صدقات واجبہ دیئے اس کی دو حالتیں ہیں:

۱: تاکہ کفار اسلام کی طرف راغب ہوں اور ان کا خاندان اسلام لے آئے۔

۲: تاکہ ان کے شر سے بچا جائے اور وہ مسلمانوں کو تکلیف اور ضرر نہ پہنچائیں۔

مولفۃ القلوب کو زکوۃ دینے کے حوالے سے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک کفار کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے مولفۃ القلوب کی مد سے زکوۃ دینا جائز ہے۔ جبکہ بعض علماء اس کے عدم جواز کے قائل ہیں۔ ہم موخر الذکر کے دلائل پہلے ذکر کرتے ہیں:

فریق اول کے دلائل:

نبی کریم ﷺ نے جب معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو انہیں کچھ نصیحتیں ارشاد فرمائیں:

﴿ادعهم الیٰ شهادة ان لا اله الا الله و انی رسول الله فان اطاعوا لذلك فا علمهم ان الله افترض عليهم خمس صلوات فی اليوم والليلة فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض عليهم صدقة فی اموالهم توخذ من اغنيائهم و ترد علیٰ فقرائهم﴾[2]

---

[1] ۔ابن عادل، ابو حفص عمر بن علی، الدمشقی الحنبلی، اللباب فی علوم الکتاب، ج ۱۰، ص ۱۲۵

[2] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، المطبعۃ السلفیۃ، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، رقم الحدیث: ۱۳۹۵

"ان لوگوں کو اس بات کی گواہی کی طرف بلائیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں تو اگر وہ تیری بات مان لیں تو ان کو بتا دینا کہ اللہ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ یہ بات (بھی) مان لیں۔ تو ان کو بتا دینا کے اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے غریبوں کو دیا جائے گا۔"

اس حدیث پاک کا سیاق و سباق اگر دیکھا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ "فقرائهم" سے مراد مسلمان فقراء ہیں۔ لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوا کہ مالِ زکوۃ، مسلمانوں سے لیا جائے گا اور مسلمانوں کو ہی دیا جائے گا۔ کافروں کو زکوۃ دینا جائز نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے کہ "مولفۃ القلوب" کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جو مولفۃ القلوب کو مالِ زکوۃ عطا فرمایا تھا وہ اس وقت مسلمانوں کی کمزوری اور اسلام کی ابتدائی حالت میں تھا، جب اسلام ابھی پھیلنا شروع ہوا تھا۔ اس وقت کافروں کو اسلام کی طرف راغب کرنے اور ان کے شر سے بچنے کے لیے مالِ زکوۃ دیا گیا۔ اب چونکہ یہ علت ختم ہو چکی ہے اور اسلام دنیا کے ہر کونے میں پہنچ چکا ہے، اس لیے اب کافروں کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے اور "مولفۃ القلوب" کا حکم ساقط ہو گیا ہے۔ علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد لکھتے ہیں:

"مولفۃ القلوب کے سقوط پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کو رد کر دیا تھا۔ عیینہ اور اقرع نے حضرت ابو بکر سے ایک زمین طلب کی۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خط کو پھاڑ دیا اور کہا: 'یہ وہ چیز ہے جو تم کو رسول اللہ ﷺ عطا کرتے تھے تاکہ تم کو اسلام پر راغب کریں، لیکن اب اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا اور تم کو مستغنی کر دیا۔

اب اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہتے ہو تو بہت اچھا ہے، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔' پھر وہ دونوں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا: 'خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟' حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے موافق ہو گئی اور صحابہ میں سے کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اگر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی رائے برحق نہ ہوتی تو صحابہ اس پر ضرور انکار کرتے اور یقیناً ان کے پاس ایسی دلیل ہوتی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات سے قبل اس حکم کو منسوخ کر دیا تھا، یا یہ حکم آپ کی حیات کے ساتھ مقید تھا، یا یہ حکم کسی علت پر مبنی تھا اور اب وہ علت باقی نہیں رہی"۔ [1]

ابن ہمام رحمہ اللہ کی اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولفۃ القلوب کے ساقط ہونے پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا اجماع ہے۔ کیونکہ مولفۃ القلوب کو زکوۃ دینے کی ایک علت تھی جو اب باقی نہیں رہی۔ عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کافروں کو زکوۃ دینا جائز نہیں کیونکہ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کافروں کو زکوۃ اس لیے دی تاکہ وہ اسلام کی طرف راغب ہو جائیں۔ اسی وجہ سے ان کا نام "مولفة قلوبهم" رکھا گیا، یعنی وہ لوگ جن کے دلوں کو مائل کیا گیا۔ اس وقت مسلمان تعداد میں کم تھے اور اسلام اتنا پھیلا نہیں تھا، جبکہ کافروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اب چونکہ حالات بدل چکے ہیں اور اسلام دنیا کے ہر کونے تک پہنچ چکا ہے، مسلمان تعداد میں بھی زیادہ ہیں، لہذا مولفۃ القلوب کو دینے کی علت باقی نہیں رہی۔ اور قاعدہ یہ ہے کہ جب علت ختم ہو جائے تو حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ [2]

---

[1] ۔ ابن ہمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد، فتح القدیر، دار الفکر، بیروت، ج ۲، ص ۲۶۵

[2] ۔ الکاسانی، امام علاء الدین ابو بکر بن سعود، بدائع الصنائع، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج ۲، ص ۴۵

جوازِ صدقہ کی روایات کا جواب:

جن روایات سے کافر کو صدقہ دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے ان تمام روایات میں صدقہ سے مراد صدقہ واجبہ نہیں ہے۔ بلکہ صدقہ نافلہ ہے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں:

﴿وقد وقع الإجماع على جواز التصدق وإعطائه من صدقة نافلة، وشرط بعض الفقهاء أن لا يكون في إعطاء الحربي تقوية له على أهل الإسلام.[1]﴾

"اس بات پر اجماع ہے کہ کافر کو صدقہ دینا اور صدقہ نافلہ میں سے کچھ دینا جائز ہے۔ بعض فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ صدقہ دینے میں کافر حربی کو مسلمان کے خلاف لڑنے کی تقویت نہ ملے (ورنہ جائز نہیں)۔"

فریق ثانی کے دلائل:

فریق ثانی کی پہلی دلیل سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۶۰ ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوۃ بیان فرمائے ہیں۔ ان میں مولفۃ القلوب کو بھی ذکر فرمایا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مولفۃ القلوب یہ بھی زکوۃ کا مصرف ہے اور اس کو زکوۃ دینا جائز ہے۔ ابن جوزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

﴿والمولفة قلوبهم هم قوم كان رسول الله ﷺ يعطونهم صنفان مسلمون و كافرون الخ[2]﴾

"مولفۃ القلوب وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ مرتبہ والے تھے اور نبی کریم ﷺ ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے کچھ دیتے تھے یہ پھر دو قسم پر تھے۔ ۱: مسلمان، ۲: کافر۔ کافر پھر دو قسم پر تھے:

۱: بعض وہ جو مسلمانوں کو تکلیف دیتے تھے تو ان کے شر سے بچنے کے لئے حضور اکرم ﷺ ان کو زکوۃ دیتے تھے جیسے عامر بن طفیل۔

1۔ سرخسی، شمس الدین محمد بن احمد، المبسوط، دار المعرفہ، بیروت، ج۳، ص ۱۱۱

2۔ ابن جوزی جمال الدین عبد الرحمٰن بن علی، زاد المسیر، ص590

۲: بعض وہ تھے جو اسلام کی طرف مائل تھے تو ان کو اس لیے دیتے تاکہ ایمان لے آئیں جیسے صفوان بن امیہ۔

حدیث مبارکہ سے صراحۃ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کافروں کو زکوۃ دی ہے۔ امام بخاری سورہ الاعراف آیت نمبر ۶۵ کی تفسیر کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ پاک ذکر کرتے ہیں:

﴿بَعَثَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذُهَيْبَةٍ فَقَسَمَهَا بَيْنَ الْأَرْبَعَةِ: الْأَقْرَعِ بْنِ حَابِسٍ الْحَنْظَلِيِّ، ثُمَّ الْمُجَاشِعِيِّ وَعُيَيْنَةَ بْنِ بَدْرٍ الْفَزَارِيِّ، وَزَيْدٍ الطَّائِيِّ، ثُمَّ أَحَدِ بَنِي نَبْهَانَ وَعَلْقَمَةَ بْنِ عُلَاثَةَ الْعَامِرِيِّ، ثُمَّ أَحَدِ بَنِي كِلَابٍ. فَغَضِبَتْ قُرَيْشٌ وَالْأَنْصَارُ، قَالُوا: "يُعْطِي صَنَادِيدَ أَهْلِ نَجْدٍ وَيَدَعُنَا!" قَالَ: "إِنَّمَا أَتَأَلَّفُهُمْ[1]﴾

"علی رضی اللہ عنہ نے (یمن سے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کچھ سونا بھیجا تو آپ ﷺ نے اسے چار آدمیوں میں تقسیم کر دیا، اقرع بن حابس حنظلی ثم المجاشعی، عیینہ بن بدر فزاری، زید طائی بنی نبہان والے اور علقمہ بن علاثہ عامری بنو کلاب والے، اس پر قریش اور انصار کے لوگوں کو غصہ آیا اور کہنے لگے کہ آپ ﷺ نے نجد کے بڑوں کو تو دیا لیکن ہمیں نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ ﷺ فرمایا کہ میں صرف ان کے دل ملانے کے لیے انہیں دیتا ہوں (کیونکہ ابھی حال ہی میں یہ لوگ مسلمان ہوئے ہیں)"

اب اس حدیث پاک میں صراحۃً موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تالیف قلب کے لئے کافروں کو زکوۃ دی۔ لہذا روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ کافر کو زکوۃ دینا جائز ہے۔ رہا یہ

---

[1] ۔ بخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل ، صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ و الی عاد اخاھم ھود، رقم الحدیث: ۴۳۵۱

اعتراض کہ مولفۃ القلوب کے ساقط ہو جانے اور اس کے منسوخ ہونے پر اجماع ہے۔ اس پر امام زہری کہتے ہیں:

﴿لا اعلم شيئا منسوخاً حكم المولف[1]﴾

"میرے علم میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس نے مولفۃ القلوب کو منسوخ کیا ہو۔"

صاحبِ کتاب الاموال کہتے ہیں:

"میرا بھی یہی مذہب ہے کیونکہ آیت محکم ہے۔ کتاب اللہ اور حدیث سے کوئی بھی ناسخ ہمارے علم میں نہیں ہے۔"[2]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں جو ذکر تھا کہ مسلمان مالداروں سے مالِ زکوۃ لیا جائے گا اور غریبوں کو دیا جائے گا تو وہ حدیث عام مخصوص منہ البعض ہے اس لیے مخصوص مصارف زکوۃ والی آیت ہے کہ تالیف قلوب کے لئے زکوۃ کفار کو دینا جائز ہے۔

ترجیح دلائل:

فریقین کے دلائل کو اگر دیکھا جائے تو فریق ثانی کے دلائل چاروں جہتوں سے قوی معلوم ہوتے ہیں:۔

۱: فریق ثانی، جو کفار کو زکوۃ دینے کے قائل ہیں، کے دلائل معارضہ سے محفوظ ہیں اور نبی کریم ﷺ کا فعل، یعنی مولفۃ القلوب کو زکوۃ دینا، ان کے موقف کی تائید کرتا ہے۔

۲: مولفۃ القلوب کا اجماع کی وجہ سے منسوخ ہونا ضعیف ہے کیونکہ صحابی کا قول یا فعل، کتاب اللہ کی نص کو منسوخ نہیں کر سکتا۔

۳: مسلم اقلیتیں اگر غیر مسلم ممالک میں کافروں پر خرچ کریں گی تو انہیں دینِ برحق کی طرف مائل کرنا آسان ہو گا اور ان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ مزید برآں اسلام اور مسلمانوں کو تقویت بھی ملے گی۔

1۔ ابن جوزی، عبد الرحمٰن بن علی، زاد المسیر، ج ۳، ص ۴۵۷

2۔ ابو عبید القاسم بن سلام، کتاب الاموال، ص ۲۲۷

۴: اسلام کی قوت اب پھر ختم ہو چکی ہے لہذا اگر حاجت ہو تو غریب کافروں کو خصوصاً زکوۃ دی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی بعض محتاج کافروں کو زکوۃ دی۔ اسلام ہمیشہ غریبوں میں رہا ہے اور غریبوں میں ہی رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الْإِسْلَامَ بَدَأَ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا كَمَا بَدَأَ[1]﴾

"اسلام غریب لوگوں سے شروع ہوا تھا اور غریبوں پر ختم ہو گا۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر مسلم اقلیات کافروں کو زکوۃ دینے میں کوئی دینی یا سیاسی مصلحت محسوس کریں یا ان کو دینِ اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو تو ان کو زکوۃ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

عبادات کے باب سے متعلق مسائل:

اسلامی شناخت قائم رکھنے میں عبادات کا عمل دخل نمایاں ہے۔ پھر عبادات کی متعدد جہات ہیں۔ اس لیے اس باب میں پیش آنے والی مشکلات بھی متعدد الجہات ہیں، جن میں سے چند ایک کا تذکرہ حسبِ ذیل ہے:

غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں نماز پڑھنے کا حکم:

عصرِ حاضر کے حوالے سے اس جدید موضوع پر کلام کرتے ہوئے ڈاکٹر انعام اللہ اجتہاد کے شمارہ نمبر ۱۲ میں لکھتے ہیں:

> "مساجد کے حوالے سے یہ مشکل بھی پیش آتی ہے، کہ جہاں باقاعدہ مسجد نہ ہو ،تو غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں نماز پڑھنی ہوتی ہے، کیا یہ جائز ہے؟ بالخصوص اگر ان عبادت خانوں میں مجسمے، بت اور تصویریں بھی موجود ہوں۔ تاہم اس مشکل کا حل آسان ہے، اس لیے کہ باجماعت نماز کی ادائیگی کے لئے گرجاگھروں کو کرائے پر لینا

---

[1] ۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء ان الاسلام بدا غریبا وسیعود غریبا، رقم الحدیث ۲۶۲۹

اور ان گرجاگھروں میں پنج وقتہ نماز باجماعت اور جمعہ کی نماز قائم کرنا
اور عام سنن ونوافل ادا کرنا جائز ہے۔ حدیث شریف میں آپ ﷺ
کاارشاد ہے کہ میرے لئے پوری زمین مسجد بنادی گئی ہے۔[1]

البتہ نمازوں کی ادائیگی کے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کم از کم نماز کے وقت بتوں، مجسموں اور تصاویر کو وہاں سے ہٹا دینا چاہیے، اس لیے کہ جس گھر میں مجسمے اور تصاویر ہوں وہاں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس گرجاگھر میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے جس میں تصاویر اور مورتیاں نہیں ہوتی تھیں۔[2]

کنزالعمال میں حدیث پاک ہے:

﴿انه كان يكره ان يصلى فى الكنيسة اذا كان فيها تماثيل﴾[3]

"گرجے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جبکہ اس میں مورتیاں موجود ہوں۔"

---

[1]۔ ابو دائود، السجستانی، السنن، کتاب الصلاۃ، باب فی المواضع التی لا تجوز فیھا الصلاۃ، رقم الحدیث:۴۸۹

[2]۔ ڈاکٹر ساجد شہباز خان، غیر مسلموں سے مشابہت اور تعلقات کے ضمن میں مسلم اقلیات کے مسائل، درمشمولہ، اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، شمارہ ۱۲، ۲۰۱۹، ص ۱۳۲

[3]۔ علی بن حسان الدین، کنزالعمال فی سنن الاقوال والافعال، موسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۱، ج۸، ص ۱۹۵، رقم الحدیث:۲۲۵۲۰

فصل دوم:

نکاح وطلاق کے مسائل واحکام

بقائے انسانی، عفت و عصمت کے تحفظ اور متمدن زندگی گزارنے کے لیے اللہ رب العزت نے نکاح کو مشروع فرمایا ہے۔ نکاح، زوجین کے لیے سکونِ قلب کا باعث ہے۔ نکاح سے قبل ہر دو فریق کو خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، اور بعد ازاں جدائی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ایک خوشگوار اور پر امن زندگی گزارنے کے لیے میاں بیوی کے درمیان مذہبی، فکری، اور تہذیبی ہم آہنگی بے حد ضروری ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان کا نکاح کافرہ سے اور کافر کا مسلمان عورت سے جائز نہیں ہے۔

قرآن کریم میں مشرکین کی دو قسمیں بیان کی گئیں ہیں:

۱:۔ اہلِ کتاب ۲:۔ غیر اہل کتاب

ثانی الذکر سے رشتہ نکاح جائز نہیں ہے۔ تفصیل اس کی درج ذیل ہے:

غیر اہلِ کتاب سے مناکحت کی ممانعت:

قرآن حکیم نے ایسے لوگوں سے کہ جن کا مذہب آسمانی نہیں ہے سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ -وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا - وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ -اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ -وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ -وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾[1]

(اور شرک والی عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک مسلمان نہ ہو جائیں اور بے شک مسلمان لونڈی مشرکہ سے اچھی اگرچہ وہ تمہیں بھاتی ہو اور مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اور بے

[1] ۔سورۃ البقرۃ ۲:۲۲۱

شک مسلمان غلام مشرک سے اچھا اگرچہ وہ تمہیں بھاتا ہو وہ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم سے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے کہ کہیں وہ نصیحت مانیں۔)

اس آیت مبارکہ میں واضح الفاظ میں مسلمانوں کو مشرک خواتین کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کو مشرک مردوں سے نکاح کرنے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ ایمان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرما دیا کہ اگرچہ مشرکہ عورت حسین و جمیل، صاحبِ حیثیت اور اعلیٰ حسب و نسب کی حامل ہو، تب بھی اس کے مقابلے میں ایک غریب مسلم باندی کے ساتھ نکاح کرنا بہتر ہے۔ اس آیت مبارکہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان نکاح کی ممانعت کی اصل وجہ بھی بیان کر دی ہے کہ شرک اور توحید دو متضاد عقائد ہیں۔ شرک گمراہی ہے جبکہ توحید ہدایت کا راستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان متضاد نظریات کے ساتھ عائلی معاملات نہ تو احسن طریقے سے چل سکتے ہیں اور نہ ہی اس معاہدے کے ذریعے فریقین میں محبت و اعتماد کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقیدے میں اتنا بڑا تضاد کسی بھی وقت فریقین کے درمیان تصادم کا باعث بن سکتا ہے۔ قرآن مجید نے ایک اور مقام پر صلح حدیبیہ کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال کے تحت یہ حکم دیا کہ جو مسلمان عورتیں مشرکین کے نکاح میں ہیں، وہ اگر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آجائیں تو انہیں دوبارہ مشرکین کے پاس نہ بھیجا جائے، کیونکہ متضاد عقیدوں کی وجہ سے ان کے درمیان ازدواجی رشتہ ختم ہو چکا ہے۔

ارشاد فرمایا گیا:

﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ[1]۔﴾

---

[1] ۔ سورۃ الممتحنہ ۶۰:۱۰

(یہ انہیں حلال نہ وہ انہیں حلال)

تفسیراتِ احمدیہ میں ملا جیون اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر یہ شرط طے پائی گئی کہ اگر کوئی مسلمان مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آئے گا تو اسے واپس مدینہ منورہ جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور اگر کوئی کافر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آکر اسلام قبول کر لے تو رسول اللہ ﷺ پر لازم ہو گا کہ اسے واپس مکہ مکرمہ بھیج دیا جائے۔ اس معاہدے کے بعد کچھ مسلمان عورتیں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ان میں ایک خاتون، سبیعہ بنت الحارث الاسلمیہ بھی تھیں، جن کا شوہر، صیفی بن راہب المخزومی، ان کے پیچھے مدینہ آیا تاکہ انہیں واپس لے جا سکے، جیسا کہ امام زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں ذکر کیا ہے۔ اسی دوران حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا حکم لے کر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے مومن عورتوں کو کفار کے پاس واپس بھیجنے سے روک دیا اور فرمایا: اے مومنو! اگر تمہارے پاس زبان سے اسلام قبول کرنے والی مومن عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائیں تو تم ان کا امتحان لیا کرو۔ امتحان کے بعد پھر جو تمہیں ان کے بارے میں ظن غالب ہو جائے کہ ان کے دل بھی ان کی زبانوں کے موافق ہیں اور تمہارا ظن غالب یہ ہو کہ وہ مکہ کو صرف اس لیے چھوڑ کر آئیں کہ وہ مومن ہیں اوراور کوئی دوسری وجہ نہیں اور تمہیں ان کے قسم اٹھانے اور دوسری علامات سے ظن غالب ہو جائے تو پھر تم انہیں ان کے کافر خاوندوں کے پاس واپس مت بھیجو! اب نہ تو وہ ان کے لئے حلال رہیں اور نہ وہ ان کے لئے حلال رہے۔[1]

اسی آیت کے تحت حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

﴿هَذِهِ الآيَةُ هِيَ الَّتِي حَرَّمَتِ الْمُسْلِمَاتِ عَلَى الْمُشْرِكِينَ، وَقَدْ كَانَ جَائِزًا فِي ابْتِدَاءِ الإِسْلَامِ أَنْ يَتَزَوَّجَ الْمُشْرِكُ الْمُؤْمِنَةَ﴾

---

[1]۔ ملا جیون، تفسیراتِ احمدیہ، ضیاء القرآن پبلیکشنز، لاہور، ص ۹۳۵

یہی وہ آیت ہے جس نے مسلمان عورتوں کو مشرکین پر حرام قرار دیا۔ حالانکہ ابتدائے اسلام میں مشرک کے لیے مومنہ سے نکاح کرنا جائز تھا۔

یہ ایسا حکمِ حرمت تھا جس نے ان عورتوں کے نکاح کو مشرک مردوں کے ساتھ اور مومنوں کے نکاح کو مشرکہ عورتوں کے ساتھ فسخ کر دیا جو ہجرت کے بعد مسلمان شوہروں کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کے بجائے مکہ مکرمہ میں رہ گئی تھیں۔ اللہ رب العزت نے ان کے درمیان علیحدگی کا حکم صادر فرمایا۔

امام قرطبی لکھتے ہیں کہ امام نخعی اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

﴿هي المسلمة تلحق بدارالحرب فتَكْفُر، وكان الكفاريتزوجون المسلمات،والمسلمون يتزوجون المشركات،ثم نُسِخ ذلك بهذه الآية[1]﴾

"کفار مسلمان عورتوں سے اور مسلمان مرد مشرک عورتوں سے نکاح کرتے تھے مگر اس آیت میں ایسی تمام شادیوں کو منسوخ کر دیا گیا۔"

حکمِ الہیٰ پر صحابہ اکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی ایسی ازواج جو کہ کافر تھیں کو عقدِ زوجیت سے فی الفور فارغ کر دیا۔ علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

﴿فَطَلَّقَ الْمُؤْمِنُونَ حِينَ نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ كُلَّ امْرَأَةٍ كَافِرَةٍ كَانَتْ تَحْتَ رَجُلٍ مِنْهُمْ[2]﴾

"جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے ہر اس کافر عورت کو جو ان میں سے کسی صحابی کے عقد میں تھی، فوراً طلاق دے دی۔"

صحیح بخاری میں جنابِ عمرِ فاروق کا طرزِ عمل یوں ذکر کیا گیا:

---

[1] ۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتاب العربی، بیروت، ج۱۸-۱۷، ص۵۹

[2] ۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ۲۸:۷۲

﴿ان عمر طلق امراتين قريبة بنت ابى امية وابنة جرول الخزاعى فتزوج قريبة معاوية وتزوج الاخرى ابو جهم﴾[1]

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنی دو مشرکہ بیویوں کو جو مکہ ہی میں مقیم تھیں طلاق دے دی۔ ان میں سے ایک قریبہ بنت ابو امیہ تھی، جس کا نکاح بعد ازاں حضرت معاویہ سے ہوا (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے)۔ سیدنا عمر کی دوسری بیوی ام کلثوم بنت عمرو بن جرول الخزاعی تھی، جس نے بعد ازاں اسی کے خاندان کے ایک شخص ابو جہم سے شادی کرلی۔"

اس کے برعکس قرآن نے اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا ہے۔

اہلِ کتاب سے مراد:

اہلِ کتاب سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس کا جامع جواب الموسوعۃ الفقھیہ الکویتیہ میں ہے:

﴿اختلف العلماء فى المراد بأهل الكتاب، فذهب الحنفية إلى أن المراد بهم كل من يؤمن بنبى ويقر بكتاب، ويدخل فى ذلك اليهود والنصارى ومن آمن بزُبُور داود عليه السلام وصحف إبراهيم عليه السلام، وذلك لأنهم يعتقدون دينًا سماويًا ومنزلًا بكتاب﴾[2]

"علماء کا اہل کتاب کے بارے اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی نبی پر ایمان رکھتے ہوں اور کسی آسمانی کتاب کا اقرار کرتے ہوں اور ان ہی میں یہودی، نصرانی اور حضرت داؤد کی زبور اور حضرت ابراہیم کے صحائف پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ آسمانی دین اور کتاب کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

---

[1] ۔ بخاری، الصحیح، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب، رقم الحدیث: ۲۷۳۳

[2] ۔ موسوعہ فقہیہ ۱۵/ ۱۲۲-۱۷۰

کتابیہ سے نکاح کا قرآنی جواز:

سورۃ الممتحنہ میں اللہ رب العزت نے مشرکین سے نکاح کی ممانعت کی تھی جبکہ سورۃ المائدہ میں اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح جائز قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ-وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ-وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ-وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ-وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ[1]﴾

(آج تمہارے لیے پاک چیزیں حلال ہوئیں اور کتابیوں کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کے لیے حلال ہے اور پارسا (پاک دامن) عورتیں مسلمان اور پارسا عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی جب تم انہیں ان کے مہر دو! قید میں لاتے ہوئے نہ مستی نکالتے اور نہ آشنا بناتے اور جو مسلمان سے کافر ہو اس کا کیا دھرا سب اکارت (ضائع) گیا اور وہ آخرت میں زیاں کار ہے)

آیت مذکورہ بالا میں محصن عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ محصنٰت سے مراد عفیف و پاکدامن، اچھے اخلاق والی عورتیں ہیں۔ احصان کی شرط کے ساتھ مخصوص حالات میں کتابیہ سے نکاح کا جواز جمہور کے نزدیک صحیح ہے۔ لیکن عمومی حالات میں اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اہل کتاب خواہ وہ یہودی ہوں یا عیسائی، قرآن نے خود ان کے شرکیہ عقائد کو بیان کیا ہے۔ وجہ جواز یہ ہے کہ دونوں میں کافی حد تک اعتقادی یکسانیت پائی جاتی ہے اگرچہ اہل کتاب بعض عقائد کا محض دعویٰ کرتے ہیں مگر قرآن نے ان کے دعویٰ کو قطعی رد نہیں کیا۔

---

[1] ۔سورۃ المائدۃ ۵:۵

مثلاً وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ وحی اور رسالت کو بھی مانتے ہیں۔ موت کے بعد برزخ اور بعد ازاں اُخروی زندگی کے بھی قائل ہیں۔ ملا احمد جیون لکھتے ہیں:

"محصنات کا لفظ پاک دامن عورتوں کے لئے بھی آیا ہے جیسا کہ والذین یرمون المحصنٰت میں ہے۔اور کتابیات کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔جیسا کہ والمحصنٰت من المو منٰت من الذین اوتوا الکتٰب میں ہے۔ اور ایسی آزاد عورتوں کے لئے بھی جو خاوندوں والی ہوں۔"[1]

قاضی ثناء اللہ پانی پتی محصنات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"امام بغوی نے فرمایا: محصنات کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد آزاد عورتیں ہیں۔ علماء نے ہر آزاد عورت سے شادی کی اجازت دی ہے۔ وہ مومن ہو، یا کتابی ہو فاجر ہو یا پاکدامن۔[2]

مفسر ابو بکر الجصاص اسی موضوع پر مزید بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

﴿انه قد ذکر المومنات فی قوله: (والمحصنت من المومنت) فانتظم ذلك سائر المومنات ممن کن مشرکات او کتابیات، فاسلمن و ممن نشاءمنهن علی الاسلام، فغیر جائز ان یعطف علیه مومنات کن کتابیات، فوجب ان یکون قوله: (والمحصنت من الذین اوتوا الکتب من قبلکم) علی الکتابیات اللاتی لم یسلمن﴾[3]

"اللہ رب العزت نے پاک دامن مسلمان عورتیں، (تمہارے لیے حلال ہیں) اس میں مومن عورتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ لفظ ان تمام

---

[1] ۔ ملا احمد جیون، تفسیراتِ احمدیہ، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ص ۳۸۳

[2] ۔ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ج ۳، ص ۴۲

[3] ۔ الجصاص، ابو بکر احمد بن علی، الرازی، احکام القرآن، دار الفکر، بیروت، ۱۴۳۲ھ، الجزء الثانی، باب تزوج الکتابیات، ص ۴۶۱

مومنات کو شامل ہے جو پہلے مشرکہ یا کتابیہ تھیں اور پھر مسلمان ہو گئیں تاہم جو عورتیں بچپن ہی سے مسلمان تھیں ان پر ایسی مومنات کو محمول کرنا درست نہیں جو اہل کتاب تھیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (والمحصنت من الذین او توا الکتب من قبلکم) اور ان لوگوں میں سے پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی (تمہارے لیے حلال ہیں) کو ان کتابی عورتوں پر محمول کرنا واجب ہے جو مسلمان نہیں ہوئی تھیں۔"

صحابہ کرام میں سے بعض نے اہل کتاب خواتین سے نکاح کیے۔ ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص نے تفسیر احکام القرآن میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت اس جواز کی نہ صرف قائل تھی بلکہ ان میں سے بعض نے نکاح عملاً کئے بھی تھے۔ جصاص لکھتے ہیں:

﴿واتفق جماعة من الصحابة علی اباحة اهل الکتاب الذمیات سوی ابن عمر[1]﴾

"ابن عمر کے علاوہ گروہِ صحابہ اہل کتاب عورت سے نکاح کے جواز پر متفق ہے۔"

مفسر ابو بکر الجصاص حنفی سمیت دیگر فقہاء کرام اور مفسرین عظام نے کتابیہ عورتوں سے نکاح کے جواز پر بحث کرتے ہوئے ان صحابہ کرام کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کیا تھا۔ مثلاً جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانی عورت سے نکاح کیا جبکہ جناب طلحہ رضی اللہ عنہ نے یہودی عورت سے نکاح کیا، حالانکہ اس وقت آپ کے نکاح میں مسلم ازواج بھی تھیں۔

ا۔ امام ابو بکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

---

[1] ۔ الجصاص، ابو بکر احمد بن علی، الرازی، احکام القرآن، باب تزوج الکتابیات، ص ۴۶۰

﴿وروی أن عثمان بن عفان تزوج نائلة بنت الفرافصة الكلبية وهی نصرانية، وتزوجها علی نسائه الأنصاريات. وروی عن طلحة بن عبيد الله أنه تزوج يهودية من أهل الشام. وتروی إباحة ذلك عن عامة التابعين، منهم: الحسن وإبراهيم والشعبی وآخرين منهم.﴾[1]

"روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نائلہ بنت فرافصہ سے نکاح کیا تھا۔ ان کا تعلق بنو کلب سے تھا اور وہ مذہباً عیسائی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مسلمان بیویوں کے ہوتے ہوئے ان سے نکاح کیا تھا اور حضرت طلحہ کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپ نے شام کی ایک یہودی عورت سے نکاح کیا۔ تابعین سے بھی ایسے نکاح کا جواز مروی ہے جن میں حسن بصری، ابراہیم نخعی اور شعبی نیز دوسرے احباب بھی شامل ہیں۔"

حضرت حذیفہ بن یمان نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا تو جناب عمر فاروق نے ان کو لکھا کے اسے طلاق دے دو۔ جناب حذیفہ نے حضرت عمر کو جواب میں لکھا کہ کیا یہودیہ میرے لیے حرام ہے؟ فاروقِ اعظم نے جواب دیا: میں حرام نہیں کہتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم اہلِ کتاب کی غیر محصن عورتوں سے نکاح کرنے لگو گے۔[2]

ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا:

﴿شهدنا القادسية مع سعد و نحن يومئذ لا نجد سبيلا الی المسلمات و تزوجنا اليهوديات والنصرانيات فمنا من طلق و منا من امسك[3]﴾

---

[1] ۔ الجصاص، ابو بکر احمد بن علی، الرازی، احکام القرآن، باب تزوج الکتابیات، ص ۴۶۰

[2] ۔ الجصاص، ابو بکر احمد بن علی، الرازی، احکام القرآن، الجزء الثانی، باب تزوج الکتابیات، ص ۴۵۹

[3] ۔ ابن ابی شیبہ، المصنف، کتاب النکاح، باب من رخص فی نکاح نساء اہل الکتاب، رقم الحدیث: ۱۶۱۶۹

"ہم قادسیہ کی جنگ میں جناب سعد بن ابی وقاص کے ساتھ (شریک جہاد) تھے۔ان دنوں ہمارے پاس مسلمان عورتوں سے شادی کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم نے یہودی اور نصرانی عورتوں کے ساتھ شادی کر لی۔ پھر ہم میں سے بعض نے طلاق دے دی اور بعض نے ان کے ساتھ نکاح کو باقی رکھا۔"

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی مذکورہ مسئلہ پر تفسیر ذکر کرنا افادہ سے خالی نہیں ہے۔ آپ امام اعظم کا موقف بیان کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں:

"امام ابو حنیفہ تو مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں کرتے اور ایسی کتابیہ یا باندی کے ساتھ بھی نکاح کو جائز قرار دیتے ہیں جو پاک باز نہ ہو۔ کیونکہ آیت (واحل لکم ماوراء ذلکم) حکم عام ہے (اس میں غیر عفیفہ کتابیہ اور بادی کتابیہ دونوں آتی ہیں۔امام شافعی کے نزدیک مفہوم مخالف اگرچہ معتبر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں معتبر نہیں۔ اسی لیے ان کے نزدیک ایسی لونڈی چاہے مومنہ ہو یا بدکارہ، اس کے ساتھ نکاح جائز ہے۔اسی وجہ سے امام بیضاوی نے فرمایا کہ یہاں مومنات میں سے محصنات کی تخصیص صرف اولیٰ کی ترغیب کے لئے ہے۔ یعنی اگرچہ غیر محصنات سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن محصنات سے نکاح کرنا اولیٰ ہے۔"[1]

اور اس پر اجماع ہے کہ ہر آزاد، کتابی عورت کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ اختلاف صرف باندی کتابی عورت کے ساتھ نکاح میں ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس بحث کے آخر میں خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1]۔ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۳، ص ۴۲

صابی عورتوں سے نکاح کرنے کے بارے امام ابو حنیفہ اور صاحبین میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ نے نکاح جائز قرار دیا ہے کیونکہ آپ کے نزدیک صابی زبور کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی اس لیے وہ اہل کتاب میں سے ہیں۔ یہی حکم ان لوگوں کا بھی ہو گا جو صحفِ ابراہیمی اور صحف شیث پر ایمان لائے۔[1]

نیٹ یا ٹیلی فون پر نکاح:

انٹرنیٹ، ٹیلی فون یا تنہائی میں لڑکے اور لڑکی کے ایجاب و قبول سے نکاح منعقد نہیں ہوتا، ایسا نکاح فاسد ہے۔ نکاح کے لیے چند امور ضروری ہیں: نکاح کا اعلانیہ ہونا مستحب ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> أَعْلِنُوا هَذَا النِّكَاحَ وَاجْعَلُوهُ فِي الْمَسَاجِدِ وَاضْرِبُوا عَلَيْهِ بِالدُّفُوفِ[2]
>
> (لوگو) نکاح کا اعلان کیا کرو (یعنی اس کی تشہیر کیا کرو) اور مسجدوں میں نکاح کرو اور اس کی تشہیر میں دف بجایا کرو۔

مفتی منیب الرحمان لکھتے ہیں:

> نکاح کے صحیح طور پر منعقد ہونے کے لیے رکنِ نکاح ایجاب و قبول کے موقع پر مجلسِ نکاح میں دو گواہوں کا ہونا شرط (ضروری) ہے، خواہ لڑکا اور لڑکی براہ راست ایجاب و قبول کریں یا بذیعہ وکیل، اگر وکیل کے ذریعے ایجاب و قبول ہو تو اس امر کے ثبوت کے طور پر کہ لڑکی نے ایک مقررہ مہر پر اس لڑکے کے ساتھ اس وکیل کو اپنے نکاح کا اختیار دیا ہے،

---

[1]۔ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری ،ج۳، ص ۴۲

[2]سنن ترمذی: رقم الحدیث 1089

الگ سے دو گواہوں کا ہونا بہتر ہے۔ گواہوں کے بغیر نکاح پر وعید آئی ہے۔[1]

لہٰذا نیٹ یا ٹیلی فون پر نکاح درست نہیں کہ ایجاب وقبول کی مجلس مختلف ہے البتہ اگر نیٹ یا ٹیلی فون پر کسی کو وکیل بنادیا جائے اور وہ وکیل گواہوں کی موجودگی میں اپنے موکل کا نکاح پڑھادے تو شرعاً جائز ہو گا۔

کتابیہ سے دعوتی نقطۂ نظر کے اعتبار سے نکاح:

دعوتی نقطہ نظر سے اہل کتاب خواتین سے نکاح کرنے کے بارے اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۲۵ ویں فقہی سیمینار مورخہ ۵ تا ۷ فروری ۲۰۱۶ء منعقدہ جامعہ دار الحدیث بدر پور (آسام) میں پیش کیے جانے والے مقالات میں مفتی عابدالرحمٰن بجنوری اہل کتاب "اسلام کی نظر میں" اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اس وقت دنیا میں جتنے بھی اہل کتاب یہود و نصاریٰ موجود ہیں، وہ بظاہر عیسائی یا یہودی ہیں، لیکن ان کے عقائد میں شرک، دہریت، کمیونزم، سائنس پرستی، اور مادیت پرستی شامل ہیں۔ مذہب ان کے نزدیک محض خام خیالی اور واہمہ ہے، اس لیے ایسے افراد اہل کتاب میں شمار نہیں ہوسکتے بلکہ وہ ملحد اور کافر ہیں۔ اس لیے دعوت و تبلیغ کا بہانہ بناکر ان سے نکاح کرنا، ازدواجی تعلق قائم کرنا اور ان کے ساتھ زندگی گزارنا بہرحال مکروہ ہو گا، کیونکہ دارالکفر کا ماحول کافرانہ، ملحدانہ، زندقانہ، مرتدانہ، مشرکانہ اور جاہلانہ ہوتا ہے۔ ہاں، اگر مکمل یقین ہو کہ نکاح کے بعد وہ کتابی عورت مسلمان ہو جائے گی اور اس کے خاندان کے افراد بھی اس کے ایمان لانے سے فیض یاب ہوں

---

[2]۔ مفتی منیب الرحمان، تفہیم المسائل، ضیاءالقرآن پبلی کیشنز، لاہور، کراچی: ج 6، ص 275

گے، تو ایسی کتابی عورت سے دعوتی نقطہ نظر سے دار الکفر میں نکاح کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔[1]

مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہل کتاب عورتوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔

قادیانی مرد سے مسلمان عورت کا نکاح:

کوئی شخص پہلے مسلمان تھا اور پھر اسلام سے منحرف ہوکر قادیانی ہوگیا تو یہ مرتد ہے اور مرتد سے مسلمان کا نکاح باطل ہے،اگر کسی شخص کا باپ یا دادا مرتد ہوکر قادیانی ہوگیا تھا بعد میں اس کے اولاد ہوئی جو اس باطل عقیدے پر قائم رہی تو یہ لوگ کافر ہیں اوراللہ رب العزت نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ میں ارشاد فرمایا:

کافر کے ساتھ (مومن عورتوں کا) نکاح نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔

اس آیت میں مشرک سے نکاح کی ممانعت کے حکم میں کافر، مجوسی اور بت پرست سب شامل ہیں۔جو مسلمان والدین جان بوجھ کر حلال سمجھ کر اپنی بیٹی کا نکاح قادیانی کے ساتھ کریں تو اس سے کفر لازم آتا ہے انہیں چاہیے کہ فوراً توبہ کریں ! تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح کریں۔

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان وراثت:

شرعی اصول کے تحت کتابیہ عورت (خواہ نصرانی ہو یا یہودی) اپنے متوفّیٰ مسلمان شوہر کی وارث نہیں بن سکتی۔

رسول مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن اسامة بن زيد ان النبی ﷺ قال: لا يرث المسلم الكافر ولا يرث الكافر المسلم[2]

---

[1]۔ مفتی عابد الرحمٰن مظاہری بجنوری، اہل کتاب سے متعلق مسائل واحکام، اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا، فروری، ۲۰۱۷، ص ۴۸۷

[2] مسلم، مسلم بن حجاج قشیری، صحیح مسلم: 4140

حضرت اسامہ بن زید راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے نہ کافر مسلمان کا۔

اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔ جمہور صحابہ اور فقہاء، تابعین اور بعد کے علماء کے نزدیک مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا۔[1]

اہل کتاب مردوں کے ساتھ مسلمانوں کی عورتوں کا نکاح:

سورۃ البقرہ کی آیت ۲۲۱ ولا تنکحوا المشرکین حتیٰ یومنوا کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

مشرک مردوں کے ساتھ مومن خواتین کا نکاح نہ کرو۔[2]

حدیثِ مبارکہ میں بھی صراحت کے ساتھ مسلمان خاتون کی کتابی مرد سے نکاح کی ممانعت موجود ہے۔ بیہقی میں یہ روایت موجود ہے:

﴿قال رسول الله ﷺ: نتزوج نساء اهل الکتاب ولا یتزوجون نساءنا[3]﴾

"رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کرتے ہیں اور وہ ہماری عورتوں کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتے۔"

تفسیر طبری میں ہے:

---

[1] نووی، یحییٰ بن شرف، شرح نووی، ج2، ص 34، نور محمد اصح المطابع

[2]۔ ابن کثیر، حافظ اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۱، ص۲۹۷

[3]۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین، سنن کبریٰ، ج۷، ص۱۷۲

عکرمہ اور حسن بصری نے کہا کہ مسلمان عورتوں کو مشرک مردوں پر حرام فرما دیا گیا ہے۔ قتادہ اور زہری کہتے ہیں کہ تمہارے لیے ناجائز ہے کہ تم کسی مسلمان عورت کا کسی یہودی یا عیسائی سے نکاح کرو۔[1]

امام ابن ابی حاتم اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم کسی مسلمہ کا کسی بھی یہودی، عیسائی یا مشرک سے نکاح کرو جو تمہارے دین کو نہ مانتا ہو۔"[2]

نواب صدیق بن حسن بھوپالی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿اجمعت الامة علی ان المشرك لا یطأ المؤمنة[3]﴾

امت کا اجماع ہے کہ بے شک مشرک، مومن عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔

تفسیرِ ماجدی میں مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"یعنی ہر قسم کے کافر، قانونِ اسلام کا منکر جو کوئی جس قسم کا بھی ہو مومن خاتون اس کے نکاح میں نہیں جا سکتی ہے"۔[4]

غلام احمد پرویز مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

مسلمان مرد اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن مسلمان عورتیں اہلِ کتاب کے مردوں سے شادی نہیں کر سکتیں۔[5]

مولانا امین احسن اصلاحی سورۃ المائدہ، آیت ۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

[1]۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۳، ص ۷۱۸

[2]۔ ابن ابی حاتم، عبد الرحمٰن بن محمد بن ادریس، تفسیر القرآن العظیم، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۴۷ھ، ج ۲، ص ۳۹۹

[3]۔ نواب صدیق حسن خان بھوپالی، فتح البیان فی مقاصد القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰، ج ۱، ص ۳۱۰

[4]۔ عبد الماجد دریا آبادی، مولانا، تفسیر ماجدی، پاک کمپنی، لاہور، ص ۱۱۵

[5]۔ پرویز، غلام احمد، مطالب الفرقان، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۳، ج ۳، ص ۳۴۲

"یہی وجہ ہے کہ مسلمان مردوں کو تو کتابیات سے نکاح کی اجازت دی گئی لیکن مسلمان عورت کو کسی صورت میں بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی۔"[1]

بعض مفکرین، جیسا کہ ڈاکٹر شکیل اوج نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مسلمان عورت بھی کسی کتابی مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں قرآن ساکت ہے، جس نے اس مسئلے کو مجتہد فیہ کر دیا ہے، جو مثبت اور منفی، دونوں طرح سے قابل فہم ہو سکتا ہے، یعنی ضروریات زمانہ کے اقتضاء سے بھی کوئی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ بہر حال، ہمیں اس سکوت کا اثباتی پہلو (مشرک مرد سے جوازِ نکاح) زیادہ قرینِ صواب لگتا ہے۔[2]

ڈاکٹر شکیل اوج کی اس آزاد خیالی اور جمہور علماء و مفسرین سے جداگانہ تفسیر کا سب سے بہترین جواب علامہ غلام رسول سعیدی کی "تبیان القرآن" کے بعد شائع ہونے والی تفسیر "تبیان الفرقان" میں دیا گیا ہے۔ علامہ سعیدی لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ عزوجل نے چار محرمات کا ذکر فرمایا ہے: ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ﴾[3] ان چار چیزوں کے علاوہ باقی حرام چیزوں کے بیان کے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سکوت فرمایا ہے تو کیا کسی شخص کا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ چونکہ باقی حرام چیزوں کے بیان سے اللہ تعالیٰ نے سکوت فرمایا ہے تو ان میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور کسی حرام چیز کو کوئی مجتہد اپنے اجتہاد سے حلال قرار دے سکتا ہے۔ اور اگر اس کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے تو پھر ڈاکٹر شکیل اوج کا یہ کہنا کس طرح صحیح ہو گا کہ "گویا قرآن کے سکوت نے اس مسئلہ کو مجتہد فیہ کر دیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اگر اہل کتاب مردوں سے مسلم خواتین کا نکاح جائز ہوتا تو اللہ عزوجل اس جواز کی ضرور تصریح فرما دیتا اور اس پر سکوت نہ فرماتا کیونکہ حلال اور حرام کے مسئلہ

1۔ اصلاحی، مولانا امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۱۲ء، ج ۲، ص ۴۶۶

2۔ شکیل اوج، ڈاکٹر، نسائیات، کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۰

3۔ سورۃ البقرۃ ۲:۱۷۲

میں سکوت فرمانا اور اس کو ابہام میں رکھنا قرآن مجید کا اسلوب نہیں ہے، حدیث میں ہے: "الحلال بین والحرام بین" (حلال بھی غیر مبہم ہے اور حرام بھی غیر مبہم ہے)۔[1]

جبکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرک مردوں کے ساتھ مسلم خواتین کے نکاح کی مطلقاً ممانعت فرمادی ہے، ارشاد باری ہے: ولا تنکحوا المشرکین حتیٰ یومنوا۔"[2]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مفسرین اور علمائے اسلام کے صریح حوالہ جات سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہوا کہ مسلمان عورت کا کسی کتابی یا مشرک مرد کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے۔

اہلِ کتاب مرد و عورت سے نکاح کے جواز اور عدمِ جواز کے بعد ہم سیروگیسی (Surrogacy) یعنی عورت کا رحم کرائے پر حاصل کرنے کی بابت گفتگو کرتے ہیں:

کتابیہ وغیر کتابیہ کا رحم کرائے پر حاصل کرنا:

موجودہ دور میں نہ صرف مغربی ممالک بلکہ ترقی پذیر ممالک میں بھی اس کا چلن عام ہوتا جارہاہے۔ حالیہ عرصے میں نکاح وطلاق سے ماوراء، کسی دوسرے کی کوکھ سے بچے کی پیدائش ہونا عام ہورہا ہے۔ اس کی وجوہات میں آئی وی ایف جیسی تکنیکوں میں ہونے والی پیش رفت اور دیر سے بچے پیدا کرنے کا بڑھتا ہوا رجحان شامل ہیں۔ بی بی سی کے مطابق پچھلی دو دہائیوں میں عالمی سطح پر یہ رجحان بڑھا ہے۔ اس بارے حتمی اعداد وشمار تو میسر نہیں لیکن ۲۰۱۲ میں سروگیسی سے جڑی صنعت کا سالانہ حجم ۶ بلین ڈالر تھا۔ صرف برطانیہ میں سروگیسی کے ذریعے ہونے والی پیدائش کے بعد جاری کیے گئے ولدیت کے احکامات کی شرح ۲۰۱۱ میں ۱۲۱ سے ۲۰۱۸ میں ۳۶۸ تک، یعنی تین گنا بڑھ گئی ہے۔ سروگیسی کے ذریعے پیدا ہونے

---

[1]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرا الدینہ، رقم الحدیث: ۵۲

[2]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان الفرقان، ج ۱، ص ۴۹۴

والے بچوں کی اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے کیونکہ والدین اس قسم کے حکم نامے جارے کروانے کے پابند نہیں۔[1]

سروگیسی سے کیا مراد ہے؟

Surrogacy is an arrangement, often supported by a legal agreement, whereby a woman (the surrogate mother) agrees to bear a child for another person.

(سروگیسی ایک ایسانظام ہے۔جسے قانونی معاہدے کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کے تحت ایک عورت (سروگیٹ ماں) کسی دوسرے شخص یاافراد کے بچے کو پیدا کرنے پر راضی ہو جاتی ہے۔)[2]

سروگیسی کی ضرورت:

اس کی ضرورت مختلف حالات کی وجہ سے پیش آتی ہے، مثلاً یاتوخاوند کی بیوی بچے کو جنم نہیں دیناچاہتی کیونکہ اسے خوف ہے کہ بچے کی پیدائش سے اس کی خوبصورتی متاثر ہو جائے گی یاپھر اس کی بیوی صحت کے مسائل یا کمزوری کی وجہ سے بچے کو پیدا نہیں کرتی۔ایسے حالات میں کسی عورت کو پیسے دے کر اجرت پر لے کر اس کے رحم میں اسپرم (منی) کا بیضہ رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اس سے حاملہ ہو اور اس کے بچے کو جنم دے۔

Surrogates have made parenthood an option for people who might not be able to adopt a child, perhaps because of their age or marital status.[3]

---

[1] https://www.bbc.com/urdu/science-۴۸۰۶۷۲۰۲ accessed on ۱۳-۰۸-۲۰۲۰

[2] https://en.wikipedia.org/wiki/Surrogacy accessed on ۱۶-۰۸-۲۰۲۰

[3] https://www.webmd.com/infertility-and-reproduction/qa/who-uses-surrogates accessed on ۱۶-۰۸-۲۰۲۰

سروگیسی نے ان لوگوں کے لیے بھی والدین بننا ممکن بنادیا ہے جو شاید اپنی عمر یا ازدواجی حیثیت کی وجہ سے کوئی بچہ اختیار نہیں کرسکتے۔)

سروگیسی کا طریقہ کار:

آسان الفاظ میں، اگر ہم اس طریقہ کار کی وضاحت کریں تو اس علاج میں میڈیکل لیبارٹری میں خاوند اور بیوی کا بیضہ لے کر، اجرت پر لی گئی عورت کے رحم میں رکھا جاتا ہے۔ اس عمل میں مرد کا مادہ منویہ (اسپرم) اور اس کی بیوی کا بیضہ حاصل کرکے اسے کسی ایسی عورت کے رحم میں رکھا جاتا ہے جو اس کی بیوی نہ ہو اور ایسی عورت کو اجرت پر لیا جاتا ہے، پھر اس کے رحم میں وہ بیضہ رکھا جاتا ہے جس سے وہ عورت حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس عمل کو سروگیسی کہتے ہیں اور جس عورت کے رحم میں یہ عمل ہوتا ہے، اسے سروگیٹ ماں کہا جاتا ہے۔ اس سارے عمل کو سروگیسی بھی کہتے ہیں۔ سروگیسی دو طرح کی ہو سکتی ہے: جیسا کہ جسٹیشنل، جہاں سروگیٹ ماں کے رحم میں بیضہ (ایگ) اور نطفہ (اسپرم) داخل کیے جاتے ہیں، اور روایتی، جہاں سروگیٹ ماں کا اپنا بیضہ استعمال ہوتا ہے۔ سروگیسی خاص طور پر ان جوڑوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے جو قدرتی طور پر بچے پیدا نہیں کرسکتے۔[1]

اسلام میں سیروگیسی کا حکم:

سروگیسی کا یہ عمل قرآن و حدیث کی درج ذیل نصوص کی روشنی میں قطعا حرام و ناجائز ہے اور اخلاقاً بھی اسلام اسکی اجازت نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾[2]

---

[1] https://surrogate.com/about-surrogacy/types-of-surrogacy/what-is-gestational-surrogacy/ accessed on ۱۶-۰۸-۲۰۲۰

[2] ۔ سورۃ المؤمنون ۲۳:۷۔۵

(اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیبیوں یا شرعی باندیوں پر جو ان کے ہاتھ کی مِلک ہیں کہ اُن پر کوئی ملامت نہیں تو جو ان دو کے سوا کچھ اور چاہے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔)

اس آیت مبارکہ میں صریح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ شرمگاہ کے استعمال کی صرف دو صورتیں ہیں: ایک خاوند و بیوی کے درمیان اور دوسری ملکیت میں موجود لونڈی ہے۔ علامہ غلام رسول سعیدی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

اس جگہ ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں کے لیے جائز ہے کہ وہ بغیر نکاح کے جنسی عمل کریں کیا اسی طرح عورتوں کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ بغیر نکاح کے اپنے غلاموں سے جنسی عمل کرائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صریح فحشاء اور بے حیائی ہے اور قرآن مجید میں زنا اور بے حیائی کو سخت حرام فرمایا ہے۔[1]

واضح رہے کہ دنیا میں اب غلاموں اور لونڈیوں کا چلن ختم ہو چکا ہے اور یہی اسلام کا منشا تھا جو بتدریج وقوع پذیر ہوا۔ ہمیں اس آیت کریمہ کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سروگیسی میں ایک عورت کے رحم کو غیر مرد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جو کہ قرآن کے صریح خلاف ہے۔ یہاں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے تو شرمگاہ کا ذکر کیا ہے، رحم کا نہیں کہا۔ تو اس آیت سے استدلال کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ رحم شرمگاہ کے تابع ہے، یعنی رحم وہی استعمال کر سکتا ہے جسے شرمگاہ استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ تو جب کسی اجنبی مرد کو شرمگاہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں، تو رحم کی بھی اجازت نہیں ہو گی، کیونکہ رحم تابع ہے اور شرمگاہ متبوع۔ لہٰذا جو متبوع کا حکم ہو گا، وہی تابع کا ہو گا۔ متبوع (شرمگاہ) حرام ہے، تو تابع (رحم) بھی منطقی طور پر حرام

---

[1] ۔سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج ۷، ص ۸۵۵

ہو گا۔ حضور ﷺ نے آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے اس عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿عن رويفع بن ثابت الانصاري قال: قام فينا رسول الله ﷺ يقول يوم حنين قال: لا يحل لا مرى يومن بالله واليوم الاخر ان يسقى مآءه زرع غيره﴾[1]

حضرت رویفع سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسکے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا مادہ (اسپرم) کسی اور (اجنبی عورت) کی کھیتی (رحم/شرمگاہ) کو پلائے (یعنی اسکی شرمگاہ یا رحم کو استعمال کرے)۔

اس حدیث مبارکہ میں حضور اکرم ﷺ نے واضح فرمادیا کہ جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنا مادہ منویہ (اسپرم) کسی اور کی کھیتی یعنی رحم میں منتقل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا حرام فعل کرے گا تو وہ بے ایمان ہے۔ ابو داؤد، ترمذی اور ابنِ حبان کی روایت میں "ولد" کی جگہ "زرع" (کھیتی) آیا ہے۔ لفظ "زرع غیرہ" پر غور کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سروگیسی کا عمل قرآن و حدیث کے خلاف ہے۔ اس میں اختلاطِ انساب کا خطرہ بھی ہے۔ پھر جس اجنبی عورت کے رحم میں بچہ پرورش پائے گا، اس کی عادات و سکنات بھی کسی حد تک اس میں منتقل ہو سکتی ہیں۔ لہذا، یہ عمل کسی صورت میں جائز نہیں بلکہ زنا کے حکم میں آتا ہے۔ ذخیرہ تفاسیر میں ہمیں اس جدید مسئلے کے حوالے سے خاطر خواہ مواد نہیں مل سکا۔ تاہم، راقم کے نزدیک اگر مرد اس عورت سے نکاح کرلے جس کا رحم کرائے پر حاصل کرنا مقصود ہو، تو جواز کی صورت بن سکتی ہے۔ اپنی تائید میں ہم مفتی منیب الرحمٰن کا ایک فتویٰ نقل کرتے ہیں۔ آپ سے پوچھا گیا: "اگر شوہر کا مادہ تولید غیر معروف طریقے سے

---

[1]۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، کتاب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یشتری الجاریۃ وھی حامل، رقم الحدیث: ۱۱۳۱

عورت کے جسم میں رکھ دیا جائے تو کیا اس طریقے سے اولاد کے لیے کوشش کرنا جائز ہے؟"

آپ نے جواب میں لکھا:

> "جہاں تک کسی عورت کے رحم میں اس کے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد کا مادہ منویہ یعنی تولیدی جرثومہ (Sperms) انجکشن یا کسی بھی مصنوعی طریقے سے پہنچانے کا تعلق ہے تو یہ از روئے حدیث ممنوع اور حرام ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تمہیں وہ حدیث بیان کر رہا ہوں جو میں نے حنین کے دن رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی، آپ نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا پانی غیر کی کھیتی میں ڈالے۔[1]

البتہ سوال میں جس صورت مسئلہ کا حکم دریافت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کمزوری یا نقص کے سبب شوہر اپنے مادہ منویہ کو عملِ تزویج کے ذریعے بیوی کے رحم میں پہنچانے پر قادر نہیں ہے اور بعض اوقات بیوی کے رحم کی ساخت میں کسی نقص اور خرابی کے باعث اس میں شوہر کا مادہ منویہ پہنچ نہیں پاتا۔ ان دونوں صورتوں میں شرعاً مرد کا مادہ منویہ (یعنی تولیدی جرثومہ) مصنوعی طریقے سے اس کی اپنی بیوی کے رحم میں پہنچانا جائز ہے، البتہ شرعی احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ بیوی کے رحم میں اس کے شوہر کا تولیدی جرثومہ پہنچانے کے لئے لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ عورت کی فرج کو غیر مرد کے سامنے کھولنا حرام ہے۔ اگر اس عمل سے بانقدیر الٰہی بچہ پیدا ہو جائے تو وہ صحیح النسب اور ثابت النسب ہو گا۔ سائنسی اور طبی اعتبار سے تو اس عمل کا امکان اور وقوع بیسویں صدی کے آخر میں ظاہر ہوا۔ علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحات ۹۳۵ تا ۹۴۸ ٹیسٹ

---

[1] ۔ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، کتاب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یشتری الجاریۃ وھی حامل، رقم الحدیث: ۱۱۳۱

ٹیوب بے بی اور مصنوعی تولید کے عنوان کے تحت اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: فقہاء اسلام نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ بغیر مجامعت کے مرد کے پانی کو عورت کی اندامِ نہانی میں پہنچا دیا جائے، جس سے عورت حاملہ ہو جائے۔ یہ عمل اگرچہ نادر ہے لیکن اس سے نسب ثابت ہو جائے گا اور یہ بعینہٖ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا جزئیہ ہے اللہ تعالیٰ ہمارے فقہاء پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، جنہوں نے اب سے کئی سو برس پہلے ایسے اصول اور قواعد بیان کر دیے جس سے کئی سو برس بعد پیش آنے والے مسائل حل ہو گئے۔"[1]

سروگیسی میں مرد اور عورت سے ثبوتِ نسب کا حکم:

مفتی تقی عثمانی کے پاس مولانا مفتی عبد الواحد نے اپنی چند تحقیقات بھیجیں، جن میں یہ موقف اختیار کیا کہ اگر میاں بیوی کا مخلوط نطفہ کسی اور عورت کے رحم میں رکھا جائے تو نطفے والا مرد اس بچے کا باپ اور نطفہ والی عورت (بیوی) اور جس عورت کے رحم میں وہ نطفہ رکھا گیا، دونوں اس بچے کی مائیں ہوں گی۔[2]

مفتی تقی عثمانی کو درج بالا موقف سے اختلاف تھا جس پر انہوں نے مفتی عبد الواحد سے طویل خط و کتابت کی، مفتی تقی عثمانی کا موقف یہ ہے کہ جس عورت کے رحم میں بچہ پرورش پا کر دنیا میں آتا ہے وہی اس کی ماں کہلائے گی۔ مفتی تقی لکھتے ہیں کہ آج سے تقریباً سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے میں نے امریکی رسالے Times میں ایک مضمون پڑھا تھا کہ امریکی عدالتوں میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ قانوناً ماں "صاحبۃ الرحم" کو کہا جائے یا "صاحبۃ النطفہ" کو۔ صاحبۃ الرحم نے بچہ اپنا ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ مقدمہ جیت گئی تھی۔ اگر یہ لادینی عدالتیں، جن کے فیصلے صرف طبی اور عقلی تحقیق پر مبنی

---

[1] ۔ منیب الرحمٰن، مفتی، پروفیسر، تفہیم المسائل، ج ۲، ص ۳۵۵-۳۵۶

[2] ۔ تقی عثمانی، مفتی، فتاویٰ عثمانی، ترتیب و تخریج: محمد زبیر حق نواز، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۱۴۳۸ھ، کتاب الطب والتداوی، ص ۲۸۴-۲۸۵

ہوتے ہیں، جن کا شرعی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں، وہ "صاحبۃ الرحم" کو ماں قرار دیں تو "اصحاب النصوص الشرعیۃ" کو بطریق اولیٰ یہی کرنا چاہیے۔ بالخصوص جب اس مسئلے میں شدید فتنوں کا سنگین خطرہ موجود ہو، جیسا کہ احقر پہلے عرض کر چکا ہے۔ بے شک بچے کا اثباتِ نسب ایک اہم مسئلہ ہے، لیکن جہاں شرعی حدود میں اس کی گنجائش نہ ہو، وہاں کھینچ تان کر ایک کھلے امر غیر مشروع کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کو ثابت النسب کہنا احقر کو بہت سنگین معلوم ہوتا ہے۔ تاہم چونکہ مسئلہ نیا ہے اور اس کا صریح حکم فقہ کی کتابوں میں ملنے کی امید بھی نہیں ہے۔"[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سیروگیسی کا عمل قرآن و حدیث کے صریح خلاف ہے۔ اس میں نسب کے اختلاط کا خدشہ ہے، اور جس اجنبی عورت کے رحم میں وہ بچہ پرورش پائے گا، اس کی عادات واطوار بھی کسی حد تک بچے میں منتقل ہو سکتی ہیں لہٰذا یہ عمل کسی بھی صورت میں جائز نہیں بلکہ زنا کے حکم میں آتا ہے۔ ذخیرہ تفاسیر میں ہمیں اس جدید مسئلے کے حوالے سے خاطر خواہ مواد نہیں مل سکا۔ البتہ راقم کے نزدیک مرد اگر اس عورت سے نکاح کر لے جس کا رحم کرائے پر حاصل کرنا مقصود ہو تو جواز کی صورت بن سکتی ہے۔ اس صورت میں نطفے والا مرد اس بچے کا باپ اور نطفہ والی عورت اور جس عورت کے رحم میں وہ نطفہ رکھا گیا وہ دونوں اس کی مائیں ہوں گی۔

مسلم اقلیات اور طلاق:

اسلام کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ رشتۂ نکاح میں منسلک ہو جائیں، ان کے نکاح کو قائم رکھنے کے لیے حتی الامکان کوشش کی جائے۔ اگر کبھی ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو رشتہ دار اس اختلاف کو دور کر کے ان کے درمیان صلح کرائیں۔ اگر صلح نہ ہو سکے اور یہ اندیشہ ہو کہ فریقین نکاح کے بندھن میں رہتے ہوئے حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، تو اس صورت

[1] ۔ تقی عثمانی، مفتی، فتاویٰ عثمانی، ترتیب و تخریج: محمد زبیر حق نواز، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۱۴۳۸ھ، ج۴، ص۳۱۶

میں شوہر کو طلاق دینے سے نہ روکا جائے۔ طلاق کے علاوہ نکاح کو فسخ کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ عورت شوہر کو کچھ دے کر خلع حاصل کرے، جبکہ تیسری صورت یہ ہے کہ مسلمان قاضی زوجین کے درمیان تفریق کر دے۔ شریعتِ اسلامیہ میں طلاق کا اختیار مرد کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيۡضَةً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ ‌ؕ وَ اَنۡ تَعۡفُوۡٓا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى‌ ؕ وَ لَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ﴾[1]

"اور اگر تم نے عورتوں کو بے چھوئے طلاق دے دی اور ان کے لیے کچھ مہر مقرر کر چکے تھے تو جتنا ٹھہرا تھا اس کا آدھا واجب ہے مگر یہ کہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں یا وہ زیادہ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور اے مردو! تمہارا زیادہ دینا پرہیز گاری سے نزدیک تر ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کو بھلا نہ دو بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔"

مرد کو طلاق کا اختیار دینے کی چند وجوہات ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱: عورت فطری طور پر زیادہ جذباتی اور مغلوب الغضب ہوتی ہے یعنی اسے جلد غصہ آ جاتا ہے۔ اگر طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں ہو تو طلاق کی شرح دو چند ہو سکتی ہے۔

۲: دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد اپنے مال سے زوجیت کے حقوق حاصل کرتا ہے، اس لیے ان حقوق سے دستبردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے۔

طلاق کا اختیار مرد کو دینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ طلاق کے وقوع میں عورت کا کوئی کردار نہیں، بلکہ عورت کو خلع کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگر عورت کو شوہر کی صورت و سیرت پسند نہ ہو یا

---

[1]۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۳۷

شوہر اس پر ظلم کرتا ہو، تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عدالت سے رجوع کرے۔ عدالت تحقیق کے بعد نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی نوجوان عورت کا خاوند پاگل ہو جائے، نا قابلِ علاج بیماری میں مبتلا ہو، لمبی مدت کے لیے سزا یافتہ ہو یا لا پتہ ہو جائے، تو ان تمام صورتوں میں عورت کو تنسیخِ نکاح کا حق حاصل ہے۔ ان تمام صورتوں کو ہم تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

نکاح فسخ کرنے کے وجوہات:

چند ایسی صورتیں ہیں جن میں قاضی، عورت کے مطالبے پر میاں بیوی کے درمیان تفریق کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم خلاصہ ذکر کرنے کے بعد اس کے دلائل ذکر کریں گے۔ فسخِ نکاح کی صورتیں درج ذیل ہیں۔

۱: اگر کوئی شخص افلاس کی وجہ سے بیوی کو خرچ نہیں دیتا اور طلاق دینے سے بھی انکار کرتا ہے تو عورت فسخِ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے اور قاضی کو تفریق کا حق حاصل ہے۔

۲: اگر کسی عورت کا شوہر گم ہو جائے اور عورت کے گزارے کے لیے نفقہ نہ ہو، تو عورت کے مطالبے پر قاضی فوری طور پر تفریق کر سکتا ہے۔

۳: اگر شادی کے بعد شوہر کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس سے صحت یابی کی امید نہ ہو اور عورت کے لیے آمدن کا کوئی ذریعہ نہ ہو، تو قاضی تفریق کر سکتا ہے۔

۴: اگر شوہر کو لمبی مدت کے لیے سزا ہو جائے اور عورت کے لیے حفاظت اور خرچ کا کوئی انتظام نہ ہو تو عورت تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

۵: اگر شوہر مالدار ہو، لیکن تنگ کرنے کے لیے بیوی کو خرچ نہ دیتا ہو اور طلاق بھی نہ دیتا ہو، تو قاضی شوہر کی طرف سے طلاق دے سکتا ہے۔

۶: اگر شوہر عورت پر ظلم کرتا ہو اور بلا وجہ مار پیٹ کرتا ہو تو عورت کے مطالبے پر قاضی تفریق کر سکتا ہے۔

۷: اگر میاں بیوی کے درمیان اختلافات پیدا ہو جائیں اور صلح کی امید باقی نہ رہے، تو دو حکم مقرر کیے جائیں اور وہ اپنی صوابدید پر زوجین کے درمیان تفریق کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

قرآن سے دلیل:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا[1]﴾

(اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور ان کی میعاد آنے لگے تو اس وقت تک یا بھلائی کے ساتھ روک لو یا اچھے طریقے کے ساتھ چھوڑ دو اور انہیں ضرر دینے کے لیے مت روکو!)

علامہ محمد بن احمد قرطبی لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں عرف کے مطابق عورتوں کو نکاح میں روکنے کا حکم دیا ہے۔ عرف کے مطابق رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ شوہر اس کو کھانے پینے کا خرچ دے۔ اگر یہ نہیں دے سکتا تو پھر اس کو طلاق دے۔ اگر وہ طلاق نہیں دیتا تو اب وہ عورت کو عرف کے مطابق رکھنے سے خارج ہو گیا۔ اب حاکم اس عورت پر طلاق کو واقع کر دے گا تاکہ خاوند کی طرف سے خرچ نہ ملنے کی وجہ سے عورت کو ضرر نہ ہو کیونکہ بھوک اور پیاس پر کوئی صبر نہیں ہو سکتا کثیر علماء کا یہی مذہب ہے۔"[2]

اس کے بر خلاف امام ابو حنیفہ کا یہ قول یہ ہے کہ جب خاوند خرچ نہ دے تو عورت پر صبر لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

1۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۳۱

2۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج ۳، ص ۱۴۷-۱۴۸

﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ[1]﴾

(اور تم اپنے غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا نکاح کرو اور اپنے نیک غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کرو اگر وہ فقراء ہیں تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فقراء کو نکاح کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے فقر نکاح کے خاتمے کا سبب نہیں بن سکتا۔ نیز، شوہر اور بیوی کے درمیان نکاح منعقد ہو چکا ہے اور اب یہ نکاح یا تو اجماع کے ذریعے منسوخ ہو گا یا رسول اللہ ﷺ کی ایسی حدیث کے ذریعے، جس کا کوئی معارض نہ ہو۔ جمہور ائمہ کی دلیل اس حدیث مبارکہ سے ہے:

﴿عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال النبي ﷺ: أفضل الصدقة ما ترك غنًى، واليَد العُليا خيرٌ من اليد السُّفلى، وابدأ بمن تعول تقول المرأة: أما أن تُطعِمني وأما أن تُطلِّقني. ويقول العبد: أطعِمني واستعمِلني ويقول الابن: أطعِمني إلى من تدَعُني؟[2]﴾

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: افضل صدقہ وہ ہے جس کے بعد خوشحالی ہو اور اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اپنے عیال سے خرچ کی ابتداء کرو! عورت کہے گی مجھے کھلاؤ یا مجھے طلاق دو! غلام کہے گا مجھے کھلاؤ اور مجھ سے کام لو! بیٹا کہے گا مجھے کھلاؤ! (یا بتاؤ) مجھے کس پر چھوڑتے ہو۔"

1۔ سورۃ النور ۲۴:۳۲

2۔ بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب وجوب النفقۃ علی الاھل والعیال، رقم الحدیث:۵۳۵۵

امام قرطبی لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ صراحت ہے کہ بیوی کو خرچ دیا جائے ورنہ اس کو طلاق دی جائے۔ یہ ائمہ ثلاثہ، امام شافعی، امام احمد، امام مالک کے موقف پر قوی دلیل ہے۔[1]

قرآن پاک کی مذکورہ آیت کریمہ اور امام قرطبی کی بیان کردہ تفسیر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی صورت میں عورت کو ضرر ہو، تو وہ تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ ماقبل ذکر کی گئی سات صورتوں میں عورت کو ضرر پہنچنا واضح ہے، لہٰذا ان تمام صورتوں میں اگر عورت مسلمان قاضی کے پاس جا کر تفریق کا مطالبہ کرے اور قاضی تفریق کر دے، تو ان کے درمیان علیحدگی واقع ہو جائے گی۔

قاضی کا مسلمان ہونا:

تفریق کے لئے ضروری ہے کہ قاضی مسلمان ہو کیونکہ غیر مسلم کو قاضی بنانا جائز نہیں ہے اور اس کا فیصلہ نافذ العمل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾[2]

(اور اللہ کافروں کو مسلمانوں پر کوئی راہ نہ دے گا۔)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر کی گواہی مسلمان کے خلاف قبول نہیں تو جب کافر کی گواہی قبول نہیں تو پھر قضاء جو کہ گواہی سے بھی اعلیٰ ہے وہ مسلمان کے خلاف کیسے قبول ہو گی اور کس طرح غیر مسلم کو قاضی بنانا جائز ہو گا۔[3]

علامہ کاسانی مزید فرماتے ہیں۔ قاضی کے لئے سات شرائط ہیں۔

۱: عقل ۲: بلوغ، ۳: اسلام ۴: علم حدیث ۵: بصر

[1] قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج۴، ص ۱۰۱-۹۹

[2] ۔ سورۃ النساء ۴:۱۴۱

[3] ۔ کاسانی علاء الدین، ابو بکر بن مسعود کاسانی، بدائع الصنائع، ج۷، ص ۳

۶: ناطق ہو گونگا نہ ہو۔ ۷: اس پر حد قذف نہ لگی ہو۔

لہٰذا، مجنون، بچہ، کافر، غلام، اندھا، گونگا، اور وہ شخص جس پر تہمت لگانے کی وجہ سے حد قذف لگی ہو، اس کو قاضی مقرر کرنا جائز نہیں کیونکہ قاضی ایک عظیم ولی ہوتا ہے اور اس کے تصرف میں ایک علاقے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جس میں یہ شرائط نہ پائی جائیں، وہ شہادت کے لیے بھی اہل نہیں ہوتا، تو پھر قضاء کا اہل کیسے ہو سکتا ہے؟ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام صورتوں میں عورت تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے اور عدالت جا سکتی ہے، مگر جس قاضی کے پاس جائے، ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہو تاکہ اس کا فیصلہ نافذ العمل ہو سکے۔

غیر مسلم قاضی (جسٹس) کا فیصلہ:

مذکورہ بالا بحث اسلامی ممالک میں تو نافذ العمل ہو گی، لیکن جو مسلمان دار الکفر میں سکونت پذیر ہیں، وہاں چونکہ قاضی غیر مسلم ہوتے ہیں، تو وہاں عورت اپنا نکاح کس طرح فسخ کروائے گی؟ ہم نے ماقبل بیان کیا تھا کہ قاضی کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے، اور دار الکفر میں قاضی غیر مسلم ہوتا ہے تو جو مسلم اقلیات، غیر مسلم ممالک میں رہتی ہیں، ان کے لیے غیر مسلم قاضی سے فیصلہ کروانا اس وقت جائز ہو گا جب درج ذیل شرائط پائی جائیں:

۱: عورت کے لئے اپنے خاوند سے جان چھڑانے کا صرف یہی حل ہو۔

۲: دل میں کراہت رکھے اور صرف اپنا حق وصول کرنے کے لئے جائے۔

۳: صرف اپنا حق وصول کرنے پر اکتفاء کرے اور شریعت سے متصادم حکم کو نہ مانے۔

جب یہ جملہ شرائط اور فسخ نکاح کی شرائط بھی پائی جائیں تو عورت غیر مسلم قاضی کے پاس جا کر اپنا نکاح فسخ کروا سکتی ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾[1]

---

[1] ۔ سورۃ البقرہ ۲:۱۷۳

(پس جو شخص مجبور ہو جائے جبکہ وہ نافرمانی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔)

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے انیسویں سیمینار میں غیر مسلم ممالک میں عدالت کے ذریعہ حاصل کردہ طلاق کے لئے درج ذیل تجاویز پیش کیں:

۱۔ غیر مسلم ممالک کی عدالت کا جج اگر مسلمان ہو اور وہ فیصلہ کرتے وقت شرعی ضوابط کو مدنظر رکھے، تو اسے مسلم حاکم کے قائم مقام تسلیم کیا جائے گا اور فسخِ نکاح کے سلسلے میں اس کا فیصلہ معتبر ہوگا۔

۲۔ جن غیر مسلم ممالک میں حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے لیے شرعی اصولوں کے مطابق قضاء کا نظام قائم نہیں ہے۔ وہاں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ ارباب حل و عقد کے مشورے سے دار القضاء، شرعی پنچایت یا ان جیسے ادارے قائم کریں اور اپنے نزاعات و معاملات میں ان ہی کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ طلاق چونکہ "ابغض المباحات" ہے، اس لیے اسے اختیار کرنے سے پہلے پوری مصالحت اور نباہ کی صورت نکالنی چاہیے اور حتی الامکان طلاق و خلع سے بچنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

۴۔ غیر مسلم ممالک کی عدالت میں شوہر قانونی مجبوری کے تحت غیر مسلم جج کو درخواست دیتا ہے کہ میرا رشتہ نکاح ختم کر دیا جائے اور جج تفریق کا فیصلہ کرتا ہے تو جج کے اس فیصلۂ تفریق کو طلاقِ بائن مانا جائے گا۔ البتہ بہتر ہے کہ عدالت کے فیصلہ کے بعد شوہر اپنی زبان سے بھی طلاق کے الفاظ کہہ دے۔

۵۔ اگر غیر مسلم ممالک کی عدالت میں، غیر مسلم جج کے سامنے، عورت رشتہ ازدواج ختم کرنے کے لئے درخواست دیتی ہے اور غیر مسلم جج اس کی درخواست پر شوہر کی اجازت سے تفریق کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ فیصلہ معتبر ہوگا۔ ورنہ یہ تفریق شرعاً معتبر نہیں ہوگی ایسی صورت میں عورت یا تو شوہر سے خلع حاصل کرے یا دار القضاء کی شرعی پنچایت کے ذریعہ

نکاح فسخ کرائے۔[1] یورپی کونسل برائے افتاء و تحقیق کے مطابق جب غیر مسلم ملک کے قوانین کے مطابق نکاح ہو تو فسخ نکاح بھی غیر مسلم جج کے ذریعہ درست تسلیم کیا جائے گا۔[2]

زوجہ کا قبولِ اسلام اور فسخِ نکاح:

غیر اسلامی ممالک میں خواتین کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ تو اسلام قبول کر لیتی ہیں جبکہ ان کے خاوند اسلام قبول نہیں کرتے۔ غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتوں کے لئے یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اسلام میں یہ حکم واضح ہے کہ عورت کے قبولِ اسلام کے بعد اس کا نکاح ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾[3]

(نہ یہ انہیں حلال نہ وہ انہیں حلال۔)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مسلمان عورت دار الحرب سے جیسے ہی ہجرت کرتی ہے تو وہ ساتھ ہی خاوند سے جدا ہو جاتی ہے جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک جب وہ اسلام قبول کرتی ہے اس کے بعد جب اسے تین حیض آجاتے ہیں تو وہ خاوند سے جدا ہو جاتی ہے اس میں شرط یہ ہے کہ خاوند نے اس سے دخول کیا ہو۔ اگر دخول نہ کیا ہو تو جیسے ہی اسلام قبول کر لیتی ہے، خاوند سے جدا ہو جاتی ہے اور تجدید نکاح سے بھی وہ ایک دوسرے کے لئے حلال نہیں ہوتے کیونکہ کافر کا مسلمان عورت کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔[4]

بخاری میں حضرت ابن عباس کا یہ قول موجود ہے:

---

[1] ۔ غیر مسلم ممالک میں عورتوں کی طلاق، مجموعہ مقالات، انیسواں سیمینار، ۲۰۲۰، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، ایفاء پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۴

[2] ۔ محمد فہیم اختر ندوی، غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کے مسائل، در مشمولہ: اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقاء اور عمل صورتیں، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۵۴۳-۵۴۷

[3] ۔ سورۃ الممتحنہ ۶۰:۱۰

[4] ۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۹، ص ۲۷۳

﴿عن ابن عباس:اذا اسلمت النصرانیة قبل زوجها بساعة حرمت علیه﴾[1]

جب ایک عیسائی عورت اپنے خاوند سے ایک گھڑی پہلے بھی اسلام قبول کرلے تو وہ عورت اس مرد پر حرام ہوگی۔

علامہ ابن قیم نے مذکورہ مسئلے میں نو اقوال بیان کیے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ کتابیہ یا غیر کتابیہ عورت اسلام قبول کرنے کے ساتھ ہی غیر مسلم شوہر کے عقد سے نکل جاتی ہے۔ یہ رائے کثیر تعداد میں تابعین کی ہے۔

۲۔ اگر زوجین دار السلام میں ہوں اور کوئی ایک اسلام قبول کرلے، تو دوسرے کو اسلام کی طرف بلایا جائے گا۔ اگر وہ اسلام قبول کرلے تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ زوجین میں تفریق ہو جائے گی۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ کا قول ہے۔

۳۔ اگر اسلام قبول کرنے والی عورت مدخولہ ہو، تو عدت کے ختم ہونے تک یہ دیکھا جائے گا کہ شوہر نے اسلام قبول کیا ہے یا نہیں۔ اگر شوہر نے اسلام قبول کرلیا ہو تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ عورت بائنہ ہو جائے گی۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

۴۔ زوجہ کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں علیحدگی واقع ہو جائے گی اور اگر زوجہ سے پہلے شوہر اسلام قبول کرلے تو عدت کے ختم ہونے تک زوجین کا نکاح باقی رہے گا۔

۵۔ امام اوزاعی، امام ابو اللیث، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے مطابق عدت کا اعتبار کیا جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی زوجین عدت کے ختم ہونے سے پہلے اسلام قبول کرلیں تو نکاح برقرار رہے گا، لیکن اگر دونوں میں سے صرف ایک اسلام قبول کرلے تو نکاح فوراً ختم ہو جائے گا کیونکہ اسلام میں غیر مسلم مرد و عورت کا نکاح مسلم سے جائز نہیں۔

[1]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب اذا اسلمت المشرکۃ او النصرانیۃ تحت الذمی او الحربی، رقم الباب: ۲۰

۶۔ حضرت عمر فاروق کے دور میں ایک نصرانی عورت نے اسلام قبول کیا، تو حضرت فاروق نے اسے اختیار دیا کہ وہ چاہے تو شوہر سے علیحدگی اختیار کرلے اور چاہے تو اس کے ساتھ زندگی گزارے۔

چھٹے قول کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام قبول کرنے والی عورت اپنے عیسائی شوہر کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہے گی، بلکہ وہ انتظار کرے گی کہ اس کا شوہر اسلام قبول کرلے، اگرچہ اسے برسوں انتظار کرنا پڑے۔ یہ چھٹا قول صحیح ترین مسئلہ ہے اور سنت رسول ﷺ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۷۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب تک مسلم بیوی شوہر نہ چھوڑے غیر مسلم شوہر ہی اس کا حق دار ہے۔

۸۔ اگر زوجہ اسلام قبول کرلے اور شوہر اسلام قبول نہ کرے، تو دونوں کا نکاح اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک سلطان تفریق نہ کروادے۔ یہ امام زہری کا قول ہے۔

۹۔ ابراہیم نخعی اور حماد بن ابی سلیمان کی رائے کے مطابق، اگر ذمی شوہر کی بیوی اسلام قبول کرلے اور وہ خود اسلام قبول نہ کرے، تو بیوی اس کے ساتھ ہی رہے گی، لیکن شوہر کو حقِ زوجیت حاصل نہیں ہو گا۔[1]

ممتاز محقق علامہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے امام ابن قیم کے درج بالا نو اقوال کا تجزیہ کرنے کے بعد تین اقوال کو معتبر قرار دیا ہے۔

۱۔ **قول علی:** جب تک مسلم بیوی، شوہر نہ چھوڑے غیر مسلم شوہر ہی اس کا حق دار ہے۔

۲۔ **قول عمر:** عورت کو اختیار ہے کہ وہ غیر مسلم شوہر کے ساتھ رہے یا علیحدگی اختیار کرلے۔

۳۔ **قول زہری:** اگر زوجہ اسلام قبول کرلے اور شوہر اسلام قبول نہ کرے تو دونوں کا نکاح اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک سلطان تفریق نہ کرادے۔

---

[1]۔ ابن قیم، محمد بن ابو بکر احکام اہل الذمہ، ج ۱، ص ۳۱۷

مذکورہ تین اقوال میں سے علامہ قرضاوی نے حضرت علی کے قول کو ترجیح دی ہے۔ ان کے مطابق، کسی ایک فریق کے اسلام قبول کرنے سے نکاح باقی نہیں رہتا۔ جہاں تک سورۃ ممتحنہ کی آیت ۱۰ کا تعلق ہے، تو یہ آیت مسلم خاتون اور حربی شوہر، یا مسلمان مرد اور اس کی حربی بیوی کے درمیان تعلق منقطع کرنے سے متعلق ہے۔ اس کا عمومی طور پر تمام کفار سے تعلق نہیں ہے۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی نے نومسلمہ کو غیر مسلم مرد کے ساتھ رہنے کا اختیار دیا ہے۔ علامہ ابن قیم اور ڈاکٹر قرضاوی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بسنے والی مسلم اقلیتیں جو اہل کتاب کے درمیان رہتی ہیں اور اس مرحلے سے متاثر ہوتی ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ مسئلے کی نوعیت سے کماحقہ آگاہ ہوں۔ کیونکہ کسی بھی فیصلے کی صورت میں معاشی و سماجی مشکلات کا مقابلہ انہیں ہی کرنا ہوگا۔ ہماری رائے میں نومسلم خواتین کو مقامی مسلم محققین سے مشاورت کے بعد ہی کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے تاکہ کسی بھی فیصلے کی صورت میں اطمینانِ قلب کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

[1]۔ قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، فقہ الاقلیات، فقہ الاقلیات المسلمہ، دار الشروق، القاہرہ، ۲۰۰۱، ص ۱۲۴-۱۲۵

تہذیب وثقافت سے متعلق معاشرتی مسائل اوران کا حل

دین اسلام ایک مکمل و اکمل طریقہ زندگی ہے۔اس کا نظامِ فکر و عمل ہر عہد کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ہر پہلو کے لیئے قابل عمل ہے۔دین اسلام کی روشن تعلیمات کا پیروکاراس امر کا پابند ہے کہ اپنی جملہ خواہشات اور اپنے جذبات کو اللہ کے احکام کے سپرد کر دے اور تکمیلِ خواہش کے لئے وہی راہ اپنائے جس کا دین میں تعین کر دیا گیا ہے۔ارشادباری تعالیٰ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾[1]

(اے ایمان والو اسلام میں پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اسلام میں کلی طور پر داخل ہو جاؤ اس کے ساتھ کسی اور کا اختلاط نہ کرو یا پھر اسلام کے قبیلہ میں داخل ہو جاؤ اور اس کے مکمل احکام کو اپنالو اور اس میں سے کسی بھی شے کو نہ چھوڑو۔"[2]

درج بالا آیت سے واضح ہوا کہ اسلامی تعلیمات مسلمان کی ساری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔یہ زندگی کے ہر فکری، عملی، تہذیبی اور ثقافتی پہلو کے لیے راہنما اصول فراہم کرتی ہیں۔

اسلام کی تعلیمات جو کہ تہذیب و ثقافت یعنی طرزِ معاشرت کی آئینہ دار ہیں، نہ صرف معاشرتی زندگی کے پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتی ہیں، بلکہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک مکمل اور

1۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۰۸

2۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۱، ص۳۶۹

جامع تصور بھی پیش کرتی ہیں، جس میں حضرتِ انسان کی فکر و عمل کے ہر پہلو کی اصلاح کا بھرپور اہتمام کیا جاتا ہے۔ اولاً ہم تہذیب و ثقافت کے معنی و مفہوم کو واضح کرتے ہیں:

تہذیب کا معنی و مفہوم:

تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ "ہ، ذ، ب" ہے، جس کے معنی ہیں: صاف کرنا، درست کرنا، پودوں اور درختوں کی شاخیں تراشنا، اور اصلاح کرنا۔[1]

ابن منظور افریقی، تہذیب کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تہذیب، پاکیزہ اور خالص کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ کہا جاتا ہے هذب الشی، یعنی اس نے شے کو خالص کر دیا۔ اسی طرح مهذب من الرجال سے مراد ایسا شخص جو عیوب سے پاک ہے۔[2]

ثقافت کا معنی و مفہوم:

ثقافت، عربی لفظ "ثقف" سے نکلا ہے۔ "ثقف" کے معنی عقلمندی، مہارت کے ہیں۔[3]

قرآن مجید میں یہ غلبہ پانے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ﴾

(تو جب کبھی تو لڑائی میں ان پر غالب آجائے انہیں ایسی مار مار کہ ان کے پچھلے بھی بھاگ کھڑے ہوں۔)

تہذیب اور کلچر:

انگریزی میں تہذیب کا مترادف لفظ کلچر (Culture) ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ ابتداء میں صرف کاشت کاری کے لیے استعمال ہوتا تھا، چنانچہ سترھویں صدی تک یہ لفظ درختوں کی نشو و نما اور کاشت کاری کے لئے ہی استعمال ہوتا رہا۔[4]

1۔ لویس معلوف، المنجد، مطبعہ کاثولیکیہ، مصر، ۱۹۴۷، ص ۹۴۵

2۔ ابن منظور الافریقی، لسان العرب، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ج ۹، ص ۴۸-۴۹

3۔ ایضاً، ج ۲، ص ۳۱

4۔ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری، آکسفرڈ ۱۹۷۸، ج ۲، ص ۱۲۴۷

چارلز گرے اپنی معرکہ آراء تصنیف، ٹرینڈز آف سیویلائزیشن اینڈ کلچر میں لکھتا ہے:

> The confusion in the use of the term culture is that which arises when it is closely associated with civilization, so closely associated as to be identified with it. The term when it is used in its most general sense is often made to include both culture and civilization.[1]

> کلچر کی وضاحت کرنا اس وقت مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تہذیب کے ساتھ اس کا گہرا ربط پایا جائے۔ کیونکہ اسے تہذیب کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ البتہ کلچر کی اصطلاح کو عمومی معنی میں استعمال کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تہذیب وثقافت دونوں شامل ہیں۔

مرورِ زمانہ کے ساتھ کلچر کے مفہوم میں تبدیلی واقع ہوئی اور یہ لفظ تربیتِ انسان کے لئے استعمال ہونے لگا، بعد ازاں اس لفظِ تہذیب نے وہ معنی اختیار کر لیئے جو آج کلچر سے مراد لیے جاتے ہیں۔ مشہور مغربی مفکر سائمن مرڈن لکھتا ہے کہ کلچر ہمیں مدد دیتا ہے کہ ہم جان سکیں کہ لوگ ایک مخصوص طرز عمل کا اظہار کیوں کرتے ہیں اور ان میں کیا مشابہتیں اور اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دنیا مختلف آبادیوں میں تقسیم ہے اور متعلق اور غیر متعلق کی تقسیم کرنا وہ ضروری کام ہے جو ثقافتی تجزیہ سے کیا جاسکتا ہے"۔[2]

تہذیب وثقافت کا آغاز:

بدیہی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تہذیب کا نقطۂ آغاز اسی وقت ہو گیا تھا جب دو انسان پہلی بار آپس میں ملے، دو انسانوں کا آپس میں ملنا ایک سماجی عمل کہلاتا ہے، اور یہی سماجی عمل تہذیب کے آغاز کا سبب بنتا ہے۔ بدیہی طور پر یہ بھی واضح ہے کہ انسانوں کا مل جل کر رہنے

---

[1] Charles Gray Shaw, Trends of civilization and culture, American book,۱۹۳۲, p۷۵

[2] Simon Murden, Culture in world affairs in john baylis & steve smith's the globalization of world politics, (Oxford University Press, ۲۰۰۸, ۴th edition p۴۵۷

کا نام سماج ہے، جبکہ تہذیب ایک ایسے نظریے کا نام ہے جس پر عمل کرتے ہوئے انسان اپنی زندگی کو مہذب، باوقار، اور بااخلاق انداز میں گزارتا ہے۔ تہذیب دراصل انسانوں کے لیے بنائے گئے بہترین اعمال کی تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کا عمل ہے، اور فطرت کی بہترین تراش خراش بھی تہذیب و ثقافت کے دائرے میں شامل ہوتی ہے۔ دو بنیادی چیزیں ہیں جن پر تہذیب کی بنیاد کھڑی ہے: اولاً اخلاقیات اور ثانیاً اعلیٰ اقدار۔ اخلاقیات ایک ایسا منظم علم ہے جس کے ذریعے ہم کسی بھی سماج کی تہذیب کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

تہذیب و ثقافت کا باہمی ربط:

ثقافت اور تہذیب کے باہمی تعلق کی بات کریں تو یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ تہذیب کے مفہوم کا اطلاق ان تمام امور پر ہوتا ہے جو انسان سرانجام دیتا ہے اور یہ انسان کے عقلی، مادی، روحانی، دینی، اور دنیاوی تمام پہلوؤں کو محیط کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، تہذیب ایک طویل انسانی تاریخ کا مجموعہ ہے جو انسان مختلف ادوار میں تخلیق کرتا رہا ہے۔ دوسری جانب، ثقافت معاشرے کا ایک ایسا پہلو ہے جس کا تعلق انسانی سرگرمیوں سے ہے جو معاشرے میں انجام پاتی ہیں۔ ثقافت میں علوم، فنون، اور عقائد شامل ہوتے ہیں، اور اس میں معاشرے کے مختلف افراد کے وہ اسبابِ زندگی بھی آتے ہیں جن کے تحت وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ یعنی ثقافت معاشرے کے اعتقادی، فکری، اور معاشرتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ آسان الفاظ میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت وہ رسم و رواج اور طور طریقے ہیں جو ہماری اور آپ کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے ایمان و عقیدے اور ان تمام نظریات و عقائد کو شامل ہے جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حصہ ہیں۔ تہذیب و ثقافت انسانی زندگی کے بنیادی اصول ہیں۔ ثقافت ایک معاشرے اور قوم کی خصوصیات عادات و اطوار، طرزِ فکر، دینی نظریے، اور اس کے اہداف و مقاصد کو محیط ہے۔ اس موضوع پر ایک بہترین تصنیف "الثقافۃ "میں لکھا گیا:

﴿الثقافة هي اصلاح النفس الصحیح الکامل بحیث یکون صاحبها مرآة للکمال و الفضائل، اصلاح الفاسد و تقویم المعوج﴾[1]

"ثقافت ، نفس کی صحیح اور مکمل اصلاح کے علاوہ اور کچھ نہیں، اس اعتبار سے کہ ثقافت، مہذب شخص کی ذات، کمال اور فضائل کا آئینہ ہو، یعنی فاسد کی اصلاح اور ٹیڑھے کو سیدھا کرنا (ثقافت کہلاتا ہے)۔

چارلز گرے اپنی مشہور و معروف کتاب، ٹرینڈز آف سیویلائزیشن اینڈ کلچر میں لکھتا ہے:

> The term culture is often used to cover the whole range of man’s activities when these are viewed psychologically. The anthropologist applies the term to the work of primitive man in making tools, baskets, boats and the like: these are referred to as forms of material cul ture. The popular mind thinks of culture in terms of polite society, where it connotes good manners and grammatical speech. The crude person who lacks these, even though he be far superior to the savage with his “culture”, is referred to as “uncultured”, meaning unrefined. Just as the term animal is used to cover various fauna from a tiny insect to a large mammal, so the term culture is often extended to the glimmerings of interlligence in primitive men and the graces of those who move in the best circles of urban society. It will be seen at once that we cannot ma headway in the analysis of cultural types among modern nations, if we apply the term so indiscriminately.[2]

یعنی نفسیاتی طور پر ثقافت ایک ایسی اصطلاح ہے جو زندگی کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ علمِ بشریات (ایسا علم جس میں انسانی معاشروں، ثقافتوں اور ان کی ترقی کا مطالعہ کیا

1۔ راغب علی بیروتی، الثقافۃ، مکتبہ اصلیۃ، بیروت، ص۱۹

2 Charles Gray Shaw, Trends of civilization and culture,American Book Company, New York, ۱۹۳۲, p ۷۵

جائے) کے ماہرین اس اصطلاح کو ابتدائی انسان کے کاموں، مثلاً اوزار بنانا، ٹوکریاں بنانا، کشتیاں تیار کرنا، اور اس طرح کی دیگر اشیاء، جو مادی ثقافت کی مختلف شکلیں ہیں، کے بیان کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عام فہم میں، ثقافت کو مہذب معاشرے کی خوبیوں کے طور پر سمجھا جاتا ہے، جہاں یہ اچھے آداب و اطوار اور مہذب علمی گفتگو کا مظہر ہوتی ہے۔ ایک غیر تہذیب یافتہ فرد، جو ان خصائل سے محروم ہو، چاہے وہ اپنی صحرائی یا وحشی ثقافت میں برتر ہی کیوں نہ ہو، اسے غیر مہذب یعنی غیر شائستہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے لفظ "جانور" معمولی کیڑے مکوڑوں سے لے کر بڑے جانوروں تک تمام حیوانات کا احاطہ کرتا ہے، اسی طرح لفظ "ثقافت" میں ابتدائی انسان کی ذہانت کی ادنیٰ جھلک سے لے کر جدید شہری کی عظیم شان وشوکت کی حامل ذہانت سب شامل ہیں۔

تہذیب اور ثقافت میں فرق:

تہذیب میں اصلاح کرنا، عیوب سے پاک کرنا، بہتر بنانا، درست کرنا، تعلیم و تربیت دینا، اور خوش اخلاق بنانا جیسے معانی پائے جاتے ہیں۔ جبکہ ثقافت کسی مہذب شخص یا قوم کے جمالیاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ بعض علماء، تہذیب و ثقافت میں صرف معرفت، عقائد، فنون، اور اخلاق کو شامل کرتے ہیں، جبکہ بعض کے نزدیک اس میں دین، خاندان، جنگ، امن، اور دیگر ایسے ضابطے بھی شامل ہیں جو انسانی نفسیات اور حیاتیات تک کا احاطہ کرتے ہیں۔

اسلامی تہذیب و ثقافت:

ڈاکٹر خالد علوی، فیضی کے حوالے سے اسلامی تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب سے تین چیزیں مراد ہیں:

۱۔ بلند ترین فکری سطح اور معیار جو اسلامی حکومت کے کسی دور میں پیدا ہوا۔

۲۔ وہ تاریخی کامیابیاں جسے اسلام نے ادب، سائنس اور فنون کے میدان میں حاصل کیا۔

۳۔ مسلمانوں کا طریقِ زندگی، مذہبی عمل، زبان کے استعمال اور معاشرتی رسوم ورواج کے خصوصی ربط کے ساتھ۔[1]

اسلامی تہذیب کی وضاحت میں ہمیں دو مفہوم ملتے ہیں۔ جن میں ایک فکری پہلو ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ترتیب پاتا ہے۔ ہے اور دوسرے میں ادب، سائنس، زبان، اور نظمِ معاشرت جیسی چیزیں شامل ہیں۔ اس بابت درج ذیل الفاظ قابل توجہ ہیں:

"میری سمجھ کے مطابق اسلامی ثقافت ایک مخصوص ذہنی مسلک کی نشاندہی کرتی ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ترتیب پاتا ہے، مثلاً توحید، انسانی عظمت اور نسلی وحدت کے بارے انسان کا عقیدہ۔"[2]

اس نقطہ نظر سے انسان کی فکری زندگی متصور ہوتی ہے اور اس نور سے پوری نسلِ انسانی روشن ہو جاتی ہے۔ اسلامی تہذیب دراصل روشنی کا مینار ہے جس سے اسلامی تمدن وجود پذیر ہوتا ہے۔ یہی وہ مینار ہے جس نے نہ صرف دنیا کی مختلف تہذیبوں کو اپنے اندر سمیٹا بلکہ انہیں متاثر بھی کیا۔[3]

ہیئت کے اعتبار سے اسلامی تہذیب کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ یہ صرف ذاتی معاملات یا بعض معاشرتی اقدار تک محدود نہیں، بلکہ یہ پورے نظامِ حیات پر محیط ہے۔ یہ ایسا نظامِ حیات ہے جس میں انفرادی رویے، عائلی امور، معاشرے سے ربط اور سماجی تقاضے، اجتماعی نظام زندگی اور حکومت و نظامِ سیاست کی بناوٹ، امور مالیہ اور نظمِ معیشت سب شامل ہیں۔ ڈیوڈ مار کوانڈ، جو ایک مغربی مفکر ہیں، اپنی کتاب "ریلیجن اینڈ ڈیموکریسی" میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور مغربی تہذیب و ثقافت کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Islam is personal piety and worship of God in a framework of revealed universal ethical principles

[1] ۔ ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران، ۲۰۰۵، ص ۱۲۴

[2] M.Z.Sadiqui,international Islamic colloquium papers,Lahore,۱۹۵۶, p۲۶

[3] ۔ ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، ص ۱۲۴

which are to be implemented in human life,Islam in its personal pietism and Quranic ethical universalism is meant to do his job.[1]"

دینِ اسلام انفرادی پاکبازی اور اللہ کی بندگی کا نام ہے۔اسی چیز کو اسلام زندگی پر نافذ کرنا چاہتا ہے اسلام اپنی مجرد پاکبازی کی تعلیمات اور آفاقی، قرآنی، اخلاقیات کے ذریعے عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔

درج بالا تعریفات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کے تصورِ ثقافت میں بنیادی فرق "تصورِ دین "کو ثقافت کا اہم عنصر ہونا ہے۔کیونکہ مغربی نظریات میں دین سے مراد ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس کا تعلق علوم وفنون سے ہو سکتا ہے، لیکن یہ زندگی کی زندہ اور عملی قدروں سے تعلق نہیں رکھتا۔جبکہ اسلامی نقطہ نظر میں دین طبیعات سے ماوراء اور فلسفیانہ کہانی نہیں ہے، بلکہ زندگی کی ایک ایسی زندہ جاوید حقیقت ہے جس سے زندگی کا کوئی گوشہ بھی اوجھل نہیں ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب وثقافت میں فرق:

ہمیں اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب و ثقافت پر مولانا مودودی کی رائے دیگر سے عمدہ اور صائب محسوس ہوئی۔مولانا اس موضوع پر اپنی معرکہ آراء تصنیف" اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی" میں اس سوال کے ضمن میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تصورات و افکار، اخلاق و خصائل، معیشت و معاشرت، تمدن و عمران، سیاست و حکومت، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستے سے الگ ہوجاتا ہے۔زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریے سے الگ ہے۔زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک اس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متعین کیا ہے۔لہذا اسلام اپنے نظریے کے مطابق دنیا اور مافیہا سے جو معاملہ برتتا ہے،

---

[1] David Marquand, Ronald L. Nettler, Religion and Democracy, Blackwell Publishers, ۱۰۸-Cowley Road, Oxford, ۲۰۰۰, p۵۳-۵۴

اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے دنیوی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے وہ بھی بنیادی طور پر اس معاملے اور اس طریقے سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے۔ ذہن کے بہت سے افکار و تصورات، نفس کے بہت سے میلانات ورجحانات اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات لازمہ تہذیب ہے، مگر اسلام انہیں ناجائز، مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دینے پر مجبور ہے۔ اس کے قانون میں ذوقِ لطیف کی پرورش اور جمالِ مصنوعی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اس کے ساتھ ساتھ خدا کو یادرکھ سکے، اس کی رضا کے لیے عمل کر سکے، اپنے منصب خلافت کے فرائض بجالا سکے۔ مگر جس مقام پر یہ ذوقِ لطیف احساسِ فرض پر غالب آجاتا ہو، جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان کو خدا پرست کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو، جہاں فنون لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ جاتا ہو، جہاں ان فنون کے اثر سے جذبات و ادعیاتِ نفس اس قدر شدت حاصل کر لیتے ہوں کہ عقل کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور ضمیر کی آواز کے لئے دل کے کان بہرے ہو جائیں اور فرض کی پکار کے لئے سمع وطاعت باقی نہ رہے، ٹھیک اسی سرحد پر اسلام عدم جواز، کراہت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصد تان سین اور بند اوین، مانی اور بہزاد، چارلی چپلن اور میری پکفورڈ پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ابو بکر صدیق اور عمر فاروق، علی ابن ابی طالب اور حسین ابن علی، ابو ذر غفاری اور رابعہ بصری رضی اللہ عنہم پیدا کرنا چاہتا ہے۔"[1]

تہذیبِ وثقافتِ اسلامیہ کے عناصر ترکیبی:

سید ابو الحسن ندوی مسلمانوں کی تہذیب کے عناصر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[1]۔ مودودی، سید ابو الاعلیٰ، مولانا، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول مبادی، ص ۸۰-۸۱

مسلمانوں کی تہذیب کا پہلا عنصر دینی عقائد، اسلامی اصولِ زندگی اور اخلاقیات ہیں۔ یہ عنصر دنیا کے مختلف ممالک کے مسلمانوں کی تہذیبوں کا مشترک حصہ ہے۔ مسلمان دنیا کے کسی بھی ملک یا گوشے میں بستے ہوں، اور ان کی زبان یا لباس جو بھی ہو، یہ قدرِ مشترک ان میں ضرور پائی جاتی ہے۔ اور اسی بنیاد پر وہ ایک خاندان کے افراد کی مانند اور ہر جگہ ایک ہی تہذیب کے حامل نظر آتے ہیں۔ اسی مشترک عنصر کے لحاظ سے دنیا کے تمام مسلمان ایک مخصوص تہذیب رکھتے ہیں، جس کے لیے "ابراہیمی تہذیب" سے زیادہ موضوع اور جامع لفظ نہیں ہو سکتا۔"[1]

ڈاکٹر خالد علوی، سید ابو الاعلیٰ مودودی کے بیان کردہ تہذیب کے عناصر ترکیبی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔دنیوی زندگی کا تصور: مثلا انسان کی حیثیت کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ دنیا برتنے کی چیز ہے یا نہیں؟

۲۔زندگی کا نصب العین: مثلاً انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ سعی وجہد کس لیے ہے؟ وہ کون سا منتہائے مقصود ہے جسے حاصل کرنا انسان کا فرض ہے؟

۳۔اساسی عقائد و افکار: یعنی انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کی گئی ہے؟ انسان کی ذہنیت کو کس سانچے میں ڈھلنا ہے؟ وہ محرکات کیا ہیں جو نصب العین کے حصول کے لئے مخصوص عملی رنگ پر ابھارتے ہیں؟

۴۔تربیت افراد کے اصول: یعنی انسان کو بحیثیت انسان کیسے ہونا چاہیے؟ وہ کون سے خصائل، اوصاف اور نفسی خصائص ہیں جو انسان کے اندر پیدا ہونے اور نشوونما پانے چاہیں؟

---

[1]۔ سید ابو الحسن علی ندوی، اسلامی تہذیب و ثقافت، ص ۳۹

۵۔ نظام اجتماعی کے اصول: یعنی انسان اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ انسانی تعلقات کی تقسیم کیسے؟ خاندان، ہمسایہ، دوست، اجنبی، ماتحت وغیرہ کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے؟[1]

مذکورہ بالا تہذیب و ثقافت اسلامی کی بحث سے اس کے چند اہم عناصر ترکیبی واضح ہوئے۔

۱۔عقائد، ۲۔عبادات، ۳۔اخلاق، ۴۔توحید، ۵۔رسالت، ۶۔آخرت، ۷۔نماز، ۸۔زکوۃ، ۹۔روزہ، ۱۰۔حج، ۱۱۔جہاد، ۱۲۔مساوات، ۱۳۔شرافت

غیر مسلم ممالک میں مسلم شناخت اور تہذیب و ثقافت:

مسلمان دنیا کے جس بھی ملک میں جائے، اس کی تہذیب و ثقافت کو اگر مختلف قطع و برید کر کے ایک لباس فرض کیا جائے تو باوجود موسمی اور خارجی تغیرات و اثرات کے، وہ لباس ایک ہی خوبصورت رنگ میں ڈھلا نظر آئے گا۔ اس کی عبادت گاہ، اذان کی آواز، ساتویں دن عقیقہ، اسلامی نام، پھر نکاح کی منزل آتی ہے تو خدائے واحد کا نام درمیان میں لا کر عقدِ نکاح میں باندھ دیا جاتا ہے اور زندگی کے آخر میں نمازِ جنازہ کی صورت میں بھی اللہ کے پاک نام کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہ اس کے لیے ایک استعارہ ہے۔ اے بندہ مومن! تو دنیا کے جس خطے میں بھی چلا جائے، ابتداء سے انتہاء تک چند لمحات کا وقفہ ہے۔ تجھے زندگی کے ہر لمحے کو عقائد کی حفاظت کے ساتھ، اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہوئے گزارنا ہے، اور بالآخر اسی کے حضور حاضر ہو جانا ہے۔

سید ابوالحسن ندوی مسلمانوں کی تہذیب کی ایک عملی جھلک پیش کرتے ہیں، جس میں ہر مسلمان، خواہ وہ اسلامی ملک کا باشندہ ہو یا غیر اسلامی ملک میں سکونت پذیر ہو، سب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

> "مسلمان اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کرتا ہے اور اللہ کے نام اور شکر پر کھانا ختم کرتا ہے۔ جن لوگوں کو سنتوں کا اہتمام ہے، ان کا کھانا پینا،

---

[1] ۔ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، ص ۱۲۳

کپڑے بدلنا، بیت الخلا جانا آنا، سب اللہ کے نام اور اس کے دھیان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چھینک آئے تو اس پر بھی اللہ کا نام لینے کی ہدایت اور جو سُنے، اس کو بھی دعا دینے کی تعلیم ہے۔ اس کے علاوہ بھی اوقات اللہ کے ذکر سے خالی نہیں ہوتے۔ ماشاء اللہ، ان شاء اللہ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ نہ صرف اذکار ماثورہ ہیں بلکہ زبان کا جز اور ان ملکوں کے روزمرہ کے محاورات بن چکے ہیں جہاں مسلمان عرصہ دراز سے رہ رہے ہیں اور ان کی تہذیب اثر انداز ہوئی ہے۔ یہ سب اللہ کے ذکر اور اس کی طرف متوجہ کرنے کے بہانے ہیں۔ کسی تہذیب کی معاشرت، اس کی زبان، اس کا ادب اور اس کی روزمرہ کی زندگی اس طرح اللہ کی ہستی کے یقین اور اس کے استحضار کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر نہیں آئے گی۔ مسلمانوں کی تہذیب کا پہلا بین الاقوامی اور مشترک پہلو یہی یقین واستحضار ہے جو ان کی زندگی کا شعار اور علامت بن گیا ہے۔[1]

روزمرہ کی اس تہذیب یافتہ اسلامی زندگی پر عمل پیرا ہونا مسلمانوں کے لئے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگرچہ وہ دنیا کے کسی خطے میں رہائش پذیر ہوں۔"

غیر مسلموں کے تہواروں میں شرکت:

مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی بس رہے ہوں، ان پر دین کی محبت تمام محبتوں سے مقدم رکھنا فرض ہے۔ اسی لیے کسی مسلمان کے لیے قطعاً اس بات کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی بھی دوسرے تعلق پر دین کے تعلق کو قربان کر دے بلکہ مسلمان، معاشرہ میں رہتے ہوئے اپنی پہچان اور شناخت کو برقرار رکھیں گے۔ غیر مسلموں کے تہواروں میں شرکت جائز ہے

[1]۔ سید ابوالحسن علی ندوی، اسلامی تہذیب وثقافت، ص ۴۱

یا نہیں؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ احکامِ مشابہت جاننا ضروری ہے۔

غیر مسلموں سے مشابہت کے احکام:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من تشبہ بقوم فھو منھم [1]

جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کریگا اس کا شمار اسی قوم سے ہو گا۔

اس حدیث میں تفصیل ہے کیونکہ اگر اسے ظاہر پر محمول کیا جائے تو پھر یہ لازم آئے گا کہ نہ ہم کھائیں اور نہ پیئیں، کیونکہ اگر ہم کھائیں گے تو غیر مسلم بھی کھاتے ہیں، تو کھانے میں ان کے ساتھ مشابہت ہو جائے گی اگر ہم پیئیں گے تو پینے میں غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت ہو جائے گی، جبکہ غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت منع ہے۔ لہٰذا، کھانا پینا بھی منع ہو جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث پاک کو اپنے ظاہر پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مراد کیا ہے؟ اس کو ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ یہ جملہ (من تشبہ بقوم فھو منھم) اپنے سیاق وسباق سے کاٹ کر بیان کیا جاتا ہے اور اب یہ ایک مطلق اصول بنا دیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے مجلہ اجتہاد میں اس کی تفصیل اسطرح بیان کی گئی ہے:

"' کفار مکہ کے مقابلے میں نبی اکرم ﷺ نے صحابہ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم قریش کی مشابہت نہ کرو۔ ان سے مختلف لباس سلواؤ۔ نہ یہ حکم کہیں آیا ہے کہ مسلمانوں کے لباس کا نیا ڈیزائن تیار کیا جائے، اور آج سے وہ یہی پہنیں گے۔ اس حدیث میں اس معنی کے در آنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے اس حدیث کو کتابوں میں ٹکڑے کر کے لکھ دیا تھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ یہ حدیث اپنی مکمل صورت میں مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں یوں روایت ہوئی ہے:

---

[1]۔ ابو داوٗد سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داوٗد، رقم الحدیث ۴۰۳۱

﴿عن ابی منیب الجرشی، عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: بعثت بالسیف حتی یعبد اللہ لا شریک لہ وجعل رزقی تحت ظل رمحی، وجعل الذل والصغار علی من خالف امری ومن تشبہ بقوم فھو منھم۔[1]﴾

یعنی ابن عمر کہتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: مجھے تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے کہ میں تلوار کے ساتھ جہاد کروں حتیٰ کے صرف اللہ، وحدہ لاشریک، کی عبادت کی جائے۔ میرا رزق میرے نیزے کے تحت رکھا گیا ہے۔ اور جو میری مخالفت کرے گا، اس کے لئے ذلت اور میری ماتحتی لکھ دی ہے، جس نے کسی قوم کی مشابہت کی وہ بھی ان میں سے ہو گا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث جب امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اللباس" میں نقل کی، تو چونکہ اس کے بعض جملے "کتاب اللباس" کے سیاق سے ہم آہنگ نہیں تھے، لہٰذا انہوں نے وہ جملے محذوف کر دیے اور آخری جملہ نقل کرنے پر اکتفا کیا۔ چنانچہ باقی حدیث سے ٹوٹ کر یہ حدیث اب یہ شکل اختیار کر گئی۔ ﴿عن ابی منیب الجرشی ،عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: من تشبہ بقوم فھو منھم۔[2]﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ انہی میں سے ہو گا۔" لہٰذا یہ آخری جملہ اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر ایک مطلق اصول کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ اب نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان مبارک ضرب المثل کی طرح بولا جاتا ہے: "من تشبہ بقوم فھو منھم" یعنی جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، تو وہ انہی میں سے ہو گا۔ یہ حدیث مبارکہ جب اپنے سیاق و سباق سے علیحدہ ہو گئی تو پھر اس جملے میں نئے معنی پیدا ہو گئے۔ وہ یہ کہ آپ جس قوم کا حلیہ اپنائیں گے، آپ کا انجام بھی ان جیسا ہو گا۔ مثلاً، اگر آپ پتلون اور ٹائی پہنیں گے تو اپنے ایمان اور عبادات کی پابندی کے باوجود آپ مسیحیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگیں گے، کیونکہ آپ نے ان کی مشابہت اختیار کرلی ہے۔ اب

---

[1]۔ امام احمد بن حنبل، المسند، رقم الحدیث: ۵۱۱۴

[2]۔ ابو دائود، سلیمان بن اشعث، سنن ابو داوٴد، رقم الحدیث: ۴۰۳۱

آپ کا نہ کلمہ پڑھنا کام آئے گا اور نہ نماز روزہ۔ اس حدیث کی یہ تشریح اس لیے ہوئی کہ نبی اکرم ﷺ کی پوری بات کی بجائے صرف ایک جملے کو بنیاد بنا لیا گیا۔ حالانکہ یہ سرتاسر غلط رویہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کی پوری بات کو سن کر اس کا مطلب نکالا جائے، اور اس اصول کے سب سے زیادہ حق دار نبی کریم ﷺ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کی زبان سے صادر ہونے والے الفاظ دین کا حصہ بنتے ہیں۔ ان الفاظ میں انتہائی احتیاط ہونی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ اس عیب سے بالکل پاک تھے۔"[1]

محمد سعود عالم قاسمی ناظم سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اپنے مقالہ "غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کے فقہی مسائل" میں اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اصولی طور پر غیر مسلموں کی مشابہت کسی بھی حالت یا صورت میں جائز نہیں ہونی چاہیے، لیکن یہ نہ تو عملاً ممکن ہے اور نہ ہی شریعت کی منشاء کے مطابق ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ علامات و اطوار جو غیر مسلموں کی مذہبی علامت ہیں، ان سے پرہیز کرنے کی تعلیم دی جائے گی اور ان سے مشابہت کو ناجائز قرار دیا جائے گا، جیسے صلیب کی علامت گلے میں لٹکانا، زنار باندھنا، یا ماتھے پر تلک لگانا وغیرہ۔ تاہم، جہاں تک ایسے سماجی اطوار کا تعلق ہے جو مذہبی علامت کے طور پر استعمال نہیں ہوتے، ان میں یہ دیکھا جائے گا کہ اگر عموم بلویٰ ہے تو ان کے استعمال کی اجازت دی جائے گی۔ مثلاً ٹائی کا استعمال عیسائیوں کی روایت ہے، مگر اب کثرت سے جدید ذہن کے مسلمان اسے استعمال کرتے ہیں، اس لیے علمائے ہند نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اسی طرح ساڑھی ہندو عورتوں کا لباس ہے جو خاص طور پر

[1] ڈاکٹر ساجد شہباز خان، غیر مسلموں سے مشابہت اور تعلقات کے ضمن میں مسلم اقلیات کے مسائل، در مشمولہ، اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، شمارہ ۱۲، ۲۰۱۹، ص ۱۳۲

> جنوبی ہند کا رواج ہے، مگر اس وقت جنوبی و شمالی ہندوستان میں بیشتر مسلمان گھروں میں عورتیں ساڑھی استعمال کرتی ہیں، لہذا اسے جائز ہی کہا جائے گا۔ بعض حالات میں مسلمان مجبور ہوتے ہیں کہ مشترکہ لباس اور وضع اختیار کریں، ورنہ وہ فرقہ پرست اکثریت کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں "الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان" کے تحت اجازت دی جائے گی کہ وہ جزوقتی طور پر مقامی وضع اختیار کریں۔[1]

علامہ غلام رسول سعیدی، کفار سے تشبیہ پر تفصیلی کلام کرنے کے بعد خلاصتہً تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کفار کے ساتھ مشابہت کی نیت سے مطلقاً کوئی کام کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً، ان سے مشابہت کی قصد سے کھانا پینا یا سانس لینا بھی ممنوع ہے۔ اور جب کفار کے ساتھ مشابہت کی نیت نہ ہو بلکہ کسی اور مصلحت یا فائدہ کا حصول مقصود ہو، مثلاً فوج اور پولیس کفار کے مخصوص ہتھیاروں کو ان کی افادیت کی بنا پر استعمال کریں، یا پولیس اور فوج کی وردی کو اس لیے پہنیں کہ اس سے جسم چاق و چوبند رہتا ہے اور اس لباس کے ساتھ فوجی مشقیں اور دیگر فرائض آسانی سے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ (البتہ، قمیص پتلون، کانٹے اور چمچوں کو کھانے میں استعمال کرنا، اگر ان میں کفار کے ساتھ مشابہت کی نیت نہ ہو بلکہ دوسرے فوائد اور سہولتوں کی بنا پر ان کا استعمال کیا جائے، اور اس

[1]۔ محمد سعود عالم قاسمی، غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کے فقہی مسائل، اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، ادارہ تحقیقات اسلامیہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۵۷۶-۵۷۷

میں ہماری نیت کفار سے مشابہت نہیں ہوتی، مثلاً بجلی کی روشنی اور پنکھوں کا استعمال، موٹر سائیکل، بس، ٹرین اور کارخانوں میں ان کی تکنیک سے استفادہ کرنا، یہ سب امور جائز ہیں اور تمام مسلمان بغیر کسی انکار کے ان پر عمل کرتے ہیں۔

کفار کے وہ اعتقادات جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہیں، اسی طرح ان کی وہ عبادات جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور ان کی وہ تہذیب و ثقافت جو ان کا مخصوص شعار سمجھی جاتی ہے، یعنی وہ چیزیں جو ان کی بد عقیدگی پر مبنی ہیں، مثال کے طور پر عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھایا گیا، اس لیے وہ گلے میں صلیب ڈالتے ہیں، یا رسی کا پھندہ ڈالتے ہیں، یا اس کی علامت کے طور پر ٹائی لگاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں مطلقاً ممنوع اور حرام ہیں اور ان میں سے بعض چیزیں کفر ہیں۔ مثلاً، حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ انہیں سولی دی گئی تھی، یہ کفر ہے۔

عورتوں کی بے پردگی، مردوں اور عورتوں کا آزادانہ میل جول، کلبوں میں اجنبی مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا، گپ شپ کرنا، رقص و سرود میں حصہ لینا، ویڈیو اور سینما کی فلمیں بنانا اور ان کو دیکھنا، موسیقی سننا خواہ وہ بھارت کی ہو، پاکستان کی ہو یا مغربی، لڑکیوں کا چست اور نیم عریاں لباس پہننا، ہیجڑوں کی سی وضع قطع اختیار کرنا، ان تمام امور میں مغربی تہذیب کی مشابہت ہے۔ بعض امور میں ہندوؤں کے طریقے اور ان کی رسموں کا رواج ہے۔ ان چیزوں میں مشابہت مطلقاً ممنوع ہے اور ان کاموں میں خواہ نادانستہ مشابہت ہو، یا جان بوجھ کر، دونوں صورتوں میں یہ ممنوع ہیں۔"[1]

یعنی کفار کے ساتھ مشابہت ان امور میں منع ہے جو کفار کے فاسد عقائد و اعمال کے ساتھ مخصوص ہوں یا جو احکامِ اسلامیہ کی تصریحات کے خلاف ہوں۔ اور جو امورِ نافعہ ہمارے اور

[1]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج ۹، ص ۳۶۷-۳۶۸

کفار کے درمیان مشترک ہوں، اگر ان میں غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت پائی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسا کہ شہر کے اطراف خندق کھودنا عجمی کافروں کا طریقہ تھا، لیکن جنابِ سَلمان فارسی کے مشورے سے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے ارد گرد خندق کھدوائی۔ اسی طرح بجلی کی روشنی، ہوائی جہاز پر سفر، موٹر سائیکل، بس، ٹرین اور کارخانوں میں ان کی تکنیک اور جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنا یہ سب مباح امور میں شامل ہیں۔

جن چیزوں میں غیر مسلموں کی مشابہت منع ہے:

درج بالا کلام سے واضح ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت تین چیزوں میں منع ہے۔

۱: کفار کے ساتھ تشبیہ ان امور میں منع ہے جو کفار کے فاسد عقائد کے ساتھ مخصوص ہوں۔

۲: جو امور کفار کے باطل اعمال وعقائد کے ساتھ مخصوص ہوں۔

۳: جو امور کتاب وسنت کی تصریحات کے خلاف ہوں۔

خوشی کے موقع پر مبارک باد دینا:

قدیم محققین خصوصاً حافظ ابن قیم کے نزدیک غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت کرنا اور انہیں مبارک باد کے پیغامات ارسال کرنا دراصل ان کے شعائر کی تعظیم اور ان کی خواہشات کی تائید کرنے کے مترادف ہے، اور ایسا کرنا حرام ہے۔ علامہ ابن قیم نے کفر کے شعائر پر مبارک باد دینے کو حرام قرار دیا اور اسے امت کا متفقہ فیصلہ قرار دیا۔

﴿وأما التهنئة بشعائر الكفر المختصة بهم فحرامٌ باتفاق، مثل أن يهنئهم بأعيادهم وصومهم، فيقول: عيد مبارك عليك، أو تهنأ بهذا العيد[1]﴾

"غیر مسلموں کے مخصوص شعائر پر تہنیتی پیغامات ارسال کرنا متفقہ طور پر حرام ہے۔ مثال کے طور پر ان کی عید اور روزوں پر مبارک

---

[1] ۔ ابن قیم، محمد بن ابو بکر احکام اہل الذمہ، ج ۱، ص ۲۵۵

دیتے ہوئے کہنا کہ آپ کو عید مبارک ہو یا اس مبارک موقع پر آپ کو مبارک ہو۔"

حافظ ابن قیم کا یہ فتویٰ اس زمانے کے حالات کے پیش نظر تھا۔ آپ زمان و مکان اور حالات کی رعایت کرتے تھے۔ نامور محقق ڈاکٹر یوسف قرضاوی، ابن قیم کے مذکورہ فتوے کا جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ شیخ الاسلام نے یہ فتویٰ اپنے زمانے کے مخصوص حالات کے تحت دیا تھا۔ اگر انہوں نے عصرِ حاضر میں مختلف اقوام کے افراد کے مابین پائے جانے والے مختلف نوعیت کے تعلقات کا مشاہدہ کیا ہوتا اور یہ جان لیا ہوتا کہ کسی مسلمان کے اپنے ساتھی، ہمسائے، یا استاد کو مبارک باد دینے سے مسیحی عقیدہ یا کفریہ عقیدہ کو درست قرار دینا لازم نہیں آتا، تو ان کی رائے مختلف ہوتی۔ در حقیقت آج کے دور میں خود عیسائی بھی اپنے مخصوص ایام میں جشن منانے کو دینی عمل نہیں سمجھتے، بلکہ وہ ان ایام کو ایک قومی دن کے طور پر مناتے ہیں اور اہل و عیال، دوستوں کے ساتھ کھانے پینے اور تحائف کے تبادلے کا موقع تصور کرتے ہیں۔ اگر ابن تیمیہ نے ہمارا زمانہ پایا ہوتا اور یہ سب کچھ دیکھا ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ انہوں نے اپنی رائے بدل دی ہوتی، یا کم از کم اس معاملے میں اتنی شدت اختیار نہ کی ہوتی، واللہ اعلم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فتاویٰ میں زمان و مکان اور حالات کی رعایت کرنے کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ یہ تمام گفتگو دینی تقریبات میں شرکت کے حوالے سے ہے۔ جہاں تک وطن سے تعلق رکھنے والے مخصوص ایام، جیسے یومِ آزادی، یومِ اتحاد، یا سماجی نوعیت کے ایام، جیسے یومِ والدہ، یومِ اطفال، یومِ مزدور، یا یومِ شباب کی بات ہے، تو ان میں مسلمانوں کی شرکت یا ایسے مواقع پر دوسروں کو تہنیتی پیغامات دینے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ ایسے مواقع پر ہونے والی ممنوعات سے بچا جائے۔"[1]

اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا کے زیرِ اہتمام مذکورہ موضوع پر منعقدہ سیمینار میں متعدد محققین

---

[1]۔ قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، فقہ الاقلیات، فقہ الاقلیات المسلمہ، ص ۲۰۱۴-۲۰۱۶

نے جذبہ خیر سگالی اور تکثیری معاشرے کے تناظر میں اسے درست قرار دیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ تشبہ اس وقت شمار ہو گا جب کوئی عمل اسلامی تعلیمات کے منافی ہو۔ تاہم، قرآنی آیت لکم دینکم ولی دین کے تحت، ضرر کے ازالے، دینی مصلحت، مسلمانوں کو غیر مسلموں کی طرف سے مذہبی منافرت و تعصب سے بچانے، اور غیر مسلم سوسائٹی میں امن، باہمی محبت و ہمدردی کے ماحول کے قیام کے لیے مبارک باد دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[1]

اجنبی خاتون سے مصافحہ، معانقہ اور بوسہ لینے کا حکم:

غیر مسلم ممالک میں، جب دو افراد آپس میں ملتے ہیں تو مصافحہ یا معانقہ کرتے ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے اس وقت عجیب صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جب کوئی اجنبی عورت مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے۔ اگر وہ مصافحہ کرنے سے انکار کرے تو اسے بدتمیز اور بد تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں اس معاملے کا حکم واضح ہے کہ مسلمان مردوں کے لیے اجنبی عورتوں سے اور مسلمان عورتوں کے لیے اجنبی مردوں سے مصافحہ کرنا جائز نہیں ہے۔ احادیثِ رسول ﷺ میں اس کی صریح ممانعت وارد ہوئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی کسی نامحرم خاتون کا ہاتھ نہیں چھوا۔

حدیثِ مبارکہ کے الفاظ اس طرح ہیں:

﴿واللہ مامست یدہ ید امراۃ قط فی المبایعۃ[2]﴾

"اللہ کی قسم! آپ ﷺ کے ہاتھ نے بیعت کراتے ہوئے کبھی کسی خاتون کا ہاتھ نہیں چھوا"۔

جب مصافحہ کرنا اسلام میں ممنوع ہے، تو معانقہ اور بوسہ لینا یا دینا بطریقِ اولیٰ ناجائز ہو گا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ جدید مغربی غیر مسلم معاشروں کے سماجی تعلقات اور روزمرہ کی ملاقاتوں میں یہ ناجائز عادات عام ہیں۔ اگرچہ بندہ مومن کا اس طرز معاشرت سے اجتناب

1۔ غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ص ۱۲۷

2۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب اذا جاء کم المومنات مہاجرات، رقم الحدیث: ۴۸۹۱

کرنے میں دنیاوی نقصان ہو سکتا ہے، لیکن جب وہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی کے مقابل آخرت کی لامتناہی زندگی کا تصور کرے گا، تو اس کے لیے شریعت کے احکام پر عمل کرنا ہرگز مشکل نہیں ہو گا، اور اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہونا اس کا مقدر بن جائے گا۔

غیر مسلموں کی تہذیبی روایت میں کتوں کو پالنا:

غیر مسلم ممالک خصوصاً امریکہ اور یورپ میں لوگ گھروں میں کتا رکھنے کو باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں ہمارے نوجوان فکری، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی طور پر ان سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ بدیں وجہ، ہر وہ فعل جو کفار اپنی معاشرت میں انجام دیتے ہیں، مسلمان بھی ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ آج ہمیں غیر مسلموں کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں پالتو جانور، خصوصاً کتا رکھنا، بطور خاص دیکھنے کو ملتا ہے۔ شریعتِ محمدیہ میں حفاظتی نقطہ نظر کے علاوہ کتا پالنا جائز نہیں ہے۔ حدیثِ پاک ہے:

﴿عن ابی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال: من اتخذ کلبا الا کلب ماشیۃ او صید او زرع، انتقص من اجرہ کل یوم قیراط۔[1]﴾

"حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کتا رکھا اس کے اجر میں ہر روز ایک قیراط کم ہوتا رہے گا سوائے اس شخص کے جس نے مویشیوں کی حفاظت کے لئے کتا رکھا ہو یا شکار کرنے کے لئے یا کھیت کی حفاظت کے لئے۔"

امام قرطبی اصحابِ کہف کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں ان کے کتے کا ذکر آیا ہے، وہاں لکھتے ہیں:

"ان کی شریعت میں کتے پالنے کی اجازت ہو گی اس لیے انہوں نے کتا ساتھ لیا ہو گا۔ ان کا شکاری کتا تھا یا کسی کی بکریوں یا کھیت کی حفاظت کے لئے ہو گا۔"[2]

---

[1]۔ ابو داؤد، سلیمان بن الاشعث سجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب الصید، باب فی اتخاذ الکلب للصید وغیرہ، رقم الحدیث: ۲۸۴۴

[2]۔ قرطبی، محمد بن احمد، ابو عبد اللہ، الجامع لاحکام القرآن، ج۹-۱۰، ص ۳۲۲

فروعی احکام میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مختلف شریعتوں میں فروعی احکام مختلف دیئے گئے۔ بہر طور اصحاب کہف کے بیان کردہ واقعہ سے کتے کو پالنے کا جواز ثابت نہیں ہو گا۔

علامہ غلام رسول سعیدی سورۃ الکھف کی آیت نمبر ۱۸ کے تحت کتوں کو رکھنے کا شرعی حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حفاظت کے لئے کتا رکھنا جائز ہے۔"[1]

اسلامی نظریاتی کونسل کے شمارہ اجتہاد میں اس حوالے سے ڈاکٹر انعام اللہ لکھتے ہیں:

"شرعی حوالے سے فی الجملہ جائز اغراض کے لئے کتوں کو رکھنے کی اجازت اہل علم پر مخفی نہیں۔ حدیث نبوی ﷺ ہے:

فرخص فی کلب الصید و فی کلب الغنم[2]

آپ ﷺ نے شکاری کتے اور ریوڑ کی حفاظت کے کتے رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

لیکن غیر مسلم، بالخصوص مغربی معاشروں میں مردوزن، بوڑھوں اور بچوں نے جس طرح کتے پالنے کا فیشن اختیار کیا ہے اور اپنی معاشرت میں اس کو شامل کیا ہے، انسانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اکرام و اعزاز سے کتے پالنا، اظہار محبت کے لئے کتے کو گود میں بٹھانا، بوس و کنار کرنا، بیڈروم میں کتوں کو ساتھ سلانا، گاڑیوں میں سیٹ پر بٹھانا عام مشاہدے میں ہے، جس کے ناجائز ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ کسی مسلمان کا اس طرز معاشرت سے متاثر ہونا بھی ناقابل تردید حقیقت ہے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ مسلمان مردوزن اپنے اپنے ممالک میں بھی بطور فیشن اس عادت قبیحہ کا شکار ہیں اور پھر اس طرز معاشرت کی قباحت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب شرعی لحاظ سے کتے کے لعاب کا نجس اور پلید ہونا یقینی ہو، بعض فقہاء نے تو نجس العین تک کہا ہے۔"[3]

---

[1]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج۷، ص۷۰

[2]۔ ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی، السنن، کتاب الطھارۃ، باب الوضوء بسور الکلب، رقم الحدیث: ۷۴

[3]۔ ڈاکٹر انعام اللہ، فقہ الاقلیات: مخلوط معاشرہ میں مسلمانوں کے شرعی مسائل اور مشکلات، در مشمولہ، اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، شمارہ ۱۲، ۲۰۱۹، ص ۱۷۰

یاد رہے کتا نجس عین نہیں ہے۔ علماء احناف کے مطابق کتے کا صرف لعاب نجس ہے۔[1]
ہمارے خیال میں ایک پابند شرع اور طہارت و نجاست کا خیال رکھنے والے مسلمان کے لیے کتا پالنا کراہت سے کم نہیں۔ طبی لحاظ سے بھی بیماریوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ گھر میں کتا پالنے والے اس کو چومنے، چاٹنے سے گریز نہیں کرتے جس سے بے شمار بیکٹریل امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح شوقیہ پالنا ناجائز ہے اسی طرح شوقیہ خرید و فرخت بھی جائز نہیں ہو گی البتہ اگر سدھایا ہوا کتا ہو، جس کو ہماری فقہی کتب میں کلب معلم کہا جاتا ہے تو اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔

مذکورہ موضوع پر اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ شکار، مویشی اور کھیت کھلیان کی رکھوالی کے علاوہ کسی بھی غرض سے کتا رکھنا جائز نہیں ہے۔ ایک دین دار شخص کو کفار کی اندھی تقلید کرتے ہوئے کتوں کے ساتھ انس و محبت پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شریعتِ مطہرہ و معطرہ سے نوازا ہے۔ جو کامل بھی ہے اور اکمل بھی۔ اس شریعت نے لوگوں کے دین اور دنیا کی اصلاح کے اصول و ضوابط قائم کر دیے ہیں۔ ایک سچا مسلمان اس سے سر مو انحراف نہیں کرتا۔

شرعاً ممنوعات پر مشتمل تقریبات میں شرکت:

اسلامی نظریاتی کونسل کے شمارہ اجتہاد کے مسلم اقلیات نمبر میں اس حوالے سے ڈاکٹر انعام اللہ لکھتے ہیں:

> غیر مسلم ممالک میں ایسی بہت سی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں جو مرد و زن کے مخلوط اجتماع، رقص اور موسیقی پر مشتمل ہوتی ہیں، اور دیگر کھانوں کے ساتھ خنزیر کا گوشت اور شراب پینے پلانے کا دور بھی چلتا ہے۔ ان تقریبات میں وہاں کے مسلمانوں کو بھی تعلقات کی وجہ سے

[1] ۔ الکاسانی، ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ج ۱، ص ۷۴

مدعو کیا جاتا ہے۔ صریح نصوص کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے
ایسی تقریبات میں شرکت کرنا بالکل جائز نہیں ہے۔"[1]

شرکت کے لیے یہ دلیل قابلِ اعتناء نہیں کہ اگر مسلمان ایسی تمام تقریبات میں شرکت نہ کریں تو وہ پورے معاشرے سے کٹ کر رہ جائیں گے اور بہت سے فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ بلکہ اس بات کے لیے کوشاں رہنا چاہیے کہ ایسی تقریبات منکرات سے خالی ہوں۔[2]

غیر مسلم ممالک میں تعمیرِ مساجد کے لئے چندہ لینا اور چرچ، مندر وغیرہ میں دینا:

مسجد مسلمانوں کی ایک اہم ترین ثقافتی علامت ہے۔ مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی بستے ہوں، مساجد کی تعمیر اور ان سے محبت ایک فطری علامت ہے۔ اور اس کام کی انجام دہی کے لیے لوگ تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی معاشروں میں فلاحِ عامہ کے کاموں کی انجام دہی کے لیے چیریٹی ڈنر وغیرہ کا بکثرت اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان فلاحی کاموں کے لیے عطیات دینا اور لینا ان کے سماج کا حصہ بن چکا ہے۔ مشاہدے کی بات یہ ہے کہ مسلمان بھی وہاں فلاحی کاموں کے لیے اپیل کرتے ہیں تو بے شمار غیر مسلم اس میں حصہ ڈالتے ہیں۔ اسی طرح پچھلے دنوں انگلینڈ سے ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ اس نے اپنے دفتر کی کرسیاں ایک مندر کو عطیہ کر دی ہیں۔ شریعت اسلامیہ میں غیر مسلموں کے چندے سے مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی مسجد کی تعمیر کے لیے مسلمانوں کا غیر مسلموں سے چندہ لینا درست ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ
بِالْكُفْرِ-اُولٰٓىٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ-وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اِنَّمَا يَعْمُرُ

---

[1] ۔ لجنة علماء الہند، الفتاوی الھندیہ، مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ، ۱۳۱۰ھ، ج۵، ص ۲۸۵

[2] ۔ ڈاکٹر انعام اللہ، فقہ الاقلیات: مخلوط معاشرہ میں مسلمانوں کے شرعی مسائل اور مشکلات، در مشمولہ، اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۲، ۲۰۱۹، ص ۱۷۱

مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۔﴾[1]

مشرکوں کو نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں خود اپنے کفر کی گواہی دے کر ان کا تو سب کیا دھرا اکارت (ضائع) ہے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابو بکر جصاص اپنی معرکہ آراء تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں کو مسجد میں داخل ہونے، مساجد کی تعمیر کرنے، اس کے مصالح کا انتظام و انصرام کرنے اور مسجد کا منتظم بننے سے روک دیا جائے، کیونکہ اس آیت میں دونوں (تعمیر کرنا اور آباد کرنا) شامل ہیں۔ اسی طرح ابن جریر طبری اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر تم اسلام، ہجرت اور جہاد میں ہم سے سبقت لے گئے ہو تو ہم بھی مسجد الحرام کی تعمیر کرتے ہیں، ہم بھی حجاج کو پانی پلاتے ہیں، اسیروں کو چھڑواتے ہیں، تو اللہ رب العزت نے یہ آیت نازل فرمائی کہ مشرکین کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسجد کی تعمیر کریں۔[2]

اس آیت کا حکم بیان کرتے ہوئے قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ خود مساجد کی تعمیر کریں کیونکہ مساجد صرف اللہ وحدہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کا منکر ہے، اسے مسجد کی تعمیر کا کام سونپنا درست نہیں ہے۔ بعض علماء کا

---

[1]۔ سورۃ التوبہ ۹:۱۸۔۱۷

[2]۔ طبری، محمد ابن جریر، ابو جعفر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۱۰، ص ۶۷

خیال ہے کہ تعمیرِ مسجد سے مراد معروف تعمیر ہے، یعنی مسجد کی عمارت بنانا اور اگر وہ گر جائے تو اس کی مرمت کرنا۔ تو کافر کو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ اگر وہ بوقتِ موت وصیت کرے کہ میرے مال سے مسجد تعمیر کر دی جائے تو اسکی وصیت باطل ہے۔"[1]

امام ابو بکر جصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ کفار کو مساجد کی تعمیر سے منع کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مساجد صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہو اس کو مساجد بنانے کا کوئی حق نہیں ہے۔"[2]

مولانا محمد جلال الدین قادری احکام القرآن میں مصنف ابن ابی شیبہ باب الاستعانہ بالمشرکین میں سید عالم ﷺ کے ارشاد گرامی: ہم مشرک سے مدد نہیں لیتے، سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسجد کے معاملات و انتظامات چلانے کے لئے غیر مسلم اور بد مذہب سے امداد حاصل کرنا جائز نہیں۔"[3]

عصرِ حاضر کے حوالے سے اس جدید موضوع پر کلام کرتے ہوئے ڈاکٹر انعام اللہ، اجتہاد کے شمارہ نمبر ۱۲ میں ابن کثیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"مسلمان کے لیے غیر مسلموں کے رفاہی اداروں میں چندہ دینا جائز ہے بشرطیکہ چندہ میں زکوۃ یا دیگر صدقات واجبہ شامل نہ ہوں۔ البتہ مسلمانوں کی امداد کرنا بہر حال زیادہ افضل اور زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ تاہم، اگر کوئی رفاہی ادارہ اپنے غیر اسلامی مذہب کی تبلیغ کرتا ہو یا دنیا میں کہیں بھی اسلام یا مسلمانوں کو کسی بھی قسم کا نقصان

1۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۴، ص۱۷۸

2۔ جصاص، ابو بکر احمد رازی، احکام القرآن، دار الفکر، ج۳، ص۱۳۰

3۔ جلال الدین قادری، مولانا، محمد، احکام القرآن، ج۷، ص۱۶۳

پہنچانے کے درپے ہو، تو کسی بھی مسلمان کے لیے ایسے ادارے میں چندہ دینا جائز نہیں ہو گا۔ اسی طرح چرچ، مندر یا غیر مسلموں کے کسی بھی عبادت خانہ میں مسلمان کا چندہ دینا جائز نہیں ہے۔"[1]

غیر مسلموں کے ناموں پر نام رکھنے کا حکم:

کسی بھی آدمی کی شخصیت کا اہم حصہ اس کا نام ہوتا ہے، جس سے وہ پہچانا اور پکارا جاتا ہے جیسے کتاب کا نام اس کی شناخت ہوتا ہے، ویسے ہی کسی شخص کا نام اس کی پہچان بنتا ہے۔ نام گھریلو ماحول اور تہذیبی روایات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو اسلامی شناخت برقرار رکھنے کے لیے اسلامی نام بطورِ خاص رکھنا چاہیے۔ تاہم، ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلموں کی تہذیب و ثقافت سے مرعوب ہو کر اپنے بچوں کے اسلامی ناموں کو بھی ترک کر رہے ہیں۔ اگر کسی بچے کا نام آدم ہے، تو جانتے ہوئے بھی کہ یہ عربی مسلمان کی تہذیبی اور تاریخی پہچان ہے، اسے ایڈم کہا جاتا ہے۔ یوسف کو بلاوجہ جوزف پکارا جاتا ہے۔ مغربی معاشرے میں رچ بس جانے کے لیے اسلامی ناموں کے ساتھ ساتھ کافروں کے مشہور نام بھی رکھے جاتے ہیں۔ راقم سے پڑھنے والے ایک طالب علم سے جب نام پوچھا گیا تو جواب ملا، میرا نام سینڈی ہے، جس کا معنی ہے تباہی کے لیے پھرنے والا۔ مسلمانوں کو بطورِ خاص اپنے بچوں کے نام بامعنی اور حضرات انبیاء، صحابیات کے ناموں پر رکھنا ضروری ہے۔ والدین پر بچوں کا حق ہے کہ انہیں نام کے ذریعے اسلامی شناخت دیں۔ حدیث رسول ہے:

﴿عن ابی الدرداء قال: قال رسول الله ﷺ :انکم تدعون یوم القیامة باسمائکم ،واسماء آبائکم ،فاحسنوا اسماء کم[2]﴾

حضرت ابو درداء راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تم اپنے اور اپنے باپ دادا کے ناموں سے پکارو جاؤ گے، تو اپنے نام اچھے رکھا کرو۔

1۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص ۱۲

2۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء، رقم الحدیث: ۴۹۴۸

ترمذی میں حدیثِ پاک ہے:

﴿احب الاسماء الی اللہ عزوجل عبداللہ و عبدالرحمٰن[1]﴾

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔"

اگر کسی کا نام بے معنیٰ، بے مطلب، لایعنی اور گناہ پر دلالت کرنے والا ہو تو اسے بدل دینا حضور علیہ السلام کی سنت ہے۔ حدیث مبارکہ ہے:

﴿عن ابن عمر: "ان رسول اللہ ﷺ غیر اسم عاصیۃ و قال: انت جمیلۃ"[2]﴾

حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی صاحبزادی کا نام عاصیہ (گناہگار) تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام بدل کر جمیلہ رکھ دیا۔

ترمذی میں حدیث پاک ہے:

﴿عن عائشہ: ان النبی ﷺ کان یغیر الاسم القبیح[3]﴾

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں: بیشک نبی کریم ﷺ برے ناموں کو تبدیل کر دیا کرتے تھے۔

علامہ غلام رسول سعیدی، بچوں کا نام رکھنے، غلط طریقے سے نام لینے اور بگاڑنے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں نام رکھنے کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ اپنے بچے کا نام عبدالرحمن یا عبدالخالق رکھتے ہیں اور پھر اسے رحمٰن صاحب یا خالق صاحب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ کسی کا نام عبدالغفور ہوتا ہے اور لوگ اسے غفورا، غفورا کہہ کر پکارتے ہیں۔ کسی کا نام، انعام الٰہی ہوتا ہے اور لوگ اسے الٰہی صاحب کہہ دیتے ہیں۔

---

[1]۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، کتاب الادب، باب ماجاءمایستحب من الاسماء، رقم الحدیث: ۲۸۳۳

[2]۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسم القبیح، رقم الحدیث: ۴۹۵۲

[3]۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی تغییر الاسماء، رقم الحدیث: ۲۸۲۹

یہ صورتحال پڑھے لکھے لوگوں میں بھی دیکھی جاتی ہے۔ پنجاب کے ان پڑھ لوگوں میں تو یہ اور بھی عام ہے؛ وہ غلام محمد کو "گاما" اور غلام رسول کو "سولا" کہتے ہیں، اور جس کا نام "کنیز" ہو، اسے "پھتو" کہتے ہیں۔ دوسری بڑی خرابی نام رکھنے کے حوالے سے یہ ہے کہ لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا نام منفرد ہو اور انہیں یہ شوق ہوتا ہے کہ ان کے بچے کا نام نیا اور اچھوتا ہو، چاہے اس کا مطلب یا معنی کچھ بھی نہ ہو۔ اس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ لوگ "شرجیل" نام رکھتے ہیں، حالانکہ یہ مہمل لفظ ہے، اور اصل لفظ "شَرَحبِیل" ہے۔ اسی طرح بچیوں کا نام "ثوبیہ" رکھا جاتا ہے، جو کہ مہمل لفظ ہے، اور اصل لفظ "ثُوَیبَۃ" ہے۔ بہترین نام عبد اللہ اور امۃ اللہ ہیں۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نام گھریلو ماحول اور تہذیبی روایات کی عکاسی کرتا ہے۔ غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو اسلامی شناخت برقرار رکھتے ہوئے اسلامی نام بطورِ خاص اپنانے چاہئیں اور اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام، حضراتِ صحابہ و صحابیات کے ناموں پر رکھنے کو ہر صورت رواج دینا چاہیے، تاکہ مسلمانوں کی تہذیبی شناخت ناموں کی صورت میں بھی برقرار رہے۔ مسلمان کو اپنی تہذیب اور ثقافت مغربی ثقافت میں تحلیل نہیں کرنی چاہیے۔

ملک شام کے مشہور مفکر ڈاکٹر سعید رمضان بوطی فرماتے ہیں کہ پہلے ہم یہ جان کر خوش تھے کہ مغربی ممالک میں مسلمانوں کی تعداد اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے بڑھ رہی ہے، اور ہمارا تاثر یہ تھا کہ آہستہ آہستہ مغربی ثقافت، اسلامی ثقافت میں تحلیل ہو جائے گی، لیکن آج کل فقہ الاقلیات کی تدوین کی شدید ضرورت کی آواز سن کر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ حقیقت ہماری خوش کن توقعات کے برعکس ہے۔ فقہ الاقلیات کے پردے میں ہماری ثقافت کے مغربی ثقافت میں تحلیل ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔[2]

---

[1]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج۴، ص ۴۹۲

[2]۔ تنویر احمد، یورپی مجلس برائے افتاء و تحقیق، در مشمولہ، اجتماعی اجتہاد، تصور ارتقاء اور عملی صورتیں، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۴۵۲

اس فصل کا **خلاصہ** یہ ہے کہ مسلمان کے لیے اسلامی شناخت اور اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اسلامی طور طریقوں سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک مسلمان کو جان لینا چاہیے کہ توحید اور رسالت اس کے ایمان کا جزو اعظم ہیں۔ معاشرت، اخلاق، عبادات اور معاملاتِ زندگی اس کے لوازم ہیں اور اسلام بلا قیدِ زمان و مکان ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ اسلام کی اپنی پہچان اور اپنی اقدار ہیں۔ تکثیری معاشروں میں مسلمانوں کے لیے شرعی احکام کا التزام کرنا اور بھی ضروری اس لیے ہو جاتا ہے تاکہ غیر مسلم مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل اور معاملاتِ حیات کو دیکھ کر اسلام سے رغبت رکھیں اور اللہ رب العزت ان کے دلوں کو اسلام کی روشنی سے منور فرمادے۔

باب چہارم:
مسلم اقلیات ملکی قوانین کی پاسداری اور دینی ذمہ داریاں فقہی تفاسیر کی روشنی میں

فصل اول: مسلم اقلیات پر عائد ملکی قوانین کی پاسداری

فصل دوم: مسلم اقلیات کی مطلوبہ دینی ذمہ داریاں

فصل سوم: معاشی و تجارتی معاملات سے متعلق مسائل اور ان کا حل

فصل چہارم: حلال و حرام سے متعلق مسائل اور ان کا حل

فصل اول

مسلم اقلیات پر عائد ملکی قوانین کی پاسداری

معاشرے کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک وہاں امورِ زندگی سر انجام دینے کے لیے قوانین نہ بنائے جائیں۔ سماج کی ترقی کا انحصار مروجہ قوانین پر عمل کرنے پر ہی ہوتا ہے۔ عصر حاضر میں دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک کی خوشحالی کی ایک بڑی وجہ قانون کا احترام ہے۔ کسی بھی ملک کا آئین اور قانون کی حکمرانی صرف حکومتِ وقت کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ اس میں معاشرے کے ہر فرد کا کردار ناگزیر ہوتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں حاکم وقت اور قانون کی پیروی:

اسلام لا قانونیت کو سخت ناپسند کرتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ایک نظم اجتماعی کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک مشہور و معروف فقہی اصول ہے:

﴿تصرف الامام بالرعية منوط بالمصلحة[1]﴾

"رعایا کے لئے امام اور حاکم وقت کا تصرف اور حکم اس وقت معتبر ہو گا جب وہ کسی مصلحت پر مبنی ہو۔"

دین اسلام ہمیں ایسے تمام قوانین کی اتباع اور پیروی کا حکم دیتا ہے جو اللہ رب العزت کے احکامات کے مخالف نہ ہوں۔ دوسروں کی جان ومال کی حفاظت کے لیے شریعت محمدی ﷺ نے حاکم کو اختیار دیا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے مختلف اقدامات اور قوانین وضع کرے۔ ان قوانین کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایسے قوانین جو مخالفِ شریعت نہ ہوں اور کسی مصلحت پر مبنی ہوں۔

۲۔ ایسے قوانین جو شریعت کے مخالف ہوں۔

---

[1]۔ بدرالدین محمد بن عبد اللہ الزرکشی، المنثور فی القواعد الفقهية، وزارة الاوقاف الكويتية، ج ۱، ص ۳۰۹

اگر حکومت ایسے قوانین بنائے جو شریعت اسلامیہ کے معارض نہ ہوں اور وہ قوانین کسی مصلحت پر مبنی ہوں تو ان کی اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾[1]

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کا حکم مانو اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں پھر اگر تم میں کسی بات کا جھگڑا اٹھے تو اُسے اللہ و رسول کے حضور رجوع کرو اگر اللہ و قیامت پر ایمان رکھتے ہو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام سب سے اچھا۔

رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:

على المرء المسلم الطاعة فيما احب و كره، الا ان يومر بمعصية: فمن امر بمعصية فلا طاعة له[2]

"مسلمان پر اطاعتِ امیر لازم ہے۔ خواہ یہ اس حاکم کو پسند کرے یا ناپسند البتہ اگر کسی گناہ کا حکم دے تو پھر اس کی اطاعت نہ کرے۔"

درج بالا آیت میں "اولی الامر" سے مراد امراء اور حکام ہیں۔ علامہ غلام رسول سعیدی مذکورہ آیت کی تفسیر میں مختلف تفسیری اقوال ذکر کرتے ہوئے طبری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "اولی الامر منکم" سے مراد، امراء اور حکام ہیں۔ ابن وہب نے کہا: اس سے مراد سلاطین ہیں۔ مجاہد نے کہا: اس سے مراد اصحاب فقہ ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے مراد اہل دین اور اہل فقہ ہیں، یعنی دیندار علماء۔ عطاء بن سائب نے کہا: اس سے مراد صاحبان علم اور اصحاب فقہ ہیں۔ حسن بصری نے

1۔ سورۃ النساء ۴:۵۹

2۔ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۲۴ھ، ج ۸، ص ۵۰۳

کہا: اس سے مراد علماء ہیں۔ مجاہد سے ایک روایت یہ ہے کہ اس سے مراد صحابہ ہیں۔ امام ابن جریر نے فرمایا: ان اقوال میں اولیٰ یہ ہے کہ "اولی الامر" سے مراد ائمہ اور حکام ہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: "عنقریب میرے بعد حکام ہوں گے (ان میں) نیک حاکم بھی ہوں گے اور فاسق بھی، تم ان کے احکام سننا اور ان کا جو حکم حق کے موافق ہو اس میں ان کی اطاعت کرنا، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا۔ اگر وہ نیک کام کریں گے تو اس میں تمہارا اور ان کا نفع ہے اور اگر وہ برے کام کریں گے تو تم کو نفع ہو گا اور ان کو ضرر۔" اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "مسلمان شخص پر حکم کی اطاعت لازم ہے خواہ اس کو وہ حکم پسند ہو یا نہ ہو، ہاں اگر اس کو اللہ کی معصیت کا حکم دیا جائے تو خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔"[1]

امام ماوردی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> "اس آیت میں اولی الامر سے مراد، امراء اور حکام ہیں۔ اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب رسول اللہ ﷺ نے عمار بن یاسر اور خالد بن ولید کو ایک جماعت کا امیر بنا کر جہاد کے لیے روانہ کیا۔"[2]

احادیث کی روشنی میں حاکم وقت اور قانون کی پیروی:

فرامین رسول ﷺ کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حاکم وقت کے مصلحت عامہ پر مبنی قوانین کی پاسداری کرنا ایک مسلمان کے لئے لازم اور ضروری ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿سَتَكُونُ أَثَرَةٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا ، قَالُوا : يَا رَسُولَ اللهِ فَمَا تَأْمُرُنَا قَالَ: تُؤَدُّونَ الْحَقَّ الَّذِي عَلَيْكُمْ وَتَسْأَلُونَ اللهَ الَّذِي لَكُمْ﴾[3]

---

[1] ۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، فرید بک سٹال، اردو بازار، لاہور، ج ۲، ص ۷۰۴-۷۰۵

[2] ۔ الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد، تفسیر الماوردی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج ۱، ص ۵۰۰

[3] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، دار صادر، بیروت، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام، رقم الحدیث: ۳۶۰۳

"میرے بعد تم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں تم پر دوسروں کو مقدم کیا جائے گا اور ایسی باتیں سامنے آئیں گی جن کو تم برا سمجھو گے۔" لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس وقت ہمیں آپ کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو حقوق تم پر دوسروں کے واجب ہوں انہیں ادا کرتے رہنا اور اپنے حقوق اللہ ہی سے مانگنا۔ (یعنی صبر کرنا اور اپنا حق لینے کے لیے خلیفہ اور حاکم وقت سے بغاوت نہ کرنا) "

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حاکمِ وقت کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِنْ أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ[1]﴾

مسلمان شخص پر حاکم کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہے، وہ بات اس کو پسند ہو یا ناپسند، سوائے اس کے کہ اسے گناہ کا حکم دیا جائے، اگر اسے گناہ کا حکم دیا جائے تو اس کی اطاعت کرنا لازم نہیں ہے۔"

اولی الامر کی تفسیر کرتے ہوئے امام مسلم ایک اور حدیثِ پاک بیان کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ، وَمَنْ يَعْصِنِي فَقَدْ عَصَى اللهَ، وَمَنْ يُطِعِ الْأَمِيرَ فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ يَعْصِ الْأَمِيرَ فَقَدْ عَصَانِي[2]﴾

"جس نے میری پیروی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی پیروی کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور جو حاکم کی اطاعت

---

[1] ۔ مسلم، مسلم بن حجاج قشیری، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ و تحریمھا فی المعصیۃ، رقم الحدیث: 4763

[2] ۔ ایضاً، رقم الحدیث: ۱۸۳۵

کرے، تو اس نے میری اطاعت کی اور جس نے اس کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔"

ایک مسلمان کو حاکم وقت کی اطاعت کا حکم ہے قطع نظر اس کے کہ وہ حاکم ادنیٰ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿اسمعوا واطیعوا وان استعمل حبشی کان راسه زبیبه[1]﴾

"حکم مانو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر ایک حبشی غلام جس کا سر کشمش کی مانند ہو (یعنی ادنی غلام)، حاکم مقرر ہو جائے۔"

ایک شبہ کا ازالہ:

علامہ غلام رسول سعیدی سورۃ النساء:۵۹ کے تحت لکھتے ہیں: اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسول کی اطاعت کے علاوہ اولی الامر (علماء اور حکام) کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبان امر ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں علماء اور حکام کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ پس اگر اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی اور کے احکام کی اطاعت کرنا اس کی عبادت کرنے کے مترادف ہے، تو گویا اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں علماء اور حکام کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مطلقاً دوسروں کے احکام کی اطاعت کرنا ان کی عبادت نہیں ہے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ کے احکام کے برعکس دوسروں کی اطاعت کی جائے، یا اللہ اور رسول کے احکام کی نافرمانی میں دوسروں کی اطاعت کی جائے تو یہ ان کی عبادت کرنا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۸۳۹ میں آیا ہے:

---

[1] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب امامة العبد والمولیٰ، رقم الحدیث:۶۹۳

"حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:
مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ حکام کے احکام سنیں اور ان کی اطاعت کریں خواہ وہ احکام ان کی خواہش کے موافق ہوں یا خلاف ماسوا اس صورت کے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کا حکم دیا جائے۔"[1]

مخالفِ شریعت قوانین کی اطاعت و فرمانبرداری:

ایسے قوانین جو قرآن و سنت سے متصادم ہوں، جن میں اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی پائی جاتی ہو یا جن میں سنتِ رسول ﷺ کی تحقیر یا تخفیف کا اندیشہ ہو، ایسے قوانین کی پاسداری کرنا شرعاً ناجائز اور گناہ ہے۔ سورہ لقمان میں اللہ رب العزت نے جہاں والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کا بطور خاص حکم دیا ہے، وہیں شرک و معصیت میں ان کی پیروی کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾[2]

(اور اگر وہ دونوں تجھ سے کوشش کریں کہ میرا شریک ٹھہرائے ایسی چیز کو جس کا تجھے علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان!)

مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ناجائز کاموں میں والدین کے حکم کی پیروی کرنا بھی ناجائز ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں کہ والدین اگر کسی فرض کو ترک کرنے یا مکروہ تحریمی پر عمل کرنے کا حکم دیں تو ان کا کہا ماننا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کو چھوڑ کر کسی غیر کے حکم کی پیروی کرنا شرک معنوی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا جا چکا ہے کہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں ہے۔ البتہ جب والدین ایسی مباح چیز کا حکم دیں جو عقلاً اور شرعاً ممنوع نہ ہو تو ان کی اطاعت و پیروی واجب ہے۔ لیکن اگر والدین کثرتِ ذکر، نوافل کو ترک

---

[1]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج۹، ص ۸۰۴-۸۰۵

[2]۔ سورۃ القمان ۳۱:۱۵

کرنے، یا ضرورت سے زائد مال کمانے سے رکنے کا حکم دیں، تو کیا ان کا کہا ماننا واجب ہے؟ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں ان کا کہا ماننا واجب نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے جو اس کی طرف مائل ہو۔ کثرت نوافل، لغوی چیزوں کو ترک کرنا، دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونے والوں کا راستہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے ماں باپ کی رضا کے بغیر اپنے وطنوں کو چھوڑ کر ہجرت کی اور اپنی جانیں اور اموال اللہ کے راستے میں خرچ کیے۔[1]

صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث پاک ہے جس میں غیر شرعی امور کی بجاء آوری سے منع کیا گیا ہے۔

﴿عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، قَالَ : بَعَثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَرِيَّةً ، فَاسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنَ الأَنْصَارِ وَأَمَرَهُمْ أَنْ يُطِيعُوهُ ، فَغَضِبَ ، فَقَالَ : أَلَيْسَ أَمَرَكُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ تُطِيعُونِي ؟ قَالُوا : بَلَى ، قَالَ : فَاجْمَعُوا لِي حَطَبًا ، فَجَمَعُوا ، فَقَالَ : أَوْقِدُوا نَارًا ، فَأَوْقَدُوهَا ، فَقَالَ : ادْخُلُوهَا ، فَهَمُّوا ، وَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يُمْسِكُ بَعْضًا ، وَيَقُولُونَ : فَرَرْنَا إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ النَّارِ ، فَمَا زَالُوا حَتَّى خَمَدَتِ النَّارُ ، فَسَكَنَ غَضَبُهُ ، فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَوْ دَخَلُوهَا مَا خَرَجُوا مِنْهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ[2]﴾

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مختصر لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر ایک انصاری صحابی (عبد اللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ) کو بنایا اور لشکریوں کو حکم دیا کہ سب اپنے امیر کی

---

[1]۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۷، ص۳۷۶

[2]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری ،کتاب المغازی، باب سریہ عبد اللہ بن حذافۃ السھمی و علقمہ بن مجزز المدلجی، رقم الحدیث: ۴۳۴۰

اطاعت کریں۔ پھر امیر کسی وجہ سے جلال میں آگئے اور اپنی افواج سے پوچھا کہ کیا تمہیں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے میری اطاعت کرنے کا حکم نہیں دیا؟ سب نے کہا کہ ہاں! فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: پھر تم سب لکڑیاں جمع کرو۔ انہوں نے لکڑیاں جمع کیں تو امیر نے حکم دیا کہ اس میں آگ لگاؤ، انہوں نے آگ لگا دی۔ امیر نے حکم دیا کہ سب اس میں کود جاؤ۔ سپاہی کود جانا ہی چاہتے تھے کہ انہیں میں سے بعض نے بعض کو روکا اور کہا کہ آگ سے بچنے کے لئے ہی تو ہم نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا دامن پکڑا ہے۔ ان باتوں میں وقت گزر گیا اور آگ بھی بجھ گئی۔ اس کے بعد امیر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ جب اس کی خبر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو پہنچی تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس میں کود جاتے تو پھر قیامت تک اس میں سے نہ نکلتے۔ اطاعت کا حکم صرف نیک کاموں کے لیے ہے۔"

علامہ امین احسن اصلاحی نے مذکورہ مسئلے پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ہم ان کی گفتگو کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کے نزدیک حکومت کی چار اقسام ہیں:

پہلی قسم: ایسی حکومت جہاں اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات کی پابندی کی جاتی ہو اور دین اسلام کو بطور قانون نافذ کر دیا گیا ہو۔ اس قسم کی حکومت کے بارے میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے واضح ہدایات دی ہیں کہ اس کی ہر حال میں اطاعت کی جائے، اور اس کی نافرمانی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی قرار دیا ہے۔ ایسی حکومت کی اطاعت نہ کرنے والا جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ بشری کمزوریوں کے باعث اس حکومت میں چند خامیاں پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن ان خامیوں کے باوجود اس کی نافرمانی جائز نہیں۔ البتہ، ان خامیوں کے خلاف آواز اٹھانا ضروری ہے۔

دوسری قسم: ایسی حکومت جہاں بظاہر اسلام کا نام لیا جاتا ہو اور بعض معاملات میں اس کی پیروی بھی کی جاتی ہو، لیکن اس کے ساتھ ظلم اور کرپشن بھی موجود ہو۔ موجودہ دور کے زیادہ

تر مسلم ممالک ایسی حکومتوں کی مثال ہیں۔ اس قسم کی حکومت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ ہدایت دی ہے کہ ان کی اطاعت اس وقت تک کی جائے جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے خلاف کوئی حکم نہ دیں۔ ظلم اور کرپشن کے خلاف آواز اٹھانا اور معاشرے اور حکومت کی اصلاح کی کوشش جاری رکھنا ضروری ہے۔ البتہ، ایسی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت جائز نہیں۔ آئین اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے برائی کے خلاف جدوجہد کرنا مسلمانوں پر اجتماعی طور پر لازم ہے۔

تیسری قسم: ایسی حکومت جس میں غیر مسلم حکمران ہوں، لیکن مسلمانوں کو اپنے دین اور پرسنل لاء پر عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ اگر مسلمان کے پاس یہ اختیار ہو کہ وہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی اسلامی ماحول والے ملک میں جا سکتا ہے، تو ایسا کرنا بہتر ہے۔ بصورت دیگر، اسے اسی معاشرے میں رہتے ہوئے اپنے دین پر عمل کرنا چاہیے اور دنیاوی معاملات میں حکومت کی اطاعت بھی کرنی چاہیے۔ ایسی حکومت کے خلاف بھی مسلح بغاوت جائز نہیں۔ یہ ایسی ہی مثال ہے جیسے اگر کسی کے والدین غیر مسلم ہوں تو ان کے ساتھ عدل و احسان کا سلوک کرنا لازم ہے، مگر دین کے معاملے میں ان کی مداخلت قبول نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ دور کی مغربی ممالک کی حکومتیں اس کی مثال ہیں۔

چوتھی قسم: ایسی حکومت جس میں اہل اسلام کو اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی حاصل نہ ہو، بلکہ انہیں کفر اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے، چاہے اس کے حکمران غیر مسلم ہوں یا نام نہاد مسلمان۔ ماضی قریب کے سوویت یونین جیسی حکومتیں اس کی مثال ہیں، جہاں دین پر عمل کرنے والوں کو زبردستی اپنے دین کو ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کے پاس تین راستے ہیں: پہلا ہجرت کرنا، دوسرا: مسلح جدوجہد، تیسرا صبر کرنا۔ موجودہ دور میں ویزے کی پابندیوں کی وجہ سے کمیونٹی کے لیے ہجرت کرنا ممکن نہیں رہا۔[1]

---

[1]۔ اصلاحی، امین احسن، مولانا، اسلامی ریاست، ص ۲۴۰-۲۶۷

ثابت ہوا کہ گناہ کے کاموں میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ ایک بندۂ مومن کے لیے امیر اور اس کے بنائے گئے قانون کی اطاعت اس وقت تک ضروری ہے جب تک وہ قوانین معصیت اور پروردگارِ عالم کی نافرمانی سے پاک ہوں۔ لیکن اگر قوانین میں معصیت شامل ہو جائے تو ایسے معصیت زدہ قوانین کی پاسداری مومن پر واجب نہیں ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل حکومتِ پاکستان کی جانب سے شائع ہونے والے مجلہ اجتہاد میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء سے یہ سوال دریافت کیا گیا کہ کیا ایک مسلمان، جب کسی دوسری ریاست کی شہریت قبول کرتا ہے، شرعاً اس ملک کے قوانین اور آئین کا پابند ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں عہدِ حاضر کے مایہ ناز مفکرین نے اپنی آراء پیش کیں۔ ذیل میں ہم چند مفکرین کی آراء تحریر کرتے ہیں۔ معروف اسکالر مولانا زاہد الراشدی صاحب کا کہنا تھا:

> "بالکل پابند ہے، اگر اس نے شہریت قبول کی ہے تو یہ ایک معاہدے کے تحت کی ہے۔ یہ معاہدہ ہے۔ معاہدات کی پابندی کے حوالے سے اصول یہ ہے کہ انسان کو پہلے سوچنا چاہیے کہ وہ یہ معاہدہ کرے یا نہ کرے۔ لیکن جب معاہدہ کر لیا جائے تو اس کی پابندی ضروری ہے، الا یہ کہ وہ کسی نصِ قطعی کے خلاف ہو۔ ایسی صورت میں وہ اپنا حق مانگے گا اور مطالبہ کرے گا، لیکن بغاوت نہیں کرے گا۔"

مفتی محمد صدیق ہزاروی (جامعہ ہجویریہ لاہور کے شیخ الحدیث اور سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل) کی رائے یہ تھی کہ اگر ایسے قوانین ہیں جو ملکی سطح پر ملک اور معاشرے کے مفاد میں ہیں، اور وہ ہمارے اسلامی نظریات یا اسلامی احکام سے متصادم نہیں ہیں، تو ان کی پابندی بالکل کرنی چاہیے۔ کیونکہ جہاں آدمی رہتا ہے، اگر وہ ان قوانین کی پابندی کرے گا، تو تبھی وہاں امن قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ قوانین، مثلاً، شراب پینے کو لازم قرار دیتے ہیں یا اس طرح کی دیگر غیر اسلامی چیزیں ہیں، تو وہاں مسلمان قطعاً ان کی پابندی نہیں کرے گا۔"

مولانا امیر حمزہ، جن کا شمار جماعت الدعوہ کے بانیوں میں ہوتا ہے، نے اس سوال کا کھل کر جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں پہلے بھی مثال دے چکا ہوں کہ سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام نے (فی دین الملك) یعنی بادشاہ کے قانون (یہاں دین کا مطلب قانون ہے) کا خیال رکھا تھا۔ جب شریعت یہی ہو تو حضرت یوسف علیہ السلام بھی مصر کے شہری تھے اور مصر کے وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے اس آئین اور دستور کا خیال رکھا۔ لہٰذا، آج بھی جو لوگ غیر مسلم ممالک کے شہری ہیں، انہیں سورہ یوسف اور حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ کو سامنے رکھتے ہوئے وہاں کے قانون کا احترام کرنا ہوگا۔"[1]

جن کے پاس ویزا نہیں ہے ان پر ملکی قوانین کی پاسداری:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی غیر اسلامی ممالک کا باقاعدہ شہری نہ ہو، مگر اس نے سکونت کے لیے عارضی اجازت نامہ (ویزا) حاصل کیا ہو، تو کیا اس پر بھی وہی احکام لازم ہوں گے جو ایک شہری پر لاگو ہوتے ہیں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے صاحبِ ہدایہ لکھتے ہیں:

﴿اذا دخل المسلم دار الحرب تاجرا فلا یحل له ان یتعرض بشیء من اموالهم ولا من دمائهم لانه ضمن ان لا یتعرض لهم بالا ستیمان فالتعرض بعد ذالك یکون غدراً والغدر حرام الا اذا غدربهم ملکهم فاخذاموالهم اوحبسهم اوفعل غیره بعلم الملك ولم یمنعه لانهم هم الذین نقضوالعهد بخلاف الاسیر لانه غیر مستامن فیباح له التعرض وان اطلقوه طوعاً[2]﴾

"یعنی اگر کوئی مسلمان بغرض تجارت دارالحرب میں داخل ہوا تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ کفار کے جان و مال کو نقصان پہنچائے، کیونکہ اس نے امان لینے سے یہ عہد کر لیا کہ کفار سے کوئی تعرض

---

[1] ۔ اجتہاد، مسلم اقلیات اور غیر مسلم معاشرے، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۱۹، مولانا امیر حمزہ سے مکالمہ و گفتگو، ص ۱۸۶، ص ۱۸۹، ص ۱۹۳

[2] ۔ مرغینانی، برہان الدین، الھدایۃ مع اردو ترجمہ عین الھدایۃ، ج ۲، ص ۵۶۱

> نہیں کرے گا۔ اس کا تعرض کرنا غدر (یعنی دھوکا) ہے اور غدر بالا جماع حرام ہے، لیکن اگر مسلمان تاجروں کے ساتھ کفار کے بادشاہ یا حکومت نے غدر کیا اور ان کے اموال چھین لیے، یا انہیں قید کر دیا، یا حکومت کے علم کے باوجود دوسرے کفار نے ایسا کیا اور بادشاہ نے نہیں روکا تو مسلمان تاجر پر عہد نہیں رہا کیونکہ کفار نے خود عہد توڑا۔ بخلاف اس کے اگر کفار کسی مسلمان کو قید کر کے اپنے ملک میں لے گئے تو وہ جو چاہے کرے، کیونکہ اس نے امان کا عہد نہیں کیا ہے۔ بس اسے ہر طرح کا تعرض مباح ہے، اگرچہ کافروں نے اسکو اپنی خوشی سے رہا کیا ہو۔"

اگر کوئی فقہی موشگافیوں کا سہارا لے کر یہ کہے کہ میں کوئی عہد کیے بغیر یا ویزا لیے بغیر یہاں آیا ہوں اور مجھ پر اس ملک کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا، تو وہ دوہرا مجرم ٹھہرے گا۔ **اولاً،** غیر قانونی رہائش اختیار کرنے کا، اور **ثانیاً،** فلاحِ عامہ کے لیے نافذ کردہ قوانین کو نظر انداز کرنے کا۔ لہٰذا، اگر کسی مسلمان نے عارضی سکونت نامہ حاصل کیا ہو یا بغیر ویزے کے غیر قانونی طور پر کسی ملک میں رہائش پذیر ہو، تو کسی بھی قسم کی پریشانی سے بچنے کے لیے اس پر ملکی قوانین کی پاسداری کرنا ضروری ہے۔

سابقہ اقبال اکیڈمی لاہور کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سہیل عمر سے پوچھا گیا کہ کیا ایک مسلمان کے لیے غیر مسلم ریاست کی شہریت قبول کرنے کے بعد وہاں کے آئین و قوانین کی پابندی کس حد تک ضروری ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا:

"جی بالکل ضروری ہے۔ اس کو کسی نے مجبور نہیں کیا کہ وہ دوسری ریاست کی شہریت قبول کرے اور قبول کرنے کے لمحے میں اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ وہ کسی آئین کی وفاداری کا حلف اٹھا رہا ہے، اور اس آئین میں کیا اس کے دین سے براہ راست ٹکراؤ کی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ اس کے بعد وہ اس ملک کے قوانین اور آئین کا پابند ہو گا۔ اولاً، ایسی صورتحال کمیونسٹ روس

اور اس کی ذیلی ریاستوں کے سوا مسلمانوں کو کہیں پیش نہیں آئی کہ شرک یا عقائد سے براہ راست ٹکرانے والی کسی صورتحال کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ باقی ہر جگہ اور جس ملک میں جا کر آپ شہریت قبول کرتے ہیں، وہاں کے آئین میں ڈھیلا ڈھالا کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے جو آپ کے دین سے نہیں ٹکرا رہا ہوتا اور وہ آپ کو شہری آزادی اور مذہبی آزادی بھی فراہم کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ذیلی قوانین بھی ہوتے ہیں جو ہمارے دینی نقطہ نظر سے مباحات کے دائرے میں آتے ہیں، جن کو انسان اپنے شہری معاشرے کے لیے بناتا ہے۔ معروف دانشور اور ماہر اقبالیات جناب احمد جاوید نے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> "اگر اس ملک کے قوانین اور آئین اس مسلمان کو بعض حالتوں میں مسلمان نہ رہنے پر مجبور کر دیں تو یہ شرعاً بالکل ناجائز ہونا چاہیے، مطلب کہ میں ایک غیر عالم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ لیکن اگر میرے دینی تشخص اور میرے دینی وجود سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہے تو پھر مجھے اس ملک کی شہریت قبول کرتے ہوئے اس کے آئین و قانون کو بھی تسلیم کرنا ہوگا، اور پھر آئین اور قانون کی خلاف ورزی کرنا شرعاً مذموم بات ہے۔"

شیعہ علماء میں سے ریاض حسین نجفی، جو کہ حوزہ علمیہ جامع المنتظر لاہور کے پرنسپل ہیں، نے اپنے مذکورہ سوال کے جواب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس ملک کی شہریت ہم قبول کرتے ہیں، اسلامی رو سے اور اخلاقاً بھی ہمیں اس ملک کے قانون کی پابندی کرنی چاہیے۔ جتنے بھی قوانین ہیں، یہ سارے کے سارے رفاہِ عامہ کے لیے ہوتے ہیں۔ قانون صرف اسلام ہی نہیں بناتا، بلکہ انسان بھی اپنے طور پر قوانین بناتے ہیں، جیسے ٹریفک کے قوانین ہیں، کسٹم کے قوانین ہیں وغیرہ۔ انہوں نے قوانین رفاہِ عامہ کے لیے بنائے ہیں، جب رفاہِ عامہ کے لیے بنائے ہیں تو انسان بھی، مسلمان بھی انہی میں فرد ہے، اسے

چاہیے کہ وہ ان قوانین کی پابندی کرے۔ جب قوانین میں ہمارے اور ان کے درمیان حرام اور حلال کا فرق ہے تو وہ ان کے رواج ہیں، وہ قانون کا حصہ نہیں ہیں۔"[1]

جاوید احمد غامدی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ مشہور مفسر مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد ہیں اور دینی موضوعات کی تعبیر و تشریح میں اپنا خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ آپ سے جب یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا ایک مسلمان کے لیے غیر مسلم ریاست کی شہریت قبول کرنے کے بعد وہاں کے آئین و قوانین کی پابندی کس حد تک ضروری ہے؟ تو انہوں نے اپنے مخصوص اندازِ فکر سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ دیکھئے! آپ جب شہریت قبول کرتے ہیں تو یہ دیکھیں کہ وہاں کا آئین کیا ہے، یعنی اس آئین میں کوئی ایسی چیز نہ ہو کہ جس میں آپ کو اللہ کی نافرمانی اختیار کرنی پڑے۔ یہ بنیادی اصول ہے، یعنی ایک جملے میں رسالت مآب ﷺ نے ہمارے لیے لائحہ عمل طے کر دیا ہے کہ 'لا طاعة المخلوق فی معصیة الخالق' (خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے)۔ ابھی تک میں نے جتنے دساتیر دیکھے ہیں، ان میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، لہٰذا جب آپ کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو آپ کو اس کے قوانین کا پابند ہونا چاہیے، اس کے ضابطوں کا بھی پابند ہونا چاہیے۔ قوانین کا پابند ہونے کا مطلب کیا ہے؟ وہ قوانین جو آپ کے لیے ہیں، یعنی کیا آپ کو کہا گیا ہے کہ آپ ہم جنسیت اختیار کریں؟ ایسا تو نہیں ہے، یعنی کوئی دوسرے لوگوں کو اس کی اجازت دے دی گئی ہے اور ان پر قانونی پابندی نہیں لگائی گئی، یا ان کے اس تعلق کو قانون نے قبول کر لیا ہے، تو قانون جانے، اس کا کام جانے، سوال یہ ہے کہ آپ کو کس چیز کا پابند کیا گیا ہے؟ ایک مسلمان کے لیے یہ کوئی پیچیدہ سوال نہیں ہے۔ اس کو صرف اپنے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے، یعنی جو عہد مجھ سے لیا جا رہا ہے، اس میں مجھے کیا کہنا ہے اور جو مجھ سے تقاضے کیے جا رہے ہیں، وہ کیا ہیں؟ اب ان تقاضوں میں زائد چیزیں

---

[1]۔ اجتہاد، مسلم اقلیات اور غیر مسلم معاشرے، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۱۹، ص ۱۹۸، ص ۲۰۲، ص ۲۱۰

آپ سے مانگی جائیں گی، مثلاً آپ پر کوئی ٹیکس عائد کیا جائے گا۔ اس وقت پورے مسلمان ممالک میں ٹیکس لیا جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زکوۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا۔ اب ایک زائد ذمہ داری آپ پر ڈال دی گئی ہے تو ٹھیک ہے، آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ ظلم ہے جو آپ پر کیا جائے گا، یہاں آپ مظلوم ہیں لیکن اگر آپ میں ہمت ہے اور آپ کے پاس جگہ ہے تو پھر مجبوری کے عالم میں اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ تو دنیا میں یہی اصول ہو گا کہ جہاں آپ کو مجبوراً اللہ کی نافرمانی کرنی پڑے، یہ وہ جگہ ہے جہاں پر دین کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، ورنہ عزیمت کے ساتھ عمل کریں اور مشکل اٹھائیں، برے حالات کے اندر ہی خدا کے دین پر عمل کرنا ہوتا ہے، کوئی جنت نہیں بنا کر دی گئی جہاں آپ زندگی بسر کریں گے۔ یہ مقدمہ ہی بالکل غلط ہے جو ہمارے ہاں قائم کر لیا گیا کہ دین پر عمل کرنے کے لیے سازگار ماحول چاہیے۔ ایک وفادار شہری کی حیثیت سے آپ نے جو معاہدہ کیا ہے، اس کی پابندی کریں۔ آپ کا دل نہیں چاہتا تو واپس آجائیں، لیکن آپ چلے گئے ہیں تو پھر پابندی کریں۔ قانون پسند اور وفادار شہری بن کر رہیں، جو آپ کو وہاں پر نعمتیں ملتی ہیں ان پر اس قوم کا شکریہ ادا کریں۔ ہاں! اللہ کی معصیت کی کوئی بات آپ کو کرنے کے لیے کہی جائے تو اس وقت انکار یا اقرار کا سوال پیدا ہوتا ہے۔"[1]

اپنی اس گفتگو میں غامدی صاحب نے قوانین کی پاسداری پر تو زور دیا ہے لیکن اللہ کی معصیت کی بات پر سرسری گفتگو کے بعد سوال پیدا کر کے جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔ ہماری رائے میں ہر وہ قانون جس سے مسلمان کے اصولی عقائد اور شریعتِ اسلامیہ کے اصولی قوانین پر زد پڑتی ہو ایسے کسی قانون کو ماننے سے بہتر ہے کہ مسلمان کسی اسلامی ملک میں سکونت اختیار کر لے۔ احکامِ خداوندی سے منہ موڑنا اور دنیا کی چند روزہ زندگی کی خاطر خود کو اور اپنی نسل کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیلنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1]۔ اجتہاد، مسلم اقلیات اور غیر مسلم معاشرے، شمارہ ۱۲، دسمبر، ۲۰۱۹، جاوید احمد غامدی سے مکالمہ و گفتگو، ص ۲۱۶

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ۔ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ[1]﴾

(اے ایمان والو تمہارے مال نہ تمہاری اولاد کوئی چیز تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرے اور جو ایسا کرے تو وہی لوگ نقصان میں ہیں)

غیر مسلم حکومت سے وفاداری کا معاملہ:

مسلم اقلیات کے لیے ایک اور اہم مسئلہ وہاں کی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ وفاداری تعاون اور اس کی حدود کے تعین کا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

﴿و مساعدتهم لعدو المسلمين بالانفس والاموال محرمة عليهم ويجب عليهم الامتناع من ذلك باى طريق امكنهم من تغيب اوتعريض او مصانعة فاذا لم يكن الا بالهجرة ، تعينت[2]﴾

(یعنی اسلام کے دشمنوں کی مدد اپنی جان و مال سے کرنا مسلمان کے لئے ناجائز اور حرام ہے۔ اس کے ارتکاب سے ہر ممکن حد تک بچنا واجب ہے، چاہے چھپ جائے یا بات گھما پھیرا کے کر دے یا کافروں سے مدارات کرے اور اگر اسلام کے دشمنوں کی مدد سے بچنا ممکن نظر نہ آئے تو وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔)

اسی موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے، مدیر سہ ماہی، منہاج، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور کے حافظ محمد سعد اللہ لکھتے ہیں کہ اس مسئلے پر کسی اجتماعی اجتہاد کے ادارے کی رائے راقم کی نظر سے نہیں گزری، تاہم اس کی وضاحت یا حکم معلوم ہونا چاہیے۔

قرآن و سنت کی بے شمار نصوص، احکام، تعلیمات، پیغمبر اسلام ﷺ کا ذاتی اسوہ حسنہ اور خلفائے راشدین کا طرز عمل (جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں) اس امر پر گواہ ہیں کہ

---

[1]۔ سورۃ المنافقون ۶۳:۹

[2]۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم، مجموع الفتاویٰ، مملکۃ السعودیہ العربیہ، ۱۳۹۸، ج ۲۸، ص ۲۴۰

اسلام دنیا میں چہار سو اصلاح و فلاح اور امن و امان کا علمبر دار ہے اور ہر قسم کے فساد، بگاڑ، بدامنی، ظلم و زیادتی، سرکشی، تشدد، تنازع، دہشت گردی، تخریب کاری اور خون ریزی کے خاتمے کا داعی ہے۔ وہ رنگ، نسل، مذہب، عقیدے اور وطن کی تفریق و امتیاز کے بغیر ہر انسان کو جینے کا حق دیتا ہے، اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کو یقینی بناتا ہے اور اس کے دیگر انسانی حقوق کی حفاظت و پاسداری کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے ساتھ نیکی، احسان کا بدلہ احسان و تشکر اور ہر قسم کی خیانت اور دھوکے سے ممانعت بھی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔" حافظ سعد اللہ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ے سے استدلال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم (جب تک وہ لوگ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو)، لہذا غیر مسلم ممالک میں رہتے ہوئے وہاں کی حکومت کے ساتھ وفاداری اور تعاون سے اگر کسی مسلمان کے بنیادی عقائد پر زد نہیں پڑتی، اس کی جان و مال کے تحفظ اور حلال و حرام کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور نہ اس میں کسی دوسرے اسلامی ملک اور امت مسلمہ کا مجموعی طور پر کوئی نقصان ہے، بلکہ اس کے ایسا کرنے میں قومی و ملی مفاد مدِ نظر ہے، تو غیر مسلم حکومت سے وفاداری اور تعاون میں شرعاً کوئی حرج نظر نہیں آتا۔"[1]

ایسی غیر اسلامی ریاست کے ساتھ وفاداری کی ایک مثال نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں بھی ملتی ہے، جب رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بے شمار صحابہ، بشمول حضرت عثمان اور عبد الرحمن، مکہ مکرمہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور نجاشی نے ان مہاجرین کو مکمل تحفظ فراہم کیا۔ تو اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلے کے لیے خود گیا۔ صحابہ کرام نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے

[1]۔ محمد سعد اللہ، حافظ، غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کے مسائل، در مشمولہ، اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۵۲۳-۵۲۴

تاکہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لیے آئیں۔ حضرت زبیر، اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا، دریائے نیل کو عبور کر کے رزمگاہ میں پہنچے۔ ادھر صحابہ کرام نجاشی کی فتح کے لیے خدا سے دعا مانگتے رہے۔ چند روز کے بعد زبیر واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو اللہ نے فتح دی۔ [1]

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اہلِ اسلام کا شعار رہا ہے کہ وہ جس حکومت کو تسلیم کر لیں اور اس حکومت کے بنائے گئے قوانین کے زیرِ اثر رہیں تو وہ ان کے وفادار اور اطاعت گزار بھی رہتے ہیں۔ یہ دین اسلام کی ہی تعلیمات کا اثر تھا کہ مسلمان مہاجرین نے نجاشی کی حکومت کے زیرِ سایہ جب جان و مال کا تحفظ پایا تو اس کے خلاف کی گئی بغاوت کو کچلنے کے لیے خود میدانِ عمل میں نکل پڑے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم حکومت کا اس وقت ساتھ دینا بھی ضروری ہے جب وہ اسلامی حکومت کے مفادات کے خلاف عمل پیرا ہوں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے حافظ محمد سعد اللہ، بخاری، کتاب الجہاد، باب الجاسوس اور باب اذا اضطر الرجل النظر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "کسی غیر مسلم حکومت کے ساتھ کسی بھی نیت سے ایسے تعاون یا ایسی خیر خواہی کی گنجائش نظر نہیں آتی جس کے نتیجے میں کسی اسلامی حکومت کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ فتح مکہ سے پہلے محض اہل مکہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے (نہ کہ کسی بدنیتی سے) بدر کے صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے اہل مکہ کو ایک خفیہ خط لکھوا کر ایک خاتون کے ہاتھ روانہ کیا تو حضور اکرم ﷺ نے نگاہِ نبوت سے دیکھ کر چند صحابہ کے ذریعے راستے سے اس خط کو برآمد کروا لیا اور حضرت حاطب سے فرمایا: "یا حاطب ما

---

[1] ۔ شبلی نعمانی، علامہ، سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۲، حصہ ا، ص ۱۷۸

ھذا؟" (اے حاطب! یہ کیا ماجرا ہے؟) مگر جب انہوں نے عذر پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان کا عذر قبول کرتے ہوئے معاف فرما دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ ایسا تعاون جس سے اسلامی حکومت کو زک پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہ جائز نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی مسلمان غیر مسلم حکومت کی علانیہ مخالفت نہ کر سکے تو حکمت سے خاموشی اور غیر جانبداری اختیار کرنے کی کوشش کرے۔"[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر مسلم اقلیات کے لیے قانون کی پاسداری اور حکومتِ وقت کے ساتھ وفاداری نبھانے سے بنیادی عقائد پر زد نہیں پڑتی اور حلال و حرام کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس میں دوسرے مسلم ممالک اور امت مسلمہ کا اجتماعی طور پر کوئی نقصان ہوتا ہے، تو اس کے لیے قانون و آئین کی پاسداری اور حکومتِ وقت سے وفاداری اور تعاون میں شرعی اعتبار سے کوئی حرج نہیں۔

---

[1]۔ محمد سعد اللہ، حافظ، غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کے مسائل، ص۵۲۶

مسلم اقلیات کی مطلوبہ دینی ذمہ داریاں

الیکشن اور سیاسی اشتراک:

انسان جس خطے میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے لاتعلق نہیں ہو سکتا کیونکہ سیاسی مد و جزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر تمام شعبہ ہائے زندگی پر پڑتا ہے اور کافی حد تک سماج کا امن و امان بھی سیاسی حالات سے متعلق ہوتا ہے۔ مسلمان سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے کسی صورت بھی اہداف حاصل نہیں کر سکتا۔ عالمگیر منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے شریعت اسلامیہ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی ہے۔ سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے۔ واقعہ حلف الفضول سے ہمیں اس بابت رہنمائی ملتی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز میں کوئی باقاعدہ حکومت موجود نہیں تھی۔ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔ اسی دور میں مکہ مکرمہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ اہل مکہ میں سے ایک شخص کسی پردیسی کا حق ادا کرنے سے انکاری ہو گیا۔ چونکہ اس (اجنبی) کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور نہ ہی ان کے قبیلے والے مکہ میں موجود تھے کہ وہ بزور طاقت اپنا حق حاصل کر سکتا، اس غریب الوطن نے صحنِ کعبہ میں آکر اہل مکہ کو اپنی پریشانی سنائی اور انصاف کی دہائی دینے لگا۔ اس کی مدد کے لیے کچھ لوگ کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک نشست ہوئی۔ اس میں آپ ﷺ نے بھی بھرپور جذبے سے شرکت فرمائی۔ اس طرح ایک تنظیم "حلف الفضول" کے نام سے قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند تھا کہ آپ ﷺ اعلانِ نبوت کے بعد فرمایا کرتے تھے:

﴿لو ادعی بہ فی الاسلام لاجبت[1]﴾

"اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا۔"

واقعہ حلف الفضول سے ثابت ہوا کہ سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں۔ سیاسی تعلقات کی بنیاد پر غیر مسلموں سے تعاون کیا جا سکتا ہے اور ان سے تعاون لیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص اسلامی نہ ہوں، مسلمان شریک ہو سکتے ہیں اور ان تنظیموں کے ممبر بن سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا کہ مصر میں اس وقت مشرکین کی حکومت تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور عوامی مصلحت و منفعت کو دیکھتے ہوئے خزانے کی وزارت طلب کی۔

﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ[2]﴾

(یوسف نے کہا مجھے زمین کے خزانوں پر کر دے بے شک میں حفاظت والا علم والا ہوں۔)

حضرت یوسف علیہ السلام کی درخواست قبول کی گئی اور انہیں عہدہ دیا گیا۔ انہوں نے اس عہدے کے فرائض کو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اقتدار میں شریک ہونا جائز ہے جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مفتی محمد شفیع، حضرت یوسف کے اس طرزِ عمل سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت یوسف نے بادشاہ مصر کی ملازمت (عہدہ) قبول کی حالانکہ وہ کافر تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ خاص حالات میں جائز ہو سکتا ہے۔ اگر عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں حقوق کے ضائع ہونے اور ظلم و جبر کا اندیشہ ہو تو عہدہ

1۔ ابن کثیر، ابو الفداء، عماد الدین دمشقی، البدایۃ والنھایۃ، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی ۱۹۸۷، ج ۲، ص ۱۸۲

2۔ سورۃ یوسف ۱۲:۵۵

قبول کرنا ضروری ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسی صورت میں تعاون کی گنجائش ہے، لیکن اس میں کسی بھی خلاف شرع عمل کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے۔"[1]

پیر محمد کرم شاہ الازہری درج بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اگر ظالم و کافر حکومت اس عہدہ کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے آلہ کار بنانا چاہے تو پھر یہ عہدہ قبول کرنا ناجائز ہے اور اگر مقصد، ملک کی معاشی خوشحالی اور سیاسی استحکام کے لئے خدمات لینا ہے تو ایسے حالات میں فاسقانہ اور کافرانہ حکومتوں میں عہدہ قبول کرنے کی اجازت ہے۔"[2]

یہاں اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور اسلام کا ایک بڑا حصہ سیاسی نظم سے متعلق ہے اگر سیاسی نظام میں اسلامی احکام کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو بطور شہری ایک مسلمان کی ذمہ داری کیا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے معروف سکالر جاوید احمد غامدی کہتے ہیں کہ جب ہم (مسلمان) پوزیشن میں ہوں گے تو ان احکام کو نافذ کریں گے۔ اگر کسی جگہ ان احکام پر حکمران عمل نہیں کر رہے یا پھر ہم کسی ایسی جگہ رہ رہے ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے تو اس وقت دونوں صورتیں موجود ہوتی ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ بہت سے مسلمان امریکہ، برطانیہ، یا ہندوستان میں رہ رہے ہیں وہاں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے، جب اکثریت مسلمانوں کی نہیں ہے تو پارلیمنٹ میں بھی ان کی اکثریت نہیں ہوتی، چنانچہ وہ احکام وہاں نافذ نہیں ہو سکتے جو حکمرانوں کے لیے اللہ کے دین میں دیے گئے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جو مسلمان ملکوں میں رہ رہے ہیں جہاں بظاہر مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں بھی حکمرانوں کو، حکمران

1۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۲، ج۵، ص ۹۲

2۔ پیر محمد کرم شاہ الازھری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۴۰۳ھ، ج۲، ص ۴۳۷

خاندانوں کو یا پارلیمنٹ کو شریعت کے معاملے میں کئی جگہوں پر شرح صدر حاصل نہیں ہے یعنی بعض جگہوں پر مسلمانوں کا فرض اور ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنے دین پر عمل کریں، جو احکام ان سے متعلق ہیں ان کی پیروی کریں اور جو چیزیں حاصل نہیں ہیں، ان کے بارے میں دعوت کا طریقہ اختیار کریں۔ غیر مسلموں کو بھی دین کی دعوت دینی ہے، اپنے حکمرانوں کو بھی دین کی دعوت دینی ہے۔ یعنی اگر وہ مسلمان ہیں اور کوئی غلطی کر رہے ہیں تو ان کی غلطی پر متنبہ کرنا ہے۔ دین کا شعور حاصل ہونے کے بعد باقی لوگوں کے ساتھ جو تعلق بنتا ہے وہ دعوتِ دین کا تعلق ہے۔ ہجرت اس وقت لازم ہوتی ہے جب آپ پر جبر کیا جائے، یعنی آپ کے لیے دین پر عمل کرنا ناممکن بنا دیا جائے، آپ کو بالجبر کفر کی بات کہنے پر مجبور کیا جائے، بالجبر نماز پڑھنے سے روکا جائے اور اللہ کی اطاعت سے روکا جائے۔ اس موقع پر اگر آپ کے پاس موقع موجود ہو تو قرآن کہتا ہے کہ آپ اس جگہ کو چھوڑ دیں۔[1]

امریکی فقہ کونسل نے سیاسی عمل کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ہر جگہ سیاسی شرکت کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اس طرح اندرون ملک مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت ہوتی ہے، نیز اسلامی اور انسانی عادلانہ مسائل میں تعاون کے ذریعے اسلام کی تہذیبی تصویر بھی واضح ہوتی ہے۔[2]

عہدِ حاضر میں دنیا کا رجحان سیاسی انتقام کے ذریعے دوسروں کو نشانہ بنانے کی طرف ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کیلیے سیاسی نظام کا حصہ بننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ظلم کی مخالفت اور اس کا سدِباب کرتے ہوئے معاشرے کو امن کا گہوارہ بنائیں۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر منکرات کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ منکرات میں تمام برائیاں اور گناہ شامل ہیں، اور ظلم بھی ان میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی ایک گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے منکرات کو روکنے کے سلسلے میں یہ طریقہ ارشاد فرمایا ہے": اگر تم قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے منکرات کو

---

[1] ۔ اجتہاد، مسلم اقلیات اور غیر مسلم معاشرے، شمارہ ۱۲، دسمبر ،۲۰۱۹، جاوید احمد غامدی سے مکالمہ و گفتگو، ص ۲۱۸

[2] ۔ فقہی کانفرنس شمالی امریکہ کے فیصلے، مجلہ بحث و نظر، دہلی، شمارہ ۸۴، ۲۰۰۰، ص ۸۵

روک سکتے ہو تو قانون کا استعمال کرو۔ اگر قانون کا استعمال ممکن نہ ہو تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرو۔ اور اگر زبان سے بھی عاجز ہو تو دل میں اسے برا جانو۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

﴿من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلك اضعف الایمان[1]﴾

"تم میں سے جو برائی کو دیکھے تو بزور بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اسکی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اسکی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

حدیثِ مبارکہ کی رو سے ظلم کے خلاف زبان کے ذریعے احتجاج کرنا، ظلم کو زبان سے روکنے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے سے منع فرمایا ہے لیکن ظلم کے خلاف احتجاج کی اجازت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا[2]﴾

(اللہ بری بات کا اعلان پسند نہیں کرتا مگر مظلوم سے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔)

برائی کو طاقت کے ذریعے روکنا قدرے آسان ہوتا ہے۔ سیاسی عمل اور انتخابات میں شرکت کرنا طاقت حاصل کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ زبانی جمع خرچ اور سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرنا وقتی طور پر غصے کو کم تو کر دیتا ہے، لیکن یہ دور رس نتائج دینے سے قاصر رہتا ہے، اگرچہ احتجاج کرنا ممنوع نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سیاست کا مفہوم اور دائرہ کار بے حد وسیع ہے۔ فلاسفہ سیاست کی **تین اقسام** بیان کرتے ہیں۔

1۔ مسلم، مسلم بن حجاج قشیری، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان، رقم الحدیث:۴۹

2۔ سورۃ النساء ۴:۱۴۸

معروف عالم دین مفتی منیب الرحمٰن اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ سیاست کی تین قسمیں ہیں: پہلی "تہذیبِ نفس" ہے، جس میں انسان اپنے منفی پہلوؤں کو دور کر کے مثبت خصوصیات کو اجاگر کرتا ہے۔ دوسری "تدبیرِ منزل" ہے، جس میں ایک خاندان یا گھر کے نظم کو عدل و انصاف سے متوازن رکھا جاتا ہے۔ تیسری "سیاستِ مُدَن" ہے، جس میں ریاست یا حکومت کے اجتماعی نظم کو توازن اور حکمت سے قائم رکھا جاتا ہے۔ آپ مزید لکھتے ہیں کہ مغربی ممالک نے ابتدا میں مذہب کو حکومت سے علیحدہ کرنے کی بات کی، لیکن اب وہ مذہب پر پابندیاں لگانے کی طرف بڑھ رہے ہیں، جیسے کہ فرانسیسی صدر کا پردے پر پابندی کا بیان۔ اس سے سماج میں تکثیریت اور ثقافتی تنوع کے دعوے بے معنی ہو گئے ہیں۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ موجودہ عالمی منظرنامے میں سیاست اور سیاسی عمل میں شرکت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عالمی سطح پر مسلم اقلیتوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم معاشروں میں رہتی ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے کنارہ کشی نے نہ صرف انہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے، بلکہ کئی بنیادی مسائل میں وہ غیروں کے رحم و کرم پر ہیں اور ان کے محتاج بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ، مسلم اقلیتیں سیاسی عمل سے الگ رہنے کے باعث اپنا دعوتی اور تہذیبی کردار بھی مؤثر طریقے سے ادا کرنے میں ناکام نظر آتی ہیں۔ لہٰذا، مسلمانوں کی سیاسی عمل میں شرکت ناگزیر ہے اور اس کے دوررس نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔

احترام و تحفظِ انسانیت:

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن و امان کا ہے۔ تکثیری معاشرے میں رہتے ہوئے زیادہ صبر و تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کو بالعموم اور مسلم اقلیتوں کو بالخصوص یہ سمجھنا چاہیے کہ امن و امان کا تعلق جان، مال، اور عزت و آبرو سے ہے۔ عزت و تکریم اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جو دوسروں کو عزت دینا جانتا ہو۔

---

[1]۔ منیب الرحمٰن، مفتی، زاویہ، کالم: مفادات کا کھیل، روزنامہ دنیا، ۱۵ اکتوبر، ۲۰۲۰ء

شریعتِ اسلامیہ نے غیر مسلموں کی جان و مال کو وہی اہمیت دی ہے جو مسلمانوں کے جان و مال کو دی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن نے مطلقاً انسانی جان کے قتل سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ[1]﴾

(جس جان کی اللہ نے حرمت رکھی اسے ناحق نہ مارو۔)

ایک اور موقع پر کسی سبب شرعی کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا[2]﴾

(جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کئے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا۔)

اس آیت میں بھی مسلم و غیر مسلم کی کوئی قید نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿من قتل معاھدا لم یرح رائحة الجنة وان ریحھا توجد من مسیرة اربعین عاماً[3]﴾

"جس نے کسی معاہد (غیر مسلم شہری) کو قتل کیا تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک محسوس ہوتی ہے۔"

سنن نسائی میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿من قتل رجلا من اھل الذمة لم یجد ریح الجنة وان ریحھا لیوجد من مسیرة سبعین عاما[4]﴾

---

[1]۔ سورۃ الانعام ۶:۱۵۱

[2]۔ سورۃ المائدہ ۵:۳۲

[3]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ والموادعۃ، باب اثم من قتل معاھدا بغیر جرم، رقم الحدیث:۳۱۶۶

[4]۔ نسائی، عبد الرحمٰن احمد بن شعیب، سنن النسائی، کتاب القسامۃ والقود، باب تعظیم قتل المعاھد، رقم الحدیث:4758

"جس نے اہل ذمہ میں سے کسی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پہنچ جاتی ہے۔"

مذکورہ بالا آیت کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا: جان کا بدلہ جان ہے اور اس میں مسلمان یا کافر کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس لیے امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان نے ذمی کافر کو قتل کر دیا تو اس کے بدلے میں مسلمان کو قتل کر دیا جائے گا۔ جیسا کہ اس آیت کے عموم اور اطلاق سے واضح ہوتا ہے۔" امام اعظم کی تائید میں حسب ذیل احادیث ہیں:

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک مسلمان کو ایک معاہد (جس کافر سے معاہدہ ہوا ہو) کے بدلے میں قتل کیا (قتل کا حکم دیا) اور فرمایا: جو لوگ اپنے معاہدہ کو پورا کرتے ہیں میں ان میں سے سب سے بڑھ کر کریم ہوں۔"[1]

"حضرت عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک ذمی کے بدلے میں اہل قبیلہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور فرمایا جو لوگ اپنے عہد کو پورا کریں۔ میں ان میں سب سے زیادہ کریم ہوں۔"[2]

اس سے معلوم ہوا کہ جو کافر ذمی ہے یا وہ کافر جو مسلمانوں کو اذیت و تکلیف دینے سے باز رہتا ہے اور برسرِ جنگ نہیں ہے، تو اس کی جان کی قیمت بھی وہی ہے جو ایک مسلمان کی جان کی ہے۔ جیسے کسی مسلمان کو بغیر کسی شرعی وجہ کے قتل کرنا جائز نہیں، اسی طرح کافر کا قتل بھی بغیر کسی شرعی عذر کے جائز نہیں۔ لہٰذا، مسلم اقلیات کا دینی حق ہے کہ وہ غیر مسلموں کے قتل کے درپے نہ ہوں۔ اور اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو بغیر عذر شرعی کے قتل کر دے، تو اس کے بدلے میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا

1۔ دار قطنی، علی بن عمر، سنن دار قطنی، ج ۲، ص ۳۲۳۲

2۔ ایضاً، ج ۳، رقم ۳۲۳۴

تعمیرِ مساجد، ان کا مصرف اور مسلم اقلیات:

مسجدیں اللہ کا گھر ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں پر حاضری دینے والوں کو بے شمار دینی و دنیوی برکات عطا فرماتا ہے۔ مسلم اقلیات کے لیے مساجد نعمتِ کبریٰ سے کم نہیں ہیں۔ اسلامی ملک میں رہتے ہوئے جنہیں برسوں مساجد کی زیارت کی توفیق نہیں ملتی، دیارِ غیر میں جا کر وہ بھی مسجدوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ یہ بھی مشاہدے کی بات ہے کہ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمان تعمیرِ مساجد میں بھرپور حصہ لیتے ہیں اور ہدایت یافتہ لوگوں میں شمار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسجد کی تعمیر کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾[1]

(اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔)

حضرت عثمان بن عفان کہتے ہیں کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد بنائی اور لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے تو آپ نے فرمایا: بے شک تم نے بہت اعتراض کیے ہیں اور میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے مسجد بنائی اور وہ اس سے اللہ کی رضا کا طالب تھا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں اس کی مثل بنا دے گا۔[2]

ترمذی میں روایت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کے ساتھ جڑا رہتا ہے تو اس کے مومن ہونے کی گواہی دو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مسجدوں کی تعمیر کرنا انہی لوگوں کے لئے ہے جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے

1۔ سورۃ التوبہ ۹:۱۸

2۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب من بنی مسجدا، رقم الحدیث ۴۵۰

اور نماز قائم رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں
ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔[1]

غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے لیے مسجدیں نعمتِ غیر مترقّبہ سے کم نہیں ہیں، لیکن مسلمانوں کو اب مساجد میں کچھ تبدیلیاں کرنا ضروری ہے۔ اولاً مسجد کو سجدہ گاہ کے ساتھ ساتھ کمیونٹی سینٹر کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ مسلمان بالعموم اور مسلم اقلیات بالخصوص مساجد کو صرف نماز پڑھنے کی جگہ نہ بنائیں، بلکہ اسلامی کمیونٹی سینٹر کی طرز پر وہاں غریبوں کے کھانے کا انتظام، ڈپریشن میں مبتلا افراد کی کاؤنسلنگ، اور ان کے خاندانی جھگڑوں کو سلجھانے کا انتظام ہو۔ مساجد میں مدد مانگنے والوں کی مناسب تحقیق کے بعد اجتماعی وانفرادی طور پر مدد کی جائے۔ اپنے گھروں کے فالتو سامان کو کلیساؤں میں دینے کی بجائے نادار افراد کے لیے عطیہ کرنے کی غرض سے مساجد کا ایک حصہ مخصوص کیا جائے۔ ایسی مساجد ہوں جہاں لوگوں کو آپس میں رشتہ ناطے کرنے کے لیے ضروری واقفیت کا موقع ملے۔ علاقے کے مسلمانوں کا بلڈ گروپ، ریکارڈ بنایا جائے تاکہ بوقتِ ضرورت فوری مدد کی جا سکے۔ ہر شخص اپنی کمائی کا دو فیصد یا جتنا توفیق ہو، ماہانہ طے کرے تاکہ مساجد کے تمام اخراجات آسانی سے پورے ہو سکیں۔ علاقے کے حلیم وبردبار، عقلمند، نرم مزاج لوگ مسجد کمیٹی کے ممبر ہوں۔ نکاح کا بندوبست سادگی کے ساتھ مساجد میں کیے جانے کو ترجیح دی جائے۔ قدرتی اور ناگہانی آفات سے ہونے والے نقصانات کے ازالے کے لیے اجتماعی کوششوں کا آغاز مساجد سے ہو۔ کیونکہ صدقات وخیرات کرنے میں مسلمانوں کا کوئی ثانی نہیں۔ بڑی جامع مساجد سے ملحق مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ ہماری مساجد میں شاندار لائبریری ہونی چاہیے، جہاں مکمل اسلامی وعصری کتب مطالعہ کے لیے دستیاب ہوں۔

---

[1]۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ، رقم الحدیث ۲۶۱۷

خلاصہ یہ ہے کہ مساجد کے درو دیوار کے رنگ و روغن، بیت الخلاء کے سنگ مرمر، قمقموں، فانوس و جھومر، ایئر کنڈیشنرز، کولروں اور نفیس قالینوں پر بہت خرچ ہو چکا۔ مناسب حد تک یہ سب چیزیں ہونی چاہئیں، مگر عہد حاضر میں ہمیں ترجیحات بدل کر مساجد کو بطرزِ مسجد نبوی ایک بہترین ماڈل بنا کر پیش کرنے کی شدت سے ضرورت ہے، تاکہ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کی اولاد، اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے ساتھ جڑی رہے، کیونکہ اسی میں مسلمانوں کی بقاء ہے۔

حقیقتِ جہاد اور غلط فہمیاں:

آج کل مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جس چیز کی وجہ سے نفرتوں کے کانٹے بوئے جا رہے ہیں، وہ جہاد ہے۔ جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو دیکھتا ہے، اسے قتل کر دیتا ہے۔ دہشت گردی اور جہاد کو مترادف سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ جہاد اور دہشت گردی میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ جہاد قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی۔ جہاد تمام کافروں سے نہیں، بلکہ ان کافروں سے ہے جو مسلمانوں کے ساتھ فی الحال جنگ کر رہے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا.[1]﴾

(اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (ہاں)
مگر حد سے نہ بڑھو۔)

اس آیت میں حد سے تجاوز کو منع کیا گیا ہے۔ حد سے تجاوز کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تم سے جنگ نہیں کرتے، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو جب جنگ ہو، تو جنگی قوانین کا لحاظ رکھو۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں، حصہ نہ لینے والوں اور پیشواؤں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[1]۔ سورۃ البقرہ، ۲:۱۹۰

نبی کریم ﷺ جب اسلامی لشکر کو مشرکین کی طرف روانہ فرماتے تو یوں ہدایت فرماتے۔ کسی بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا چشموں کو خشک و ویران ہرگز نہ کرنا، جنگ میں حائل درختوں کے علاوہ کسی درخت کو بالکل نہ کاٹنا۔ [1]

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، فرمایا:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ [2]

(جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا۔)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ ظلم و زیادتی اور جبر و استبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا ہے۔ قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے جنگ کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا [3]

(اگر وہ تم سے کنارہ کریں اور نہ لڑیں اور صلح کا پیام ڈالیں تو اللہ نے تمہیں ان پر کوئی راہ نہ رکھی۔)

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا [4]

(اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو۔)

1۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حسین، سنن کبریٰ، نشر السنۃ، ملتان، رقم الحدیث: ۱۷۹۳۴

2۔ سورۃ محمد ۱:۴۷

3۔ سورۃ النساء ۹۰:۴

4۔ سورۃ الانفال ۸:۶۱

سورۃ البقرۃ میں ظلم واستبداد کے خاتمے کے لئے جہاد کو لازم قرار دیا گیا۔ اس لیے کہ ظلم کو روکنے اور معاشرے میں امن پیدا کرنے کے لئے ظلم کے خلاف تادیبی وانسدادی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّهِ فَإِنِ انتَهَواْ فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِينَ[1]

(اور ان سے جنگ کرتے رہو حتی کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین (یعنی زندگی اور بندگی کا نظام عملاً) اللہ ہی کے تابع ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو سوائے ظالموں کے کسی پر زیادتی روا نہیں۔)

درج بالا آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، شدت پسندوں اور دہشت گردوں سے ہے نہ کہ صلح جو اور امن پسندوں سے۔ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہوا اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپے ہوں تو سیاسی طور پر، پُرامن طریقے سے مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور کافروں پر سیاسی و اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا، لیکن ان کے خلاف قتال اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہو گا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ صراحت گزر چکی ہے: "اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے، لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو، اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ سے دیکھ رہے ہیں۔" قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ اور جن لوگوں سے مسلمانوں کا امن معاہدہ ہو، یا جو لوگ غیر جانبدار رہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ انصاف کے عمومی اصول اور تقاضوں کے عین مطابق ہیں کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انہیں ظلم سے باز رکھا جائے البتہ اگر لوگ مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں مشرکین مکہ کی

---

[1]۔ سورۃ البقرہ، ۲:۱۹۳

طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور کر رہے ہوں، تو ان کے ساتھ جنگ کی بجائے حسنِ سلوک اور صلح و آشتی کا حکم دیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیر مسلموں سے قتال کی اس وقت اجازت ہے جب وہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق مسلمانوں پر دفاعی پوزیشن اختیار کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ مسلم اقلیات کو چاہیے کہ اپنی دینی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اپنے حلقۂ احباب تک جہاد کا صحیح اور درست مفہوم پہنچائیں کہ جہاد اسلام کا ایک اہم رکن ہے، یہ محض قتال، جنگ یا دشمن کے ساتھ محاذ آرائی کا نام نہیں۔ یہ اس وقت فرض ہوتا ہے جب کفار مسلمانوں کے خلاف کھلی جنگ پر اتر آئیں اور ان پر ناحق ظلم و ستم کا بازار گرم کریں۔ یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ غلط فہمیاں ختم ہوں، فاصلے کم ہوں اور معاشرے میں بھائی چارے کی صحت مند فضا پیدا ہو سکے۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا تحفظ:

غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمانوں کے لیے اپنی مساجد کے تحفظ کے ساتھ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا تحفظ بھی ناگزیر ہے۔ مسلمانوں کو عبادت گاہوں کے تحفظ کے لیے منظم انداز میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو تحفظ فراہم کیا، بایں معنی کہ فتح خیبر کے بعد وہاں کافروں کی عبادت گاہوں کو برقرار رکھا۔ اسی طرح جب دیگر علاقے سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوئے تو خلفائے راشدین نے بھی نبی کریم ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے ان ملکوں میں موجود کفار کی عبادت گاہوں کو مسمار نہیں کیا بلکہ انہیں ان کی حالت پر باقی رکھا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

[1] ۔ ابن قیم، ابو عبد اللہ محمد بن ابو بکر، احکام اھل الذمہ، بیروت، ۱۹۹۷، دار ابن حزم، ج۳، ۱۱۶۹

وَ لَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا[1]

(اور اللہ اگر آدمیوں میں ایک کو دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور ڈھادی جاتیں خانقاہیں اور گرجا اور کلیسا اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے۔)

اس آیت کریمہ کی تشریح میں امام ابو بکر الجصاص فرماتے ہیں۔

فی الآیۃ دلیل علی أن ھذہ المواضع المذکورۃ لا یجوز أن تھدم علی من کان لہ ذمۃ أو عھد من الکفار[2]

آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ مذکورہ جگہوں کا مسمار کرنا جائز نہیں اگرچہ وہ غیر مسلم شہریوں کی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو گرانا، ان کو نقصان پہنچانا کسی صورت جائز نہیں۔ محمد بن الحسین فرماتے ہیں:

فی أرض الصلح إذا صارت مصرًا للمسلمین لم یُھدم ما کان فیھا من بیعَۃٍ أو کنیسۃٍ أو بیت نارٍ[3]

صلح کی زمین پر جب مسلمانوں کا شہر بن جائے تو اس میں پائے جانے والے گرجے کلیسے یا آتش کدے گرائے نہیں جائیں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اسلام ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ دارالاسلام میں موجود غیر مسلموں کی عبادت گاہوں تک کا تحفظ کیا جائے اور غیر مسلموں کو آزادانہ عبادت کا موقع فراہم کیا جائے، تو پھر یہ کیسے جائز ہو گا کہ کوئی مسلمان غیر مسلم ملک میں رہ کر ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچائے، ان کی پامالی کرے یا بموں کے ذریعے مسمار کرے؟ یہ عمل کوئی

1۔ سورۃ الحج ۲۲:۴۰

2۔ جصاص، ابو بکر احمد بن علی، احکام القران، داراحیاء التراث، بیروت، ۱۴۰۵ھ، ج۵، ص۸۳

3۔ ایضاً، ج۵، ص۸۳

مسلمان نہیں کر سکتا۔ الغرض، اسلام غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی فراہم کرتا ہے، جس طرح غیر مسلم شہریوں کی جان اور مال محفوظ ہے، اسی طرح ان کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔ یہ آیت، بین المذاہب رواداری کا ایسا نمونہ پیش کرتی ہے کہ کوئی اور مذہب اس کا نمونہ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ جب کسی دوسرے مذہب کے جھوٹے معبود کو سب و شتم کرنے کی اجازت نہیں تو پھر ان کی عبادت گاہوں کو گرانے کی اجازت اسلام کیسے دے سکتا ہے؟ یہ اس لیے کہ اسلام دین جبر نہیں ہے۔ دینِ جبر نہ ہونے کا مطلب ہے کہ دین اسلام میں کسی کو زبردستی مسلمان کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[1]

(کچھ زبردستی نہیں دین میں۔)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمان عملی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی عبادت گاہوں اور اداروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کو باور کروائیں کہ مسلمان ہر مذہب کی عبادت گاہ کا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔

یہ اس لیے کہ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے جہاں تنگ نظری اور شدت پسندی کی قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ پر عمل پیرا ہو کر غیر مسلموں کا دل جیتنا ایک مجرب دعوتی طرزِ عمل ثابت ہو سکتا ہے۔

غیر مسلموں کی املاک کا احترام:

غیر مسلم معاشروں میں مقیم مسلم اقلیات کے لئے مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کے املاک کا تحفظ کرنا بھی ازبس ضروری ہے۔ اسلام نے دوسروں کا مال چرانا، زبردستی لینا، یا دھوکے سے لینا حرام قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] ۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۵۶

وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ[1]

اور آپس میں ناحق ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤاور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ اس لیے پہنچاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طور پر کھالو جان بوجھ کر۔

غیر مسلموں کی جانوں کی طرح ان کا مال بھی محفوظ ہے اسی لیے اس پر تمام ائمہ کا اجماع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ (جو شام کے گورنر تھے) کو کچھ لکھ کر بھیجا ان میں ایک حکم یہ بھی تھا۔

وَامْنَع الْمُسْلِمِينَ مِنْ ظُلْمِهِمْ وَلَا ضَرَارَ بِهِمْ وَأَكْلِ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا بِحِلِّهَا

"تم مسلمانوں کو ان غیر مسلموں پر ظلم کرنے، انہیں ضرر پہنچانے اور ناجائز طریقے سے ان کا مال کھانے سے سختی سے روکو۔"

ایک مسلمان پر غیر مسلم شہری کے جان اور مال کی حفاظت اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ایک غیر مسلم کی، یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان کسی کافر کے شراب یا خنزیر یا کوئی ایسی چیز ہلاک کر دے جو کافر کے مذہب میں حلال ہو تو مسلمان اس کے لیے قیمت کا ضامن ہو گا۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب الدر المختار میں ہے:

ویضمن المسلم قیمة الخمر والخنزیر إذا أتلفه[2]

"غیر مسلم کی شراب اور اس کے خنزیر کو ضائع کرنے کی صورت میں مسلمان قیمت کا ضامن ہو گا۔"

---

[1] ۔ سورۃ البقرۃ۲:۱۸۸

[2] ۔ شامی، محمد امین بن عمر، در مختار، ج۳، ص ۲۷۳

غیر مسلم شہری کے املاک کتنے محفوظ ہیں اس کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس طرح کوئی شخص اگر مسلمان کا مال چوری کرے اور سرقہ کی شرائط پائی جائیں تو چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ غیر مسلم شہری کے مال کی چوری کرے پھر بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔

امام نووی فرماتے ہیں:

ان مال الذمی والمعاهد والمرتد فی هذا کمال المسلم[1]

"یقیناً غیر مسلم، معاہد اور مرتد کا مال بھی اس اعتبار سے مسلمان کے مال کی طرح ہے۔"

علامہ ابن حزم، المحلی میں فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ غیر مسلم شہری کا مال خراب کرنے پر بھی مسلمان پر حد جاری کی جائے گی۔"[2]

ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"غیر مسلم شہری کا مال چوری کرنے پر اسی طرح حد جاری ہو گی جس طرح مسلمان کا مال چوری کرنے پر ہوتی ہے۔"[3]

ان تمام عبارات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کے املاک کا تحفظ مسلمان پر کتنا ضروری ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم شہری کا مال چوری کرے تو اس پر حد جاری ہو گی جس طرح مسلمان کا مال چوری کرنے پر ہوتی ہے۔ اگر غیر مسلم کے مال کو ہلاک کردے یا ضائع کردے تو پھر مسلمان اس غیر مسلم کے لئے اسکی قیمت کا ضامن ہو گا اگرچہ وہ صرف غیر مسلم کے نزدیک مال ہو اور مسلمان کے نزدیک مال نہ ہو جیسا کہ خنزیر کو ہلاک کردے یا شراب کو ضائع کردے۔

---

[1] ۔ نووی، یحییٰ بن شرف، شرح نووی، دار احیاء التراث، بیروت، ج ۷، ص ۱۲

[2] ۔ ابن حزم، حنبلی، المحلی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج ۱۰، ص ۳۵۱

[3] ۔ ابن قدامہ، احمد بن قدامہ المقدسی، المغنی، دار الفکر، بیروت، لبنان، ج ۹، ص ۱۱۲

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمانوں پر اپنے جان ومال کے تحفظ کے ساتھ غیر مسلموں کے جان و مال اور ان کی املاک کا تحفظ بھی ضروری ہے۔یہ مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ تکثیری معاشرے میں رہتے ہوئے غیروں کو مانوس کریں اور انہیں مسلمانوں سے کسی بھی قسم کا کوئی خوف اور ڈر محسوس نہ ہو۔

معاشی و تجارتی معاملات سے متعلق مسلم اقلیات کے مسائل

"معاش" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "ع ی ش" ہے اور یہ لغوی اعتبار سے حیات (زندگی) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: "عاشَ يَعِيشُ عِيشَةً وَمَعِيشَةً وَمُعَاشًا"۔ یعنی وہ چیز جس کے ساتھ زندہ رہا جائے۔[1]

قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف مقامات پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الزخرف میں ارشاد ہوتا ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا[2]

(ہم نے اُن میں ان کی زیست کا سامان دنیا کی زندگی میں بانٹا۔)

سورۃ القصص میں یہ لفظ عیش و عشرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا[3]

(اور کتنے شہر ہم نے ہلاک کر دیئے جو اپنے عیش پر اِترا گئے تھے۔)

سورۃ الاعراف میں اللہ نے حضرت انسان پر اپنے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ[4]

(اور بے شک ہم نے تمہیں زمین میں جماؤ (ٹھکانا) دیا اور تمہارے لیے اس میں زندگی کے اسباب بنائے۔)

سورۃ القارعۃ میں اہل جنت پر اپنے انعام و کرام کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ نے ارشاد فرمایا:

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ[5] (وہ تو من مانتے عیش میں ہیں)

1۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب، ج۶، ص ۳۷۵

2۔ سورۃ الزخرف ۴۳:۳۲

3۔ سورۃ القصص ۲۸:۵۸

4۔ سورۃ الاعراف ۷:۱۰

5۔ سورۃ القارعۃ ۱۰۱:۷

سورۃ طٰہٰ میں یہی لفظ زندگانی یعنی حیات کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا[1]

(اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ زندگانی ہے۔)

یہاں پر اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ کی یاد سے تو کفار نے منہ موڑ رکھا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کفار کشادگی اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جبکہ مسلمان معاشی تنگی اور تنگدستی کا شکار ہیں۔ اس کا جواب مفسرِ شہیر علامہ غلام رسول سعیدی دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "اس کا جواب یہ ہے کہ "ضنکا" کا مطلب تنگ دستی نہیں ہے بلکہ زندگی کی تنگ گزران ہے۔ یہ درست ہے کہ کفار اور مشرکین نے مال و دولت کے انبار جمع کر لیے، مگر ان کو طمانیتِ قلب اور ذہنی سکون حاصل نہیں ہے۔ وہ بظاہر عیش و عشرت میں ہیں لیکن ان کا دل غمگین اور پریشان رہتا ہے۔ وہ شب و روز مال و دولت اور منصب و اقتدار کے حصول میں سرگرداں رہتے ہیں پھر ان کو اس کی حفاظت کی فکر رہتی ہے۔ جو دنیاوی مال و متاع حاصل کرتے ہیں، اس کے لیے ہزاروں قسم کے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا ضمیر مجرم ہوتا ہے اور وہ اطمینان اور سکون سے محروم رہتے ہیں۔"[2]

درج بالا آیات سے واضح ہوا کہ یہ لفظ زندگانی، سامان زندگی اور عیش و عشرت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہ لفظ قرآن مجید میں دولت کے لئے نہیں بلکہ وسائل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

1۔ سورۃ طٰہٰ ۲۰:۱۲۴

2۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج ۷، ص ۴۹۶-۴۹۷

معاش کے لئے غیر اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کرنا:

مسلمانوں کی غالب اکثریت حصولِ معاش کے لیے یورپ، امریکہ اور دیگر غیر اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کرتی ہے۔ اگر اپنے ملک میں معاش کے بنیادی وسائل میسر نہ ہوں اور مجبوراً مسلمان غیر اسلامی ملک میں چلا جائے تو اس کے جواز میں کلام نہیں ہے۔ اس حکم کا ماخذ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کریمہ ہے:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ[1]

(وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین تابع کر دی تو اس کے رستوں میں چلو اور اللہ کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف اٹھنا ہے۔)

اور قرینِ انصاف ہے کہ زمین میں رزق کے حصول کی خاطر حکمِ سفر، زمان و مکان کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ علامہ ابن عربی، معاش کے لئے جواز سفر کے قائل ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"تجارت اور معاش کے لئے سفر کرنا اللہ تعالیٰ کے فضل سے جائز ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۸ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔) سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے مراد تجارت ہے۔ جب سفر حج میں تجارت جائز ہے تو انفرادی طور پر جائز کیسے نہیں ہو گی۔"[2]

سورۃ البقرہ کی درج ذیل آیت سے بھی اقتصادی پوزیشن بہتر کرنے کے لئے دنیا میں قیام کرنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ[3]

---

[1]۔ سورۃ الملک ۶۷:۱۵

[2]۔ ابن عربی، محمد بن عبد اللہ، احکام القرآن، ج ۱، ص ۴۹۹

[3]۔ سورۃ البقرۃ ۲:۱۹۸

(تم پر کچھ گناہ نہیں کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔)

تجارتی مقاصد کے لیے غیر اسلامی ملکوں میں قیام ہی جمہور فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔[1]

اختر امام عادل اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف **"غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل"** میں امام سرخسی کی مبسوط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں میں قیام کیا جائے، جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔"[2]

اسی موضوع پر دلائل ذکر کرنے کے بعد ان کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں کہ آج کے دور میں مسلم ممالک تجارت اور صنعت کے میدان میں جس قدر پسماندہ ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ مسلم تجار، ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں کا دورہ کریں یا وہاں قیام کریں اور اعلیٰ صنعت سے روشناس کرائیں۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر تجارت پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق کی جائے تو غیر مسلم برادری پر اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھا اثر پڑے گا اور اس سے دعوت کی راہ کھلنے کے بڑے امکانات ہیں۔ ماضی میں تجارت ہی کے عنوان سے ہمارے اسلامی قافلوں نے مختلف ملکوں کا سفر کیا اور انہی کے ذریعے اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پہنچا۔ اس لیے تجارت آج کے دور میں دعوت کا بہترین وسیلہ ہے اور اس وسیلہ کو چھوڑ دینا ہرگز دانشمندی نہیں ہوگی۔[3]

اسلامی معیشت کے بنیادی اصول وضوابط:

معاشیات، جو کہ معاشرتی علوم کی ایک عام شاخ ہے، اس میں مادی وسائل اور پیداوار کی تقسیم اور ان کی طلب ورسد کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ موجودہ معاشی نظام، جس کی عمارت سود پر قائم ہے، کے برعکس اسلام کا معاشی نظام ہر اس برائی سے روکتا ہے جس میں انسان کا

1۔ المبسوط للسرخسی، ج ۱۰، ص ۸۸

2۔ اختر امام عادل، قاسمی، غیر مسلم ملکوں میں آباد مسلمانوں کے مسائل اور ان کا شرعی حل، جامع ربانی منوروشریف، ص ۳۲

3۔ ایضا، ص ۳۲-۳۳

استحصال ہو، بنیادی ضروریات میں اسے محتاجی کا سامنا کرنا پڑے، حرام ذرائع آمدن ہوں، اور اسے افراط و تفریط کا شکار ہونا پڑے۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے نزدیک اسلامی معاشی تعلیمات کے نو بنیادی اصول ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

اسلامی معاشی تعلیمات کی روح کو نظام میں ڈھالنے والے بنیادی اصول ضوابط درج ذیل ہیں:

۱۔ ملکیت اموال سے مراد صرف امانت و نیابت ہے۔

۲۔ زمین اور اس کی پیداوار میں اصلاً تمام انسانوں کا حق برابر ہے۔

۳۔ جملہ اموال میں حاجت مندوں کا شرعی حق ہے۔

۴۔ اصل رزق اور بنیادی حق، حق معاش میں تمام انسان برابر ہیں۔

۵۔ بنیادی حق المعاش کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

۶۔ حرام ذرائع معیشت کا انسداد۔

۷۔ خرچ میں اقتصاد قائم رکھنا شرعی فریضہ ہے۔

۸۔ ہر شہری کے لئے حتیٰ المقدور کسبِ معاش ضروری ہے۔

۹۔ کفالتِ عامہ کے نظام کا اجراء و تنفیذ ریاست کا فریضہ ہے۔"[1]

درج بالا اصولوں کا تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو پوری دنیا میں بالعموم اور غیر اسلامی ممالک میں بالخصوص سودی تجارت اور حلال و حرام کا فرق کیے بغیر ملازمت سے بڑھ کر کسی بڑے مسئلے کا سامنا نہیں ہے۔

غیر مسلم ممالک میں عہدے، مناصب اور ملازمتیں:

مسلم اقلیتوں کا ایک اہم مسئلہ سرکاری اور غیر سرکاری نوکری کے شرعی جواز اور عدم جواز کا ہے۔ اس معاملے میں شریعتِ اسلامیہ کی واضح تصریحات موجود ہیں کہ کسی بھی ناجائز اور حرام کام کے لیے نوکری کرنا حرام اور ناجائز ہے۔ البتہ شرعاً مباح کام کی ملازمت کے جواز

[1] ۔ طاہر القادری، محمد، ڈاکٹر، اقتصادیاتِ اسلام (تشکیل جدید)، منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۱۴۳

کے طور پر سیدنا یوسف علیہ السلام کا طرزِ عمل پیش کیا جاتا ہے، جب آپ نے مصر کے بادشاہ سے کہا کہ مجھے وزیرِ خزانہ مقرر کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف میں ارشاد فرمایا:

قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم [1]

(یوسف نے کہا مجھے زمین (ملک) کے خزانوں پر مقرر کر دے بے شک میں حفاظت کرنے والا اور ماہر ہوں۔)

امام بغوی لکھتے ہیں:

"یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مصر کی زمین کے خوراک کے خزانے اور اموال کے خزانے پر مجھے متعین کرو۔ "خزائن" خزانہ کی جمع ہے اور اس سے مراد خوراک اور مال کے خزانے ہیں۔ انی حفیظ علیم بے شک میں خزانوں کی حفاظت اور معاشی مسائل کا ماہر ہوں۔"[2]

قاضی ثناء اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ آپ کا عہدہ طلب کرنا صرف رضائے الٰہی کے لیے تھا، نہ کہ دنیا کی جاہ و محبت کے لیے۔ خلفائے راشدین کا خلافت کا عہدہ سنبھالنا بھی اسی نوعیت کا تھا، اور حضرت علی کا حضرت امیر معاویہ سے اختلاف اس لیے تھا کہ آپ خود کو نفاذِ شریعت کے لیے زیادہ اہل اور قوی سمجھتے تھے۔ اس آیت میں عہدۂ قضاء اور ولایت کی طلب کے جواز کی دلیل موجود ہے، اور یہ بھی کہ کسی عہدے کے لیے اپنی اہلیت کا اظہار جائز ہے، بشرطیکہ انسان اپنی ذات پر مکمل ضبط رکھتا ہو۔ مزید یہ کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ انسان کوئی عہدہ قبول کر سکتا ہے، خواہ حاکم وقت ظالم اور کافر ہی کیوں نہ ہو، بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ اقامتِ حق اور سیاست کے لیے اس ظالم اور جابر حکمران کے اقتدار کے بغیر کوئی راستہ ممکن نہیں۔ سلف صالحین، امت کے علما اور فقہا نے بھی ظالم و جابر

1۔ سورۃ یوسف ۱۲:۵۵

2۔ بغوی، حسین بن مسعود الفراء، معالم التنزیل، دار الفکر، بیروت، ج ۳، ص ۲۹۳

حکمرانوں کے دور حکومت میں عہدۂ قضاء قبول کیا، تاکہ شریعت کے نفاذ اور عدل وانصاف کا قیام ممکن ہو سکے۔"[1]

یہاں اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جنابِ یوسف نے عہدۂ قضاء کیوں طلب کیا؟ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے امارت کا سوال کرنے سے منع کیا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

"اگر تمہیں عہدہ قضاء مانگنے کے بعد دیا گیا تو تم کو اس کی طرف سونپ دیا جائے گا اور اگر بغیر طلب کیے یہ منصب دیا گیا تو تمہاری اس پر مدد کی جائے گی۔"[2]

مذکورہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی رقم طراز ہیں:

"اس حدیث کا تعلق ہمارے نبی ﷺ کی شریعت سے ہے۔ جہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ ہے تو وہ اللہ کے نبی تھے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں منصب کا سوال کرنا جائز تھا نیز وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی ہدایت کے لیے برحق رسول تھے، اور رسول پر یہ واجب ہوتا ہے کہ وہ اپنی امت کی مصلحتوں کا حتی المقدور خیال رکھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ اس منصب کے ذریعے وہ مستحقین تک نفع پہنچا سکتے ہیں اور ان سے ضرر کو دور کر سکتے ہیں۔ اسی لیے مخلوق کی مصلحتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے اس منصب کا سوال کرنا واجب تھا۔"[3]

مسلم اقلیتوں کے لیے غیر مسلموں کی ملازمت اختیار کرنے کے جواز کی ایک دلیل صحابہ کرام کا طرزِ عمل بھی ہے۔ صحابہ کرام نے ضرورت کے وقت اجرت پر غیر مسلموں کے ہاں

---

[1]۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۵، ص۲۱۶

[2]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب قول اللہ تعالیٰ (المائدہ:۸۹)، رقم الحدیث:۶۶۲۲

[3]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان الفرقان، ج۳، ص۳۹۰

مزدور کی حیثیت سے کام کیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے عاص بن وائل کے پاس اجرت پر کام کیا اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی نے ایک یہودی کے باغ میں کھجوروں کے عوض کام کیا۔ امام عسقلانی، حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل سے استدلال کرتے ہوئے غیر مسلم کی ملازمت کے جواز کے حوالے سے لکھتے ہیں":

> کرہ اھل العلم ذلك الا لضرورة بشرطين: احدھما: ان يكون عمله فی مايحل للمسلم فعله،والاخر:ان لا يعينه علی مايعود ضررہ علی المسلمين[1]
>
> " اجرت پر غیر مسلم کے یہاں کام کرنے کو اہل علم نے ناپسند کیا ہے مگر ضرورت کے وقت اور یہ دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔ اولاً یہ کہ غیر مسلم جو کام لے اس کا کرنا مسلمان کے لئے شرعی طور پر جائز ہو۔ ثانیاً یہ کہ وہ کسی ایسے کام میں غیر مسلم کی معاونت نہ کرے جس کا نقصان بالآخر مسلمانوں کو پہنچنے کا اندیشہ ہو۔"

اب رہی مسئلے کی تفصیل کہ غیر مسلموں کی کونسی نوکری میں جواز کے ساتھ کراہت ہے اور کونسی بلا کراہت جائز ہے؟ مفتی احمد یار خان نعیمی مذکورہ سوال کے جواب میں سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۷۲ کے تحت لکھتے ہیں:

> "کفار کی نوکری جائز لیکن ان کے ہاں ذلیل نوکری یا بُت سازی وغیرہ حرام کام کی نوکری بہت بری ہے۔"[2]

فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں اس کی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے کہ غیر مسلم کی ایسی ذاتی اور گھریلو خدمت جس میں ایک مسلمان کی ذلت ہو اور مسلمان کو کافر کے سامنے ذلیل ہونا پڑے، وہ اکثر فقہاء کے نزدیک بوقت ضرورت جائز، مگر مکروہ ہے، جبکہ بعض کے نزدیک یہ

---

[1] ۔ عسقلانی، احمد بن علی ابن حجر، فتح الباری، شرح صحیح بخاری، ج۴، ص ۵۷۱

[2] ۔ مفتی احمد یار خان نعیمی، تفسیر نعیمی، نعیمی کتب خانہ لاہور، ۲۰۰۹، ج۳ ص ۱۳۴

ناجائز ہے کیونکہ شریعت نے ایک مسلمان کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرنا ویسے بھی جائز نہیں رکھا، تو پھر یہ ذلت اگر کسی غیر مسلم کے سامنے اٹھانی پڑے تو زیادہ مشکل بات ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں غیور پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: 'لا ینبغی للمسلم أن یذل نفسه' (ایک مسلمان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے)۔[1]

غیر مسلم کے پاس ملازمت کے جواز وعدم جواز پر کلام کرتے ہوئے مفتی تقی عثمانی کہتے ہیں:

> "موجودہ دور میں شخصی ملازمت کے برعکس بڑے بڑے کارخانے، فیکٹریاں، ادارے اور کمپنیاں وجود میں آئی ہیں جن میں فنی ماہرین اور عام ملازم گروپ کی شکل میں اپنا کام کرتے ہیں۔ ادارے اور کمپنیوں کے حقوق کا بھی تعین ہوتا ہے اور ان کو ریاستی تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے اداروں کو چلانے والے خواہ غیر مسلم ہوں، ان کی ملازمت اختیار کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ ادارے حرام اشیاء نہ بناتے ہوں۔ اگر ایسا ہو تو ان کی ملازمت ناجائز ہو گی۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا متبادل روزگار تلاش کرے۔ ایسے ہوٹل جہاں شراب، خنزیر اور دیگر محرمات کی خرید و فروخت ہوتی ہے، وہاں ملازمت حرام ہے۔"[2]

خلاصہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم کے ہاں ملازمت میں ذلت کا پہلو ہو تو ایسی ملازمت اختیار نہ کی جائے۔ لیکن اگر ملازمت ایسی ہو جو مسلمان کے لیے باعثِ تذلیل نہ ہو، جیسے کہ مسلمان درزی، لوہار، نانبائی یا کوئی ہنرمند شخص ہو، تو اسے غیر مسلموں کی ضروریات پوری کرنے کے

---

[1] حافظ محمد سعد اللہ، غیر مسلم معاشروں میں مسلمانوں کے مسائل، در مشمولہ، اجتماعی اجتہاد (تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں)، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۵۱۶-۵۱۷

[2]۔ محمد تقی عثمانی، مفتی، فقہی مقالات، یمن اسلامک پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۱، ج ۱، ص ۲۵۲-۲۵۵

بدلے اجرت لینا جائز ہے۔ اسی طرح، غیر مسلم ممالک کی حکومتوں کے محکموں میں جائز کام بھی مسلمان کے لیے جائز ہیں، بشرطیکہ وہ امتِ مسلمہ کو نقصان نہ پہنچائیں۔

شراب اور خنزیر کی تجارت کرنے والے ہوٹلوں اور دکانوں میں ملازمت:

غیر مسلم سماج میں شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت عام ہے۔ خصوصی تہواروں پر شراب نوشی اور خنزیر کا گوشت کھانا ان کی تہذیب کا حصہ سمجھا جانے لگا ہے۔ بڑے گروسری اسٹوروں سے لے کر چھوٹے جنرل اسٹورز تک شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ غیر مسلم ممالک میں سکونت پذیر مسلمان خواستہ یا نخواستہ ان دکانوں اور ہوٹلوں پر ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ایک مسلمان کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام ایک فطری دین ہے جو اپنے ماننے والوں کو پاکیزگی و پاکبازی، عفت و پاکدامنی جیسی اعلیٰ صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ مطلوبہ صفات کی نشو ونما کے لیے اور بے شرمی، بے حیائی اور جنسی راہ روی کے سدِباب کے لیے دین متین نے ہر اس چیز کے استعمال سے روک دیا ہے جو انسان میں اوصافِ رزیلہ کا باعث بنے۔ شراب، جوا، سود، زنا، خنزیر کا گوشت یہ سب صحتِ ایمانی اور صحتِ جسمانی کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اسی وجہ سے شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت اور ان کا استعمال حرام و ناجائز ہیں۔ ایسی دکانوں اور ہوٹلوں پر ملازمت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا[1]

(آپ سے شراب اور جوئے کے بارے سوال کرتے ہیں، فرما دیں: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ (دنیوی) فائدے بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔)

[1] سورۃ البقرۃ ۲:۲۱۹

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا: اگرچہ شراب اور جوئے میں بظاہر کچھ فائدہ ہے لیکن ان کا گناہ ان کے نقصان اور فائدے سے زیادہ ہے۔ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ شراب پینے سے عقل ماؤف ہو جاتی ہے اور یہی عقل انسان کو تمام برائیوں اور گناہوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ سورۃ النساء میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَقْرَبُواْ الصَّلاَةَ وَأَنتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُواْ مَا تَقُولُونَ[1]

(مومنو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ یہاں تک کہ تم وہ بات سمجھنے لگو جو کہتے ہو۔)

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی شراب سے کراہت اور ناپسندیدگی واضح طور پر جھلک رہی ہے۔ اس کے بعد سورۃ المائدہ میں شراب کی حرمت کا بیان ایسے جامع انداز میں کیا گیا ہے کہ کسی اور حرام اور ممنوع چیز کی حرمت کا اعلان اس قدر جامعیت کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالأَنصَابُ وَالأَزْلاَمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللّهِ وَعَنِ الصَّلاَةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ[2]

(اے ایمان والو! بیشک شراب اور جُوا اور (عبادت کے لئے) نصب کئے گئے بُت اور (قسمت معلوم کرنے کے لئے) فال کے تیر (سب) ناپاک شیطانی کام ہیں۔ تو تم ان سے (کلیتاً) پرہیز کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور کینہ ڈلوا

1۔ سورۃ النساء ۴:۴۳

2۔ سورۃ المآئدہ ۵:۹۱۔۹۰

دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔ کیا تم (ان شر انگیز باتوں سے) باز آؤ گے۔)

نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فرمان سے اس حرمت کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ حدیثِ پاک ہے:

كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ، وَمَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِي الدُّنْيَا فَمَاتَ وَهُوَ يُدْمِنُهَا لَمْ يَتُبْ، لَمْ يَشْرَبْهَا فِي الْآخِرَةِ۔[1]

"ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور شئے حرام ہے، اور جو دنیا میں شراب پئے اور وہ شراب کا عادی توبہ کئے بغیر مر جائے تو وہ آخرت میں شراب نہیں پیئے گا (یعنی وہ جنت کی شراب سے محروم رہے گا)۔"

اسی طرح خنزیر کے نجس العین ہونے کو قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ خنزیر نصِ قطعی کے ساتھ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ[2]

(تم فرماؤ میں نہیں پاتا اس میں جو میری طرف وحی ہوئی کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام مگر یہ کہ مُردار ہو یا رگوں کا بہتا خون یا بد جانور کا گوشت کہ وہ نجاست ہے۔)

جب ان کی حرمت نصِ قطعی سے ثابت ہے تو ان کی خرید و فروخت بھی شدید حرام ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ عَامَ الْفَتْحِ وَهُوَ بِمَكَّةَ: إِنَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ، وَالْمَيْتَةِ، وَالْخِنْزِيرِ، وَالْأَصْنَامِ، فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ،

1۔ مسلم، بن حجاج قشیری، صحیح مسلم، کتاب الأشربة، باب بیان أن کل مسکر خمر وأن کل خمر حرام، رقم الحدیث: ۱۵۸۷

2۔ سورۃ الانعام ۶:۱۴۵

أَرَأَيْتَ شُحُومَ الْمَيْتَةِ ؟ فَإِنَّهَا يُطْلَى بِهَا السُّفُنُ، وَيُدْهَنُ بِهَا الْجُلُودُ، وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ، فَقَالَ: لَا هُوَ حَرَامٌ۔[1]

"حضرت جابر کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال، اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سور اور بتوں کا بیچنا حرام قرار دے دیا ہے۔ اس پر پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! مردار کی چربی کے متعلق کیا حکم ہے؟ اسے ہم کشتیوں پر لگاتے ہیں۔ کھالوں پر اس سے تیل کا استعمال کرتے ہیں اور لوگ اس سے اپنے چراغ بھی جلاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں وہ حرام ہے۔"

رہی مسلم و غیر مسلم کو کھانے پینے کے لئے حرام اشیاء کی فراہمی تو یہ گناہ پر تعاون ہے اور قرآن کی رو سے گناہ پر تعاون جائز نہیں ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ[2]

(اور گناہ اور زیادتی پر باہم مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ شدید عذاب دینے والا ہے۔)

ترمذی میں حدیث ہے جس میں شراب سے متعلق دس افراد پر لعنت فرمائی گئی ہے۔

لعن رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم فی الخمر عشرۃ: عاصرھا ومعتصرھا وشاربھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ وساقیھا وبائعھا وآکل ثمنھا والمشتری لھا والمشتراۃ لہ۔[3]

"رسول اللہ ﷺ نے شراب کے معاملے میں دس بندوں پر لعنت فرمائی، جو شراب کے لیے شیرہ نکالے، جو شیرہ نکلوائے، جو شراب پیے، جو اٹھا کر لائے، جسکے پاس لائی جائے، جو شراب

---

[1]۔ بخاري، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب بیع المیتۃ والاصنام، رقم الحدیث: ۲۲۳۶

[2]۔ سورۃ المائدہ ۵:۲

[3]۔ مرغینانی، ابوالحسن علی بن ابی بکر، الہدایۃ، مطبوعۃ پشاور، کتاب الاشربہ، ج۴، ص ۵۰۳

پلائے، جو بیچے، جو اس کے دام کھائے، جو خریدے اور جس کے لیے خریدی جائے۔"

غیر مسلم کو بھی شراب پلانا جائز نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ ذمی اور بچے کو دوا کے لیے بھی شراب پلانا جائز نہیں اور اس کا وبال پلانے والے پر ہو گا۔

مذکورہ موضوع پر مولانا احمد رضا خان اپنے مشہور زمانہ فتاویٰ رضویہ میں رقم طراز ہیں:

شراب کا بنانا، بنوانا، چھونا، اٹھانا، رکھنا، رکھوانا، بیچنا، بکوانا، خریدنا، دلوانا، یہ سب حرام، حرام، حرام ہیں اور ایسی نوکری جس میں یہ کام شامل ہوں یا شراب کی دیکھ بھال، اس کی قیمتوں کا حساب کرنا ہو، سب شرعاً ناجائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[1]

حرام کام کی ملازمت کے بارے موسوعہ فقہیہ کویتہ میں ہے:

اتفقوا علی انہ لا یجوز للمسلم ان یؤجر نفسہ للکافر لعمل لا یجوز لہ فعلہ کعصر الخمر ورعی الخنازیر وما اشبہ ذلک۔[2]

"فقہاء نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ مسلمان کا کافر کے پاس ایسے کام کے لیے ملازم ہونا جائز نہیں جو کام اس کے لیے شرعاً جائز نہ ہو، مثلاً شراب (کے لیے انگور) نچوڑنا، خنزیروں کو چرانا اور اسی طرح کے دیگر ناجائز افعال۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جن چیزوں کا استعمال یا کھانا پینا خود ایک مسلمان کے لیے ناجائز اور حرام ہے وہ چیزیں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو فراہم کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے۔ اگر غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر کسی مسلمان کے پاس اس نوعیت کی ملازمت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ آمدن نہ ہو تو وہ انتہائی ناپسندیدگی کے ساتھ ایسی نوکری جاری رکھ سکتا ہے، لیکن اسے چاہیے کہ ہر وقت دعا اور کوشش کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اسے حلال ذریعے سے رزق عطا فرمائے۔

1۔ بریلوی، احمد رضا خان، مولانا، فتاوی رضویہ، رضا فاؤنڈیشن، لاہور، ج۲۳، ص۵۶۶-۵۶۵

2۔ موسوعہ فقہیہ کویتیہ، مطبوعہ کویت، ج۱۹، ص۴۵

مسلم اقلیات کے لئے فوج میں ملازمت:

غیر مسلم ممالک میں سکونت پذیر مسلمان بھائیوں کے لیے ایک اہم مسئلہ عسکری ملازمت کا ہے خصوصاً جب مسلمان سپاہی کو مسلم اُمہ کے خلاف بر سرِ پیکار ہونے کا حکم دیا جائے۔ سپاہی کے مختلف مناصب پر تعیناتی اور فرائض کی انجام دہی میں اس سے باز پرس کی جاتی ہے۔ ایسے حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے لیے فوج میں ملازمت اختیار کرنا حلال ہو گا یا حرام؟

اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے معروف اسکالر محمد نجات اللہ صدیقی، ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کی فوج میں ملازمت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود تعداد میں بہت زیادہ ہیں، ان میں ان کے فوج میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا ان کے تحفظ، جان و مال، اور دین و ملت دونوں پر گہرا اور دور رس اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمان علما اور دانشوروں نے فوج اور پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے مسئلے کو اہمیت کے ساتھ اٹھار کھا ہے۔ ہمارے موضوع کے اعتبار سے نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ کس طرح ایک مسئلہ، جب تک کسی فرد واحد کی روزی روٹی کے مسئلے کے طور پر دیکھا جاتا رہا، تو فتویٰ یہ تھا کہ فوج میں ملازمت سے دور رہو۔ لیکن جب (امریکی) فوج میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور فوجی خدمت کو شہریت کے حقوق و فرائض سے جوڑا گیا تو فتویٰ جواز میں بدل گیا۔ پھر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاق میں، جب فوج اور پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کو مسلمانوں کے مفادات و مصالح کے پس منظر میں دیکھا گیا اور اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے طویل المدتی مستقبل کے لیے اس کی اہمیت پر غور کیا گیا، تو مسئلے کی نوعیت یکسر بدل گئی۔ اب سوال جواز یا عدم جواز کا نہیں، بلکہ مطالبات اور مہم جوئی کا ہو گیا۔"[1]

[1] ۔ محمد نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعہ، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۱۷۱

غیر مسلموں کو ہتھیار فراہم کرنا:

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک مسلمان غیر مسلم کو ہتھیار فراہم کر سکتا ہے؟

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن کو ہتھیار فراہم کر کے انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں طاقتور بنائے، اور نہ باربرداری کے جانور (گھوڑے، خچر) فراہم کرے، اور نہ کوئی ایسی چیز جس سے ہتھیار اور باربرداری کے انتظام میں مدد لی جاتی ہے۔ [1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلم اقلیتوں کے لیے عسکری اداروں میں شمولیت اختیار کرنا یا غیر مسلموں کو ہتھیار فروخت کرنا ایک نہایت نازک مسئلہ ہے۔ متفق علیہ حدیثِ پاک کا مفہوم یہ ہے کہ جب دو مسلمان آمنے سامنے ہوں اور ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دے تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ عرض کیا گیا: قاتل کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر مقتول کیوں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس نے بھی اپنے بھائی کو قتل کرنا چاہا تھا۔" اگرچہ اس حدیث پاک کی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہ اس وقت ہے جب مسلمان اپنے فیصلے میں آزاد ہو لیکن جب وہ باقاعدہ فوج کا سپاہی بن جاتا ہے تو احکام کی بجا آوری اس پر فرض ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کی وفاداری مشتبہ قرار پائے گی۔ تاہم، ہم سمجھتے ہیں کہ جتنی بھی تاویلات و توضیحات کر لی جائیں مگر جب ایک مسلمان امتِ مسلمہ کے خلاف برسرِ پیکار ہو گا تو اس کا مقصد اپنے وطن اور اپنی شہریت کا تحفظ بن جائے گا اور وہ کلمۂ طیبہ کہ جس کی بنیاد پر مسلمانوں کو جسدِ واحد قرار دیا گیا ہے کو پسِ پشت ڈال دے گا۔ تو کہاں کا مسلمان رہا؟ کیا ایسا شخص واقعی مسلمان کہلا سکتا ہے؟ کیا اس کا ضمیر رات کے اندھیرے میں اسے سکون سے بیٹھنے دے گا اور کیا وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر خود کا سامنا کر سکے گا؟

---

[1] ابو یوسف، قاضی، الخراج، ص ۲۰۷

عہدِ حاضر میں اقلیتوں کے فقہی مسائل پر جو تحقیقات سامنے آ رہی ہیں، ان میں سے بعض میں رخصتوں کا اس قدر سہارا لیا گیا ہے کہ فقہ الاقلیات، اسلامی فقہ سے بالکل جدا نظر آتی ہے۔ ہماری رائے میں، ایسی کوئی بھی تجارت یا ملازمت جس سے مسلمان کی تذلیل ہو یا امتِ مسلمہ کا خسارہ ہو، کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

حلال و حرام سے متعلق مسائل اور انکا حل

غیر مسلم ممالک میں سود کے احکام و مسائل:

سود کا معنی و مفہوم:

ربوا یا ربا (مادہ: ر، ب، و) کے لغوی معنیٰ ہیں: نشو و نما پانا، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ[1]

(اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہلہانے اور نشو و نما پانے لگتی ہے۔)

اس کا معنی بڑھنا بھی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یمحق اللہ الربوا و یربی الصدقات[2]

(اللہ ربوا کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔)

سورۃ الروم میں یہ کثرت اور زیادتی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ[3]

اور تم جو چیز زیادہ لینے کو دو کہ دینے والے کے مال بڑھیں تو وہ اللہ کے یہاں نہ بڑھے گی)

اس کا ایک معنی ابھرنا بھی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المومنون میں فرمایا:

وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ[4]

(اور انہیں ایک بلند زمین ٹھکانا دیا۔)

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

---

[1] ۔الحج ۲۲:۵

[2] ۔البقرۃ ۲:۳۸

[3] ۔الروم ۳۰:۳۹

[4] ۔سورۃ المومنون ۲۳:۵۰

كمثل جنة بربوة۔[1]

(اور ہم نے ان دونوں کو ابھری ہوئی جگہ یعنی ٹیلے پر پناہ دی۔)

اسلامی جدت پسندی میں ایک اہم نام، ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے نزدیک ہماری زبان میں ربوا کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ لکھتے ہیں:

"فارسی زبان کا لفظ 'سود' قرآنی اصطلاح 'ربوا' کا مترادف نہیں ہے۔ اس فارسی لفظ کے لغوی معنی نفع ہیں جس کی ضد زیاں ہے اور جس کا عربی مترادف 'ربح' ہے۔ اس مقالے میں ربا کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن قرآن کی اصطلاحی ربا کا اردو، فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں ترجمہ کرنا راقم الحروف کے نزدیک نہ صرف سعی لا حاصل ہے بلکہ باطل بنیادوں پر ہے۔"[2]

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے تفردات میں سے ہے۔ اردو ادب کے جملہ مفسرین نے سود کو ربا کے ترجمے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں سود کو ربا ہی کہتے ہیں۔ ربوٰا کا لغوی معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَإِذَآ أَنزَلۡنَا عَلَيۡهَا ٱلۡمَآءَ ٱهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ[3]

(پھر جب ہم نے اس پر پانی اُتارا تروتازہ ہوئی اور ابھر آئی۔)

معلوم ہوا کہ ربا لغت میں زیادتی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

الربا الزيادة على رأس المال، لكن خص في الشرع بالزيادة على وجه دون وجه۔[4]

1۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۶۰

2۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن، تحقیق ربوا، فکر و نظر، ۱۹۶۳ء، ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، ج۱:۵، ص ۵۲

3۔ سورۃ الحج ۲۲:۵

4۔ اصفہانی، علامہ راغب، مفردات القرآن، دار القلم، دمشق، ص ۳۴۰

”ربا اصل پر زیادتی کو کہتے ہیں لیکن شریعت میں یہ ایک خاص قسم کی زیادتی کے ساتھ خاص ہے۔“

الربا هو فی اللغة الزيادة و فی الشرع هو فضل مال دون عوض شرط لاحد المتعاقدين[1]

”ربا لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں۔ شریعت میں اس زیادتی کو کہتے ہیں جو مال کے عوض ہو اور دو عقد کرنے والوں میں سے کسی ایک کے لئے شرط کر دی گئی ہو۔“

الربا فی اللغة الزيادة. يقال: ربا الشیء يربو ای يزيد و فی الشريعة هو فضل مال دون عوض فی معاوضة مال بمال[2]

”لغوی اعتبار سے ربا زیادتی کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے ربا الشیء یربو یعنی چیز بڑھ گئی جبکہ شرعی اعتبار سے جو مال کی زیادتی کسی چیز کے بغیر ہو یعنی مال کے بدلے مال ہو اسے ربا کہتے ہیں۔“

عبد الرحمٰن بن علی الحنبلی، سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۷۵ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الَّذِينَ يا كلون الربوا : لغوی اعتبار سے ربا کا معنی زیادتی ہے اور شرعی اعتبار سے: مال کا بلا عوض اور بلا مشقت حاصل کرنا ہے۔“[3]

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ربا کا لغوی معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے اور ربا کا اصطلاحی معنی مطلقاً زیادتی نہیں ہے کیونکہ اگر مطلقاً زیادتی جرم ہو، تو پھر کاروبار ہی حرام ہو جائے گا کیونکہ کاروبار میں جب کوئی چیز خریدی جاتی ہے تو وہ ہمیشہ زائد قیمت پر ہی بیچی جاتی ہے۔ تاہم، ایک خاص قسم کی زیادتی حرام ہے، یعنی وہ زیادتی جو عوض سے خالی ہو اور مشروط ہو، جیسے زید عمرو کو ایک لاکھ قرض دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک سال بعد آپ نے ایک لاکھ دو

---

[1] ۔ جرجانی، علامہ علی بن محمد اسید شریف، التعریفات، دار الفضیلۃ، القاہرہ، ص ۹۴-۹۳

[2] السایس، محمد علی، السبکی، عبد الطیف، محمد کرسون، محمد ابراہیم، تفسیر آیات الاحکام، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۲۸، ج ۱-۲ ص ۲۹۶

[3] ۔ محمد الجوزی،، ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی، زاد المسیر، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ، ج ۱، ص ۲۲۷

ہزار دینے ہیں۔ اب جو دو ہزار ہیں، یہ سود ہے، کیونکہ یہ ایسی زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہے اور مشروط بھی ہے۔

سود کی اقسام:

سود کی دو قسمیں ہیں: ا۔ ربا النسیئہ ۲۔ ربا الفضل

ربا النسیئہ کو ربا القران اور ربا الفضل کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں۔[1]

ربا النسیئہ کی اقسام:

زمانہ جاہلیت میں دو قسم کے سود رائج تھے۔ سود مفرد اور سود مرکب۔

سود مفرد:

سود مفرد کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو مدتِ معینہ کے لیے ایک معین رقم دے اور مدت پوری ہونے پر وہ رقم بطور سود اصل رقم کے علاوہ وصول کرے۔ مثلاً خالد ایک شخص کو ایک لاکھ روپے ایک سال کے لیے ادھار دے اور یہ شرط لگادے کہ سال کے بعد ایک لاکھ بارہ ہزار روپے دوں گا۔ یہ بارہ ہزار روپے سود مفرد قرار پائے گا۔ امام ابو بکر احمد بن علی الرازی فرماتے ہیں:

> الربا الذی كانت العرب تعرفه وتفعله إنما كان قرض الدراهم والدنانير إلى أجل، زيادة على المقدار ما استقرض على ما يرضون به[2]

> سود کی وہ شکل جس کو عرب جانتے اور کرتے تھے، وہ یہ تھی کہ دراہم اور دنانیر کو ایک معین مدت کے لئے کسی کو قرض پر دیا جائے اور مدت پوری ہونے کے بعد اصل رقم پر رضا مندی سے ایک زیادتی بھی وصول کی جائے۔

---

[1]۔ السایس، محمد علی، السبکی، عبد الطیف، محمد کرسون، محمد ابراہیم، تفسیر آیات الاحکام، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۲۸، ج ۱-۲ ص ۲۹۶

[2]۔ الجصاص، احمد بن علی الرازی، احکام القرآن، ج ۲، ص ۱۸۳

سود مرکب:

سود کی دوسری قسم جس کا عرب کے معاشرے میں رواج تھا، وہ مرکب سود ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک معین مدت بتادی جائے اور اگر وہ اس مدت میں قرض ادانہ کر سکے تو مدت بڑھانے کے ساتھ سود میں بھی اضافہ کر دیا جائے۔ مثلاً زید کسی کو لاکھ روپے سالانہ، دو ہزار روپے سود پر دے۔ جب سال پورا ہو جائے اور مقروض ادانہ کر سکے تو زید مدت بڑھا دے، مثلاً اس کو کہہ دے کہ چھ ماہ بعد دے دینا مگر سود چھ ہزار دینا ہے۔ اس کو سود مرکب کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں قسم کے سود حرام فرمائے ہیں۔ رازی لکھتے ہیں:

واما ربا النسیئة فهو الامر الذی کان مشهورا متعارفا فی الجاهلیة وذالك انهم کانوا یدفعون المال علی ان یاخذه کل شهر قدرا معینا ویکون راس المال باقیا ثم اذا حل الدین طالبوا المدیون براس المال فان تعذر علیه الاداء زادوا فی الحق والاجل فهذا هو الربا الذی کانوا فی الجاهلیة یتعاملون[1]

”ربا النسیئہ وہ جو زمانہ جاہلیت میں مشہور تھی کہ وہ لوگ کسی شخص کو ایک مالِ معین اس شرط پر دیتے تھے کہ وہ ہر ماہ ایک معین رقم ادا کرے گا۔ جب مدت پوری ہو جاتی تو اس سے رقم کا مطالبہ کرتے اگر وہ ادانہ کر سکتا تو شرح سود میں زیادتی اور مدت ادائیگی میں توسیع کر دیتے۔“

ربا الفضل:

ربا الفضل کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے صراحتاً چھ چیزوں کی اپنی جنس سے بیع میں تفاضل اور زیادتی کو حرام فرمایا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1]۔ الرازی، فخر الدین، محمد بن حسین، التفسیر الکبیر، دار الفکر، بیروت، ج۷، ص ۶۲

ينهى عن بيع الذهب بالذهب،والفضه بالفضلة، والبر بالبر، والشعير بالشعير،والتمر بالتمر،والملح بالملح الا سواء بسواء عينا بعين،فمن زاد او ازداد فقد اربى،[1]

سونے کو سونے کے عوض، چاندی کو چاندی کے عوض، گندم کو گندم کے عوض، جو کو جو کے بدلے، کھجور کو کھجور، نمک کے بدلے نمک فروخت کرو نقد اور برابر، برابر اور جب یہ آپس میں مختلف ہوں تو جس طرح چاہے فروخت کرو! شرط یہ ہے کہ نقد بیع ہو۔ جس نے زیادہ دیا یا لیا اس نے سود کا (لین دین) کیا۔

سود کی خرابیاں:

۱۔ سود میں اصل رقم پر جو اضافہ لیا جاتا ہے، وہ اضافہ بلا عوض ہوتا ہے اور مقررہ مدت کے بدلے میں وصول کیا جاتا ہے جو سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔

۲۔ سود خور کو بغیر محنت اور مشقت کے مال حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے وہ تجارت کی مشقت اور نقصان کے خطرے سے بچا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے سود خور، تجارت کی مشقت اٹھانے کی بجائے بغیر محنت کے سود لینے کو ترجیح دیتا ہے جس سے تجارت میں کمی واقع ہوتی ہے۔

۳۔ سود کی وجہ سے بلا سود قرض دینے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور مسلمان حسنِ عمل سے محروم ہو جاتا ہے۔[2]

نفع اور سود میں فرق:

مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ سود بھی تو کاروبار کی طرح ہے۔ امام الکیا الہراسی لکھتے ہیں:

رد الله تعالىٰ على المشركين فى قولهم: ذلك بانهم قالوا انما البيع مثل الربا،وذلك انهم زعموا انه لا فرق بين الزيادة الماخوذة على وجه الربا۔[3]

---

[1]۔ مسلم، ابو الحسین مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف، و بیع الذھب بالورق نقداً، رقم الحدیث: ۱۵۸۷

[2]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان الفرقان، ج ۱، ص ۵۸

[3]۔ الکیا الہراسی، عماد الدین بن محمد طبری، احکام القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۴ھ، ج ۱-۲ ص ۲۳۳

”اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس قول کا رد کیا ہے کہ بیع بھی تو ربا کی طرح ہے۔ بیشک وہ سمجھتے تھے کہ سود اور کاروبار کے نام پر جو زیادہ وصول کیا جائے اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے بیع کو جائز قرار دیا ہے اور سود کو ناجائز۔ ان دونوں میں فرق بالکل واضح ہے۔ ہم دوکاندار سے پانچ روپے کی چیز چھ روپے میں خوشی سے خرید لیتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ یہ چیز پانچ روپے کی ہے لیکن دوکاندار نے اس پر محنت اور وقت صرف کیا ہے اور اضافی ایک روپیہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے لیکن جب کوئی شخص پانچ روپے پر ایک روپیہ سود لیتا ہے تو اس ایک روپے میں وقت کے علاوہ اور کوئی چیز شامل نہیں ہوتی جسے اس اضافی روپے کا بدل کہا جا سکے۔ اسی لیے تجارت میں نفع لینا جائز ہے لیکن رقم پر سود لینا ناجائز ہے۔ [1]

سود کی حرمت:

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ ذاتی ضروریات کے لیے لیا جائے یا تجارتی مقاصد کے لیے۔ اس سود سے غریبوں کا بھلا ہو یا برا، پروردگارِ عالم نے امیری اور غریبی کا کوئی فرق کیے بغیر سود کو حرام فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: احل اللہ البیع وحرم الربوا[2] یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا: یا ایھا الذین امنو اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ[3]

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو تو (زمانہ جاہلیت کا) باقی ماندہ سود چھوڑ دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔)

1۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج ۱، ص ۹۸۱

2۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۷۵

3۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۷۸۔۲۷۹

سورۃ آل عمران میں فرمایا:

يا ايها الذين امنو لا تاكلوا الربوا اضعافا مضعفة واتقوا لله لعلكم تفلحون[1]

(مومنو! نا کھاؤ سود! دوگنا کر کے اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاو۔)

غیر مسلم ممالک میں سود:

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

دار الحرب میں سود اسی طرح حرام ہے جس طرح دار الاسلام میں حرام ہے۔ائمہِ ثلاثہ، امام اوزاعی، امام ابو یوسف اور امام اسحاق کا بھی یہی مذہب ہے۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسلمان اور حربی کے مابین دار الحرب میں سود جاری نہیں ہو گا۔ہمارے دلائل یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا[2]

(اللہ نے حلال کیا بیع اور حرام کیا سُود۔)

ایک اور مقام پر فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا[3]

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے۔)

قرآن مجید نے سود کو علی العموم حرام قرار دیا ہے، اور سنتِ مشہورہ سے بھی اس کی حرمت علی الاطلاق ثابت ہے۔اس کے حرام ہونے پر اجماع ہو چکا ہے لہٰذا قرآن مجید کے اس عموم اور احادیثِ صحیحہ کے اطلاق کو کسی غیر مصدقہ خبر کی بنیاد پر ترک کرنا جائز نہیں۔[4]

1۔ سورۃ آل عمران ۳:۱۳۰

2۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۷۵

3۔ سورۃ البقرۃ ۲:۲۷۸

4۔ ابن قدامہ حنبلی، ابو محمد عبد اللہ بن احمد، المغنی، ج ۴، ص ۴۷

غیر مسلم ممالک میں سود فقہاء احناف کی نظر میں:

غیر مسلم ممالک میں سودی لین دین کے جواز میں امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد کے موقف کا ماخذ درج ذیل حدیث ہے:

لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب[1]

"دار الحرب میں مسلم اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے۔"

درج بالا حدیث مرسل ہے۔ جرح و تعدیل کے امام، شمس الدین ذہبی حدیث میں موجود مکحول بن ابی مسلم کے جس سے امام اعظم نے روایت لی ہے کے بارے لکھتے ہیں:

"مکحول (م ۱۱۳ھ یا ۱۱۸ ھ) کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے۔ کثیر صحابہ سے آپ کی ملاقات اور سماع ثابت ہے۔ زہری، اوزاعی اور بے شمار محدثین نے ان سے روایات لی ہیں۔ فن جرح و تعدیل کے آئمہ نے آپ کی ثقاہت کو تسلیم کیا ہے۔ مکحول نے رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ نبوت سے کثیر تعداد میں مرسل احادیث روایت کی ہیں۔ [2]

اسی حدیث کی مزید توثیق کرتے ہوئے علامہ ابو الحسن مرغینانی لکھتے ہیں:

لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب خلافا لابی یوسف والشافعی[3]

"یعنی رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب کہ مسلمان اور حربی کے درمیان دار الحرب میں سود نہیں"

مکحول کی روایت کا تجزیہ: درج بالا روایت کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ آئمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ مکحول کی بیان کردہ روایت ثابت نہیں ہے اور ثبوت کی تقدیر کے اعتبار سے اس میں قرآن کریم اور صحیح مشہور احادیث سے معارضہ کی

1۔ زیلعی، عبد اللہ بن یوسف، نصب الرایہ لاحادیث الھدایہ، موسسۃ الریان، بیروت، ۱۹۹۷ء، ج ۴، ص ۴۴

2۔ الذھبی، شمس الدین، محمد بن احمد، سیر اعلام النبلاء، بیت الافکار الدولیۃ، لبنان، ۲۰۰۴، ص ۹۳۰ ۹۳۱

3۔ المرغینانی، ابو الحسن علی بن ابو بکر، ھدایۃ اخیرین، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص ۹۰

صلاحیت نہیں پائی جاتی۔"[1]

علامہ غلام رسول سعیدی مذکورہ روایت کا محمل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مکحول کی یہ روایت صحیح ہے اور واقعی رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے: "لا ربو بین المسلم والحربی۔ مسلمان اور حربی میں سود نہیں ہے" تو اس حدیث کی حسب ذیل توجیہات ہیں:

اول: اس حدیث میں "لا" نفی کا نہیں ہے بلکہ نہی کا ہے اور اس کا معنی ہے: مسلمان اور حربی کے مابین سود کی ممانعت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج[2]

(حج میں جماع، فسوق اور لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔) یعنی ان افعال کی ممانعت ہے۔

ثانی: اس حدیث میں "حربی" سے مراد صرف غیر ذمی کافر نہیں بلکہ برسرِ جنگ قوم کا ایک فرد ہے۔ جس قوم کے ساتھ حالتِ جنگ ہو اسے ہر ممکن طور پر جانی اور مالی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے اگر کسی مسلمان نے اس قوم کے کسی حربی کافر سے سودی معاملے کے ذریعے اس کا مال حاصل کرلیا، تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔

ثالثاً: "لا ربا" کا یہ مفہوم نہیں کہ حربی کافر سے جو سود لیا جائے وہ سود کے زمرے میں نہیں آتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دار الحرب میں رہنے والا مسلمان اگرچہ حربی کافر سے سود لیتا ہے تو یہ فعل گناہ ہے لیکن قانون اور ممانعت کے دائرے سے مستثنیٰ ہے۔ یعنی مسلمان حکومت اس شخص سے بازپرس نہیں کرسکتی کہ اس نے یہ فاسد عقد کیوں کیا اور سود کیوں لیا۔ نیز اس مسلمان کو اس غلط کام پر سزا بھی نہیں دی جاسکتی کیونکہ دار الحرب میں رہنے والا مسلمان، مسلمانوں کی ولایت میں نہیں آتا اور اس پر اسلامی ریاست کے احکام نہیں لگتے۔[3]

---

[1]۔ ابن ہمام، علامہ کلام الدین، فتح القدیر، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر، ج ٦، ص ١٧٨

[2]۔ سورۃ البقرۃ ٢:١٩٧

[3]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، ج ١، ص ٩٨٥

امام سرخسی فرماتے ہیں کہ امام اعظم کا اصول یہ ہے کہ اگر مسلمان دار الحرب میں کوئی عقدِ فاسد کریں تو مسلمان اس کا مالک تو ہو جائے گا لیکن اس کا یہ عمل گناہ شمار ہو گا۔ آپ لکھتے ہیں:

اگر دار الحرب میں رہنے والے دو افراد مسلمان ہو جائیں اور وہیں سکونت اختیار کریں اور ان کے درمیان سود کا معاملہ ہو، تو میں اسے مکروہ (تحریمی) قرار دیتا ہوں، لیکن ایسا سود واپس نہیں کیا جائے گا۔ اسی پر امام ابو حنیفہ کا فتویٰ ہے۔[1]

دار الحرب میں سودی لین دین کے جواز کے قائلین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق جب آپ نے ایران اور روم کی جنگ کے دوران مشرکین مکہ سے شرط لگائی، تو آپ نے شرط میں سو اونٹ جیتے اور مشرکین سے یہ مال وصول کیا جسے بعد میں صدقہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو شرط لگانے سے منع فرمایا اور نہ ہی مال لینے سے۔ اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دار الحرب میں قمار (جوا) کے معاملے کی بھی اجازت ہے، کیونکہ مکہ اُس وقت دار الحرب تھا۔ مذکورہ روایت کو علامہ آلوسی، امام بغوی، اور قاضی بیضاوی نے بغیر سند کے نقل کیا ہے، جس میں حضرتِ صدیق کے شرط جیتنے کا ذکر موجود ہے۔ تاہم علامہ ابن کثیر نے اس کے برعکس حضرت ابو بکر صدیق کے شرط ہارنے کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ تابعین کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ مفسرین کی بیان کردہ اس روایت کو عطا خراسانی کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے اور اسے بہت زیادہ غریب قرار دیا گیا ہے۔[2]

علامہ غلام رسول سعیدی مذکورہ بالا روایت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قمار کے واقعے سے متعلق روایات مضطرب ہیں۔ بعض روایات میں حضرت ابو بکر صدیق کے جیتنے کا ذکر ہے جبکہ بعض میں ہارنے کا۔ مضطرب روایات سے

1۔ سرخسی، محمد بن احمد، شمس الائمہ، المبسوط مطبوعہ دار المعرفہ، ج۱۴، ص۵۸

2۔ ابن کثیر، حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر، تفسیرِ القرآن، ج۵، ص۳۴۲

استدلال کرنا صحیح نہیں۔ قمار کا یہ واقعہ بالاتفاق حرمتِ قمار سے پہلے کا ہے، کیونکہ یہ شرط فتحِ مکہ سے پہلے لگائی گئی تھی، اور قمار کی حرمت سورہ مائدہ میں نازل ہوئی، جو مدینہ میں سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے نہ خود اس مال کو قبول فرمایا اور نہ ہی حضرت ابو بکر صدیق کو لینے دیا، بلکہ فرمایا: "یہ مال حرام ہے، اسے صدقہ کر دو۔" اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ جب کوئی شخص مالِ حرام سے بری الذمہ ہونا چاہے تو اسے صدقہ کر دے۔[1]

امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد کے موقف کا ذکر کرنے کے بعد علامہ غلام رسول سعیدی نفس مسئلہ پر اپنا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمان اور حربی کے درمیان دارالحرب میں سود جائز نہیں ہے کیونکہ اگر غور و فکر کیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم ممالک میں سود جائز نہیں ہے۔ باقی متقدمین احناف نے جو جواز کا فتویٰ دیا ہے وہ دارالحرب کے بارے میں ہے۔ تاہم موجودہ زمانے میں کوئی بھی ملک دارالحرب نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کا منشاء یہ ہے کہ دنیا میں مسلمان اخلاق اور کردار کے اعتبار سے ایک آئیڈیل قوم کے طور پر پہچانے جائیں۔ دوسرے لوگ جو کافر ہیں، وہ مسلمانوں کے اخلاق دیکھ کر مسلمان ہوں۔ مسلمانوں کی امانت اور دیانت کی پوری دنیا میں شہرت ہو۔ اگر مسلمان نے مکارمِ اخلاق کھو دیا اور خود ہی ان اصولوں کی خلاف ورزی کر دی جن کے لیے وہ کھڑا تھا، تو پھر مسلمان اور دوسرے اقوام میں کیا فرق باقی رہے گا؟ اس لیے دلائل کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ نہ تو غیر مسلم ممالک میں سود جائز ہے اور نہ ہی ان کا مال ناجائز طریقے سے بٹورنا جائز ہے۔[2]

---

[1]۔ سعیدی، علامہ غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، ج ۱، ص ۹۹۰

[2]۔ ایضاً، ج ۱، ص ۹۸۸

عصر حاضر میں عالم اسلام کی مشہور شخصیت ڈاکٹر یوسف قرضاوی غیر مسلم ممالک میں موجود مسلم اقلیات کے لئے امام ابو حنیفہ اور امام محمد کی رائے کو پسند کرتے ہیں۔ یورپی مجلس عالم اسلام کے علماء کی مختلف آراء کا تجزیہ کرنے کے بعد سودی لین دین سے متعلق اپنی رائے امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے مطابق ذکر کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”غیر مسلم ممالک میں سود جیسے عقود فاسدہ نہ کرنے سے مسلمان اقتصادی بدحالی اور معاشی خسارے کا شکار ہوں گے۔ اگر عقود فاسدہ غیر مسلموں کی رضامندی کے باوجود نہیں کیے جائیں گے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ جو کچھ اس کے ذمے ہو گا وہ ادا کرے گا لیکن بدلے میں کچھ نہیں لے سکے گا۔ وہ ریاست کی ادائیگی والے قوانین پر عمل کرے گا، لیکن ریاست کی طرف سے ملنے والی مراعات سے فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ وہ اقتصادی طور پر اسلام کے احکام کی وجہ سے مظلوم ہو گا۔ حالانکہ اسلام میں یہ نہیں ہے۔ اسلام میں اصل حرمت سود کھانا اور لینا ہے۔ سود دینا سد ذریعہ کے طور پر حرام ہے، لیکن دینا بوقت حاجت جائز ہے۔[1]

ہماری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ جس طرح غیر مسلم ممالک میں کافروں کی عورتوں سے زنا حرام اور ناجائز ہے اسی طرح سود بھی حرام اور ناجائز ہے۔ غیر مسلم ممالک میں سودی لین دین کے جواز کو بیان کرنے والے بھی دار الحرب کی قید لگاتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی بھی معروف ملک دار الحرب نہیں ہے۔ فقہاء کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب مسلمان کسی غیر مسلم قوم سے برسر جنگ ہوں، اس وقت کافروں کا ملک دار الحرب ہوتا ہے اور اسی وقت دار الحرب کے

---

[1] ۔یوسف قرضاوی، الدکتور، فقہ الاقلیات المسلمہ، ص۱۷۹- ۱۵۴

کافروں کے جان اور مال مباح ہوتے ہیں۔ لیکن جن ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم ہوں اور وہاں پاسپورٹ اور ویزے کے ذریعے آنا جانا مسلمانوں کا معمول ہو، وہاں مسلمانوں کو جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ بھی میسر ہو اور انہیں اسلامی احکامات پر عمل کرنے کی آزادی ہو، جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، انگلستان، یورپ اور کوریا وغیرہ، یہ ممالک دار الحرب نہیں ہیں بلکہ دار الکفر ہیں اور ایسے ممالک کے کافروں کے مال مباح نہیں ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد نے "لا ربا بین المسلم والحربی" (مسلمان اور حربی کافر کے درمیان سود نہیں) کے اصول کے تحت یہ فتویٰ دیا کہ غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلم اقلیتیں مالیاتی اداروں کے ذریعے صرف مکانات خریدنے یا دیگر ضروری حاجات پوری کرنے کے لیے سودی لین دین کر سکتی ہیں لیکن یہ کراہت (تحریمی) کے ساتھ جائز ہو گا۔ اسی طرح، ائمہ ثلاثہ (امام شافعی، امام مالک، اور امام احمد بن حنبل) نے "الضرورات تبیح المحظورات [1] " (ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں) کے اصول کے تحت اس معاملے کو قابل قبول قرار دیا ہے۔

اسی اصول کو بیمہ (Insurance) اور انشورنس کے معاملات پر بھی لاگو کیا جائے گا، یعنی اگر کسی ناگزیر ضرورت کی وجہ سے انشورنس کروانا پڑے تو شریعت اس معاملے میں گنجائش فراہم کرتی ہے، بشرطیکہ یہ واقعی حاجتِ ضروریہ ہو۔

غیر مسلم کا ذبیحہ:

غیر مسلم ممالک میں موجود مسلم اقلیات کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ ذبیحہ کا سامنے آتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، انگلستان، جرمنی، فرانس، چائنہ، کوریا اور جاپان وغیرہ میں انسان کی بڑھتی ہوئی غذائی ضروریات کی بروقت تکمیل کے لئے جانوروں کو مختلف طریقوں سے ذبح کرنے کا اور پھر مشینوں کے ذریعے ذبح کرنے کا عمل عصرِ حاضر میں مقبولیت اختیار کر چکا ہے۔ عہد حاضر میں ذبح کرنے کی متعدد صورتیں سامنے آئی ہیں۔ جن میں سے بعض

---

[1] ۔ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم محمد، الاشباہ والنظائر، ج ۱، ص ۱۱۸

صورتیں اختیار کرنے سے شریعتِ اسلامیہ کی بیان کردہ شرائطِ ذبح کی تکمیل نہیں ہوتی۔
زمانۂ جاہلیت میں اہل مکہ اور مشرکین عرب چونکہ اہل کتاب تھے اور نہ کسی آسمانی ہدایت کے پابند تھے اس لیے انہوں نے ازخود جائز وناجائز کے اصول اور طریقے اپنا رکھے تھے۔ وہ اپنے آبائی مذہب کے مطابق جانور ذبح کرتے وقت بتوں اور دیوتاؤں کے نام لیتے۔ وہ لوگ مردار کھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتے اور اس بارے کہا کرتے کہ جب انسان کا مارا ہوا جائز ہے تو خدا کا مارا ہوا ناجائز کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں ذبح کے بغیر مختلف طریقوں سے مرے ہوئے جانوروں کو حرام قرار دیا ہے وہاں مشرکین کی طرف سے دیوی، دیوتاؤں، بتوں اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے گئے جانوروں کا کھانا بھی ممنوع قرار دے دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ[1]

(اس نے تم پر حرام کیا ہے صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔)

سورۃ الانعام میں ارشاد فرمایا:

وَلَا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا لَمۡ يُذۡكَرِ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ[2]

(اور تم اس (جانور کے گوشت) سے نہ کھاؤ جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔)

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو ہی جائز قرار دیا اور اسے کھانے کا حکم دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ بِاٰيٰتِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ[3]

---

[1]۔ سورۃ البقرۃ ۲:۱۷۳

[2]۔ سورۃ الانعام ۶:۱۲۲

[3]۔ سورۃ الانعام ۶:۱۱۸

(سو تم اس (ذبیحہ) سے کھایا کرو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو اگر تم اسکی آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہو۔)

بت پرست مشرکین کے برعکس چونکہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بنیادی طور پر خدا، وحی اور رسالت کے تصورات پر ایمان رکھتے تھے اور انہیں ملت توحید ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس لیے قرآن مجید نے ان کے ذبیحہ کو حلال اور جائز قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ وَطَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ [1]

(آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا ذبیحہ (بھی) جنہیں (الہامی) کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے۔)

اہل کتاب کے طعام سے مراد:

آیت مندرجہ بالا میں اہلِ کتاب کے "طعام" سے علماء نے ان کا ذبیحہ مراد لیا ہے۔ امام بخاری نے "الصحیح" کی کتاب الصید والذبائح میں ایک باب کے عنوان میں ہی سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا درج ذیل قول نقل کیا ہے:

وقال ابن عباس رضی الله عنهما طعامهم ذبائحهم۔ [2]

ابو داؤد اور بیہقی نے مذکورہ آیات کی تفسیر کے ذیل میں درج ذیل روایت بیان کی ہے۔

عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: فکلوا مما ذکر اسم الله علیه ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم الله علیه فنسخ واستثنیٰ من ذلك فقال وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم [3]

---

[1]۔ سورۃ المائدہ ۵:۵

[2]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصید والتسمیۃ علی الصید، باب ذبائح اہل الکتاب وشحومہا، من اہل الحرب وغیرھم، رقم الحدیث:۵۵۰۸

[3]۔ بیہقی، ابو بکر احمد بن حنبل، السنن الکبریٰ، مکتبہ الدار، رقم الحدیث: ۱۸۹۳۵

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں:

"فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ" سو تم اس ذبیحہ سے کھاو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ "(ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ) اور تم اس جانور کے گوشت سے نہ کھایا کرو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، یہ آیات اس اگلی آیت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت بیان فرمائی: وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم اور ان لوگوں کا ذبیحہ (بھی) جنہیں (الہامی) کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے۔ (یعنی اہل کتاب کے ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہیں اور تمہارے ذبح کیے گئے جانور ان کے لئے حلال ہیں)۔"

عقیدہ اور علم کلام میں احناف کے امامِ اکبر، امام ابو منصور الماتریدی نے اس مسئلہ کو تفسیر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس آیت کریمہ کے ضمن میں حضرت عبد اللہ بن عباس کا یہ تفسیری قول بھی نقل کیا ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ،قال: و طعام الذین اوتوا الکتب حل لکم ای: ذبائحھم حل لکم وذبائحکم حل لھم۔[1]

"حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے آیت (وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم) اور ان لوگوں کا ذبیحہ (بھی) جنہیں (الہامی) کتاب دی گئی۔ تمہارے لیے حلال ہے۔ کی تفسیر میں فرمایا: یعنی اہل کتاب کے ذبح کئے جانور تمہارے لیے حلال ہیں اور تمہارے ذبح کیے ہوئے جانور ان کے لئے حلال ہیں۔"

---

[1] ۔ماتریدی، ابو منصور محمد بن محمد، تاویلات اہل السنۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ، ج۳، ص ۴۶۲

قال ابن عباس رضی اللہ عنہ: طعامھم ذبائحھم۔[1]

"ابن عباس نے فرمایا ان کے طعام سے مراد ان کے ذبیحے ہیں۔"

الغرض اہل کتاب کے طعام کا یہی مفہوم کم و بیش تمام مفسرین نے بیان کیا ہے مثلاً علامہ زمخشری کے قول کو امام رازی نے بھی اسی ذیل میں ذکر کیا:

عن ابن عباس انه سئل عن ذبائح نصاری العرب، فقال: لا باس۔ وھو قول عامة التابعین وبه اخذ الحنیفه و اصحابه[2]

"حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے، ان سے اہل عرب نصاریٰ کے ذبیحہ سے متعلق شرعی حکم پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا: ان کا ذبیحہ جائز ہے۔ اکثر تابعین کا بھی یہی قول ہے اور اسی پر امام اعظم ابو حنیفہ اور دیگر احناف نے اپنا موقف قائم کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اس موقف کی تائید کرنے والے اکابر تابعین کے نام بھی شامل کیے ہیں۔"

قال ابن عباس، وابو امامة و مجاھد و سعید بن جبیر و عکرمه و عطاء والحسن ومکحول وابراھیم النخعی والسدی و مقاتل بن حیان: یعنی ذبائحھم و ھذا امر مجمع علیا بین العلماء ان ذبائحھم حلال للمسلمین[3]

یعنی درج بالا صحابی (ابن عباس) اور تابعین حضرات نے اہل کتاب کے طعام سے مراد ان کا ذبیحہ لیا ہے۔ اس مسئلے پر تمام علمائے کرام کا اجماع ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔"

امام قرطبی نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے قرآن حکیم کی آیت سے پیدا ہونے والے استثناء کو بھی اس آیت کے حکم

1۔ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، جامع البیان، ج۶، ص ۱۰۲

2۔ زمخشری، ابو القاسم، محمد بن عمر، الکشاف، ج۱، ص ۶۴۳

3۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص ۲۰

سے دور کر دیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ایسے جانور کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے جس پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

قال ابن عباس: قال تعالیٰ(ولا تاکلوا مما لم یذ کر اسم اللہ علیہ) ثم استثنی قال: و طعام الذین او توا الکتب حل لکم، یعنی ذبیحۃ الیھودی والنصرانی وان کان النصرانی یقول عند الذبح باسم المسیح والیھودی یقول باسم عزیر ذلک لانھم یذبحون علیٰ الملتہ[1]

''حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ولا تاکلوا مما لم یذ کر اسم اللہ علیہ پھر استثناء کیا اور فرمایا: و طعام الذین او توا الکتب حل لکم سے مراد یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے اگرچہ عیسائی ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہودی ذبح کرتے ہوئے حضرت عزیر علیہ السلام کا نام ہی لیتے ہیں۔ یہ ذبیحہ اس لیے جائز سمجھا جائے گا کیونکہ یہود و نصاریٰ ملتِ توحید پر رہتے ہوئے ذبح کرتے ہیں۔''

امام بیضاوی اپنا نقطہ نظر یوں بیان کرتے ہیں:

وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم، یتناول الذبائح وغیرھا۔[2]

''اہل کتاب کا طعام تمہارے لیے حلال ہے۔''

اس آیت میں طعام کا لفظ ذبیحوں اور دیگر کھانوں کو شامل ہے۔

امام زمخشری نے اس کی تفسیر میں جانوروں کے گوشت کے علاوہ ان کے تمام کھانے بھی مراد لیے ہیں نیز عرب اور غیر عرب نصاریٰ کی تمیز بھی ختم کر دی ہے۔ کہتے ہیں:

قیل: ھو ذبائحھم و قیل جمیع مطاعمھم ویستوی فی ذلک جمیع النصاریٰ[3]

---

[1] ۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع الاحکام القرآن، بیروت، ج ٦، ص ٧٦

[2] ۔ بیضاوی، عبد اللہ بن عمر، انوار التنزیل، ج ٢، ص ٢٩٧

[3] ۔ زمخشری، ابو القاسم محمد بن عمر، الکشاف، ج ١، ص ٦٠٧

"کہا گیا ہے کہ طعام سے مراد ان کے ذبیحے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے تمام کھانے ہیں اور یہ حکم تمام نصاریٰ کے لئے برابر ہے۔"

بوقت ذبح جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کے بارے مذاہبِ فقہاء:

اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی تبیان الفرقان میں، ابن جوزی کی زاد المسیر کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ جس جانور پر ذبح کے وقت عمداً بسم اللہ نہ پڑھی گئی ہو، اس جانور کے بارے میں امام احمد بن حنبل کے دو اقوال ہیں: اولاً اگر بھولے سے ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنا ترک کر دیا تو وہ جانور مباح ہے (دوسری صورت میں مباح نہیں ہے)۔ اور امام محمد بن ادریس شافعی نے کہا ہے کہ وہ جانور ہر دو صورت میں حرام ہے۔ ہمارے شیخ علی بن عبید اللہ نے فرمایا کہ اگر کسی نے عمداً ذبح کے وقت بسم اللہ ترک کر دی تو اس کی اباحت ممنوع ہے۔ اور اہل کتاب کے ذبائح کی حرمت اس آیت کے عموم سے منسوخ ہے، کیونکہ اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم (اور اہل کتاب کا ذبیحہ بھی تمہارے لیے حلال فرمادیا گیا ہے۔ وانہ لفسق یعنی جن جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیا گیا تو ان کو کھانا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔[1]

مفتی احمد یار خان نعیمی سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۱۲۱ پر وارد ہونے والے اعتراض کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مما لم یذکر" میں "ما" عام ہے۔ جس جانور کو اللہ کے ذکر کے بغیر ذبح کر دیا جائے، وہ حرام ہے، خواہ عمداً ہو یا بھول کر۔ آیت میں بھول یا عمد کی کوئی قید نہیں ہے۔ آپ جواب دیتے ہیں کہ "مما لم یذکر" نفی جحد ہے، جس میں عمداً کی طرف اشارہ ہے، اور اس عمل کو اللہ نے فسق قرار دیا ہے، جبکہ بھول چوک فسق نہیں کہلاتی۔[2]

1۔ سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان الفرقان، ج۲، ص ۷۴۳

2۔ مفتی احمد یار خان نعیمی، تفسیر نعیمی، ج۸، ص ۱۷

مفتی احمد یار خان معترضین کا ایک اور اعتراض نقل کرتے ہیں کہ ابو داود کی حدیث مبارکہ کی رو سے مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، چاہے وہ اللہ کا نام لے یا عمداً چھوڑ دے۔ حدیث کے الفاظ ہیں :ذبيحة المسلم حلال ذكر اسم الله أولم يذكر۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمداً چھوڑا ہوا ذبیحہ بھی حلال ہے۔ اس اعتراض کا رد کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ حدیث خبرِ واحد ہے، اس کی وجہ سے حکمِ قرآنی میں ترمیم نہیں کی جاسکتی، لہٰذا وہ حدیث قابلِ عمل نہیں۔ یہ آیت واجب العمل ہے (تفسیر روح المعانی)۔ خیال رہے کہ اس مسئلے میں امامِ اعظم کی تائید سات آیات سے ہوتی ہے:(۱) تین آیات سورہ انعام میں،(۲) تین آیات سورہ حج میں، اور ایک آیت سورہ مائدہ میں۔ سورہ انعام والی آیات یہ ہیں: وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔[1] (اور اسے نہ کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا) وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ[2] (اور تمہیں کیا ہوا کہ اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا) فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ[3] (تو کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا) سورۃ الحج کی تین آیات یہ ہیں: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ[4] (اور اللہ کا نام لیں جانے ہوئے دنوں میں اس پر کہ اُنہیں روزی دی بے زبان چوپائے)وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ[5] (اور ہر امت کے لیے ہم نے ایک قربانی مقرر فرمائی کہ اللہ کا نام لیں)وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ[6]

(اور قربانی کے ڈِیل دار (بھاری جسامت والے) جانور اونٹ اور
گائے ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیوں سے کیے تمہارے لیے ان

1۔ سورۃ انعام ۶:۱۲۱

2۔ سورۃ انعام ۶:۱۱۹

3۔ سورۃ انعام ۶:۱۱۸

4۔ سورۃ الحج ۲۲:۲۸

5۔ سورۃ الحج ۲۲:۳۴

6۔ سورۃ الحج ۲۲:۳۶

میں بھلائی ہے)سورۃ المائدہ کی آیت یہ ہے۔فَكُلُوا مِمَّآ اَمۡسَكۡنَ عَلَيۡكُمۡ وَ اذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلَيۡهِ (تو کھاؤ اس میں سے جو وہ مار کر تمہارے لیے رہنے دیں اور اس پر اللہ کا نام لو) بہر حال اس مسئلہ میں مذہب حنفی بہت ہی قوی ہے۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس جانور کو ذبح کرتے وقت مسلمان عمداً اللہ کا نام لینا چھوڑ دے، اس کا کھانا حرام ہے۔ احناف کے نزدیک قرآن پاک اور متعدد احادیث کی روشنی میں اگر تسمیہ عند الذبح بھولے سے رہ جائے تو وہ جانور حلال ہے۔ یہی مسلک ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے اور امام بخاری نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ اہلِ کتاب کے ذبیحہ میں، ترکِ تسمیہ خواہ ناسیاً ہو یا عامداً، فقہاء کے نزدیک اس میں گنجائش موجود ہے۔

طعام سے مراد:

مذکورہ بالا آیات کے تحت آئمہ نے یہ بحث کی ہے کہ طعام سے مراد عام کھانے ہیں یا صرف ذبیحہ؟ بہت سے اہلِ علم نے صرف ذبیحہ مراد لیا ہے۔ تاہم بعض (مثلاً علامہ زمخشری) نے اس میں اہلِ کتاب کے عام کھانے بھی شامل کیے ہیں۔ ذیل میں جمہور کے دلائل دیکھتے ہیں:

۱۔ امام نیشاپوری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ طعام سے مراد اہل کتاب کے تمام کھانے نہیں بلکہ ان کا ذبیحہ ہی ہے کیونکہ تمام کھانے تو ویسے بھی جائز ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

> "اکثر علماء اس پر متفق ہیں کہ طعام سے مراد اہلِ کتاب کے ذبائح ہی ہیں، کیونکہ اس سے پہلے کی آیت شکار اور ذبائح کے بارے ہے۔ اس لیے بھی کہ شکار اور ذبیحے کے علاوہ باقی کھانے تو پہلے ہی حلال قرار دیے جا چکے ہیں۔ اگر طعام سے مراد عام کھانے ہوں تو آیتِ مبارکہ میں اہلِ کتاب کو مخصوص کرنے کا کیا فائدہ باقی رہ جاتا ہے؟"[2]

---

[1]۔ مفتی احمد یار خان نعیمی، تفسیر نعیمی، ج۸، ص ۷۱

[2]۔ نیشابوری، نظام الدین حسن بن محمد، تفسیر غرائب القرآن، مطبعۃ الکبریٰ، ج۳، ص ۱۲۵

۲۔ امام ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص نے اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ اور حضرت سدی جیسے تمام جلیل القدر صحابہ اور تابعین، طعام سے اہل کتاب کا ذبیحہ ہی مراد لیتے تھے:

> والا ظهر ان يكون المراد الذبائح خاصة لان سائر طعامهم من الخبز والزيت وسائر الادهان لا يختلف حكمها بمن يتولاه، ولا شبهة فى ذلك على احد، سواء كان المتولى لصنعه واتخاذه مجوسيا او كتابيا، ولا خلاف فيه بين المسلمين۔
>
> آیت کا ظاہر اسی کا تقاضا کرتا کہ اس سے مراد خاص طور پر ان کے ذبائح ہوں کیونکہ یہ (ان کے طعام میں داخل ہیں) اس لیے کہ انکے دوسرے تمام کھانوں مثلا روٹی، زیتون اور دوسری روغنیات وغیرہ کے سلسلے میں ان کے تیار کرنے والوں کے اعتبار سے حکم میں کوئی فرق نہیں ہو گا اور اس بارے کسی پر کوئی شک بھی نہیں ہوتا۔ خواہ یہ کھانا اس کتابی نے خود تیار کیا ہو یا کسی مجوسی یا کسی کتابی سے تیار کرایا ہو۔ مسلمانوں کے درمیان اس سے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے۔[1]

آیتِ کریمہ کا ظاہر اس (مرادی معنی) کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے کہ اہلِ کتاب کے ذبائح ان کے طعام میں شامل ہیں۔ اگر ہم طعام کے لفظ کو اس کے عموم پر رکھیں تو یہ اہلِ کتاب کے تمام کھانوں کو شامل ہو گا، چاہے وہ کھانے ذبیحہ جانوروں پر مشتمل ہوں یا دیگر اشیائے خورو نوش پر۔ امام ابو بکر جصاص کی وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ اس مقام پر طعام سے مراد اہلِ کتاب کا ذبیحہ ہی ہے کیونکہ اہلِ کتاب کے دیگر کھانوں، مثلاً بریڈ، تیل، روغنیات وغیرہ کے جواز کے بارے مسلمانوں میں کوئی اختلاف موجود نہیں۔ خواہ ان کھانوں کو کسی مجوسی

[1]۔ جصاص، ابو بکر احمد بن علی الرازی، احکام القرآن، ج ۲، ص ۴۵۶

نے تیار کیا ہو یا کسی اہلِ کتاب نے بنایا ہو، ان کے جواز کے بارے کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

امام جصاص مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فلما خص اللہ تعالیٰ طعام اھل الکتاب بالاباحۃ وجب ان یکون محمولاً علی الذبائح التی یختلف حکمھا باختلاف الادیان[1]

"جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے طعام کو خصوصیت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔تو اب ضروری ہے کہ ان کے ذبائح پر ہی محمول کیا جائے، کیونکہ اس کے احکام مذاہب کے بدلنے سے بدل جاتے ہیں۔"

جصاص نے اہل کتاب کے ذبیحہ کے جائز ہونے پر ایک مثال بھی پیش کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک یہودی عورت نے بکری کا پکا ہوا گوشت تحفے میں بھیجا تو آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ تناول فرمایا:

ولم یسالھا عن ذبیحتھا اھی من ذبیحۃ المسلم ام الیھودی[2]

"آپ نے نہیں پوچھا کہ اسے مسلمان نے ذبح کیا ہے یا یہودی نے۔"

شمس الائمہ محمد بن ابی بکر السرخسی الحنفی، آیت مذکورہ کے تحت صراحت سے لکھتے ہیں:

ولا باس بصید الیھودی والنصرانی وذبیحھما لقولہ تعالیٰ (وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم)۔[3]

"یہودی اور عیسائی کے شکار اور ذبیحہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اہلِ کتاب کا طعام تم پر حلال ہے۔"

عربی و عجمی اور حربی و غیر حربی اہل کتاب کا ذبیحہ:

اب کتبِ فقہ میں ایک اور سوال زیرِ بحث آیا ہے کہ کیا ذبیحہ صرف عرب اہلِ کتاب کا جائز ہو گا یا تمام دیگر ممالک کے اہلِ کتاب بھی اس حکم میں شامل ہیں؟

1۔ جصاص، ابو بکر احمد بن علی الرازی، احکام القرآن، ج ۲، ص ۴۵۶

2۔ جصاص، ابو بکر احمد بن علی الرازی، احکام القرآن، ج ۲، ص ۴۵۶

3۔ سرخسی، محمد بن احمد، شمس الائمہ، ص ۲۴۶

امام جصاص، امام اعظم اور صاحبین کا یہ قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال ابو حنیفه وابو یوسف ومحمد وزفر: من کان یهودیا او نصرانیا من العرب والعجم فذبیحته مذکاة[1]

"امام ابو حنفیہ، ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر سب کا موقف یہ ہے کہ عرب و عجم کے ہر یہودی اور عیسائی کا ذبیحہ حلال ہے۔"

نامور فقیہ امام برہان الدین ابو الحسن علی بن ابو بکر المرغنیانی، اپنی کتاب الھدایۃ میں اہل کتاب کو بر بنائے دعویٰ ملتِ توحید میں شامل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے۔

أن يكون الذابح صاحب مِلَّة التوحيد، أما اعتقاده كمسلم أو دعواه كالكتابي. قال: وذبيحة المسلم والكتابي حلال، لقول الله تعالى) :وطعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم .(وإطلاق الكتابي ينتظم الكتابي والذمي والحربي والعربي والتغلبي۔[2]

"ذبح کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ ذبح کرنے والا ملت توحید سے ہو۔ خواہ اعتقادی طور پر ہو جیسا کہ مسلمان یا دعوی کرتا ہو جیسے یہودی اور نصرانی، اور مسلم (کی طرح) کتابی کا ذبیحہ بھی اس آیت کی دلیل کی بناء پر حلال ہے جو ہم نے تلاوت کی (و طعام الذین اوتوا الکتب حل لکم) اور کتابی کا لفظ مطلقاً سب قسم کے کتابیوں کو شامل ہے خواہ اسلام کی عمل داری میں ذمی ہو کر رہ رہے ہوں یا خود مختار حربی کے طور پر خواہ عربی ہو، یا تغلبی (بنو تغلب سے) ہو۔ (کیونکہ انہوں نے نصرانیت سے شراب پینے کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں اپنایا۔)"

امام بغوی، معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:

1۔ جصاص، ابو بکر احمد بن علی الرازی، احکام القرآن، ج ۲، ص ۴۵۶

2۔ مرغینانی، برھان الدین علی بن ابی بکر، الھدایہ، ج ۳، ص ۳۴۰

"اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے ذبائح اور ان کی قوم کے ذبائح جو ان میں شامل ہوئے تھے، جبکہ ابھی حضور ﷺ مبعوث نہیں ہوئے تھے، حلال فرما دیے ہیں اور جو شخص حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد ان کے دین میں داخل ہوا، اس کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔"[1]

قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ اگر ایک یہودی نے حضرت عزیر علیہ السلام کا نام لے کر کوئی جانور ذبح کیا اور کسی نصرانی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر جانور ذبح کیا تو ہمارے نزدیک اس کا کھانا حلال نہیں۔"[2]

ذبح کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لینے پر ذبیحہ کی حلت یا حرمت کا مسئلہ:

مندرجہ ذیل بحث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے جائز اور حلال ہونے پر تمام صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف و خلف کا اجماع ہے۔ حتیٰ کہ اگر ذبح کے وقت کسی عیسائی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے لیا تو اس پر بعض ائمہ نے اختلاف کیا ہے لیکن اکثر ائمہ فقہ اس ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے عقائد، اعمال اور جانور ذبح کرنے کی روش اور شعار سے آگاہ ہونے کے باوجود ان کا ذبیحہ حلال قرار دیا ہے، تو ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ ذبح کرتے وقت کس کا نام لیتے ہیں۔
قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ امام شعبی اور امام عطاء سے نصرانی کے اس ذبیحہ کے بارے میں پوچھا گیا جس پر حضرت عیسیٰ کا نام لیا گیا تھا۔

قالا یحل فان اللہ تعالیٰ قد احل ذبائحھم وھو یعلم ما یقولون
وقال الحسن: اذا ذبح الیھودی اوالنصرانی قد قرا اسم غیر اللہ تعالیٰ
وانت تسمع فلا تاکل، واذا غاب عنك فکل، فقد احل اللہ لك[3]

1۔ بغوی، حسین بن مسعود الفراء، معالم التنزیل، ج۲، ص ۲۱۲

2۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۳، ص ۴۰

3 قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج۳، ص ۴۱

"امام شعبی اور عطا نے فرمایا: (مسیح کا ذبح کے وقت نام لینے والے کا) ذبیحہ حلال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے ذبائح کو حلال قرار دیا ہے جبکہ وہ خوب مانتا ہے کہ عیسائی (ذبح کے وقت کیا کہتے ہیں۔ اسی طرح امام حسن بصری علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ اگر کوئی یہودی یا عیسائی ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے اور تم سن رہے ہو تو (احتیاطاً) اسے نہ کھاو اور اگر تمہاری عدم موجودگی میں ذبح کیا گیا ہو تو پھر کھالو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے۔"

یہاں پر امام بخاری، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ایک حدیث لائے ہیں:

قالوا: یا رسول الله ان قوما یا تو ننا باللحم لا ندری اذ کروا اسم الله علیها ام لا فقال رسول الله ﷺ: سموا الله علیه انتم و کلوه[1]

"صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! بعض لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ اس پر انہوں نے اللہ کا نام لیا یا نہیں۔ کیا ہم اس سے کھالیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اس پر اللہ کا نام لو اور کھالو۔"

یاد رہے یہ مشرک نہ تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: ان ھاھنا اقواماً حدیث عھدھم بشرك یاتونا بلحمان الخ[2]

امام علاؤالدین ابو بکر الکاسانی الحنفی اپنی کتاب بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع میں لکھتے ہیں۔

إنما تو کل ذبیحة الکتابی إذا لم یشهد مسلم ولم یسمع منه شیء، أو سمع وشهد منه تسمیة الله تعالى وحده، لأنه إذا لم یسمع منه شیئًا یحتمل أنه قد سمّى الله تبارك وتعالى الخ[3]

1۔ بخاری محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب من لم یر الوساوس ونحوها من المشبھات، رقم الحدیث:۲۰۵۷

2۔ بخاری محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب من لم یر الوساوس ونحوها من المشبھات، رقم الحدیث:۷۳۹۸

3۔ کاسانی، ابو بکر بن مسعود، بدائع الضائع، ج۶، ص ۲۳۰

"کتابی کا ذبیحہ اس صورت میں کھایا جاسکتا ہے جب کوئی مسلمان وہاں موجود نہ ہو اور نہ ہی اس نے اسکی زبان سے کچھ سنا ہو اور اگر سنا ہو تو اس نے اسے اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہوئے پایا ہو۔ اس لیے کہ اگر اس نے اس سے کچھ سنا تو اسے اس کے حسن ظن کی بناء پر اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ اس نے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہے جیسا کہ مسلمان کے بارے بھی یہی حکم ہے۔ اگر کسی نے اس سے اللہ کا نام سنا لیکن اس سے اس کی مراد عیسیٰ ہیں تو بھی فقہاء کرام کہتے ہیں کہ اسے کھالیا جائے۔"

امام ابو بکر محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العربی مالکی لکھتے ہیں کہ بیشک اس (طعام) سے مراد ان کے ذبح کیے ہوئے جانور ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے طعام کے کھانے کی اجازت دی ہے۔ ہمارے شیخ زاہد امام ابو الفتح نصر بن ابراہیم نابلسی نے اس معاملے میں تفصیلی گفتگو فرمائی، جس کا لب لباب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان (اہلِ کتاب) کے طعام کے بارے میں اجازت مرحمت فرمائی ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ (اہلِ کتاب) اپنے ذبیحے پر ذبح کے وقت اس کے غیر کا نام لیتے ہیں لیکن جب انہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ وابستگی اختیار کی اور ایک نبی کے دامن سے وابستہ ہوگئے، تو ان کے لیے بت پرستوں کے مقابلے میں حرمت وعزت بنادی گئی۔"[1]

امام مالک علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ مطلقاً انکے ذبح کئے ہوئے جانور کھائے جائنگے سوائے ان جانوروں کے جو انہوں نے اپنے عید کے ذبح کئے۔ یا خصوصاً اپنے بتوں کے لئے ذبح کئے۔

امام ابن العربی نے مزید لکھا ہے:

فقال جماعة العلماء: تؤكل ذبائحهم إن ذكروا عليها اسم غير المسيح، وهي مسألة حسنة نذكر لكم منها قولاً بديئًا، وذلك أن

---

[1] ۔ابن عربی محمد بن عبد اللہ، احکام القرآن، ج ۲، ص ۴۲

الله سبحانه حرّم ما لم يسمَّ الله عليه من الذبائح وأذن في طعام أهل الكتاب وهم يقولون: إن الله هو المسيح ابن مريم، إنه ثالث ثلاثة، تعالى الله الخ[1]

علماء کی اکثریت نے فرمایا: ان کے ذبیحے کھائے جائیں گے اگرچہ وہ ذبح کے وقت ان پر مسیح کے علاوہ کسی اور کا نام لیں اور یہ بہت عمدہ مسئلہ ہے جسکے بارے ہم ایک نئی اور نفیس بات بیان کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جانوروں میں جس جانور پر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسکو تو حرام قرار دے دیا جبکہ اہل کتاب کے ذبیحہ کی اجازت دے دی۔ حالانکہ وہ اہل کتاب کہتے ہیں بے شک اللہ مسیح بن مریم ہی ہے اور بے شک وہ تین میں تیسرا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ قول سے بہت بلند و برتر اور پاک ہے تو اگر وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام نہ لیں تب بھی ان کا ذبیحہ کھا لیا جائے اور اگر وہ ذبح کے وقت کوئی نام لیں، تب بھی کھا لیا جائے کیونکہ تمہارا رب جانتا ہے انھوں نے کیا نام لیا ہے اور وہ یقیناً غیر اللہ کا نام ہو گا۔

امام احمد رضا خان فاضلِ بریلی، العطایۃ النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویہ میں موضوع زیرِ بحث سے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اہل کتاب یہودی یا عیسائی اگر اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کرے تو اسکا ذبیحہ حلال ہو گا اگرچہ وہ غیر اللہ کے لیے ذبح کرے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کریں تو ظاہری الفاظ کے اعتبار پر وہ ذبیحہ حلال ہو گا اور غیر لفظ کا اعتبار نہ ہو گا۔ جو اکثر کتب دینیہ میں لکھا ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ درست ہے تو آج کل کے یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ بھی درست ہے یا نہیں؟ کے جواب میں اپنا موقف یوں بیان کرتے ہیں کہ شک نہیں کہ جو نصاریٰ الوہیت وابنیت، عبد اللہ و ابن امتہ، سیدنا مسیح ابن مریم کی صاف

---

[1] ۔ ابن عربی، محمد بن عبد اللہ احکام القرآن، ج ۲، ص ۴۲

تصریح کرتے ہیں، جو نصاریٰ ایسے ہیں اور یونہی وہ یہود کے ابنیت عبد اللہ عزیر علیہ الصلوۃ والسلام مانیں ان کا ذبیحہ حلال ہونے میں ہمارے ائمہ کا اختلاف ہے، جمہور مشائخ جانب حرمت گئے اور کہا گیا کہ اسی پر فتویٰ ہے اور بکثرت محققین، تحقیق جواز فرماتے ہیں کہ یہی ظاہر الروایۃ اور یہی اقوی من حیث الدلیل ہے۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیر مسلم کا ذبیحہ جائز تو ہے لیکن اگر وہ ذبح کے وقت ببانگ دہل عقیدہ تثلیث کا اقرار کرتا ہو یا عزیر علیہ السلام کو خدا کہتا ہو تو اس کی کراہت وشناعت میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اگر مسلمان قصاب بھی ذبح کے وقت تکبیر چھوڑ دے تو خریدار کے چہرے پر تشویش کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک غیر مسلم غیر اللہ کے نام پر ذبح کرے اور مسلمان بلا جھجک اس کا ذبیحہ استعمال کرلے۔

مشینی ذبیحہ:

صنعتی ترقی کے اس مشینی دور میں انسان زیادہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی بجائے مشینوں کے ذریعے کرتا ہے۔ بڑھتی ہوئی غذائی ضروریات کے پیشِ نظر، ترقی یافتہ ممالک میں خاص طور پر الیکٹرک مشینوں کے ذریعے ذبح کا عمل مکمل کیا جاتا ہے۔ اس طریقے میں سے ایک مشہور طریقہ یہ ہے کہ کثیر تعداد میں جانور مشین کے نیچے کھڑے کر دیے جاتے ہیں اور ایک بٹن دبانے سے ان سب کی گردنیں کٹ جاتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسی مشین کے ذریعے ذبح کیا گیا جانور جائز ہو گا یا ناجائز؟ اس مسئلے کو ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

قرآن کریم نے کسی جانور کا گوشت حلال ہونے کے لئے ذکاۃ (شرعی طریقے سے ذبح) کو ضروری قرار دیا ہے بغیر ذکاۃ شرعی کے ذبیحہ قطعاً حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ[2]

---

[1]۔ احمد رضا خان، اعلیحضرت، فتاویٰ رضویہ، رضا فاونڈیشن، لاہور، ۱۴۲۲ھ، ج ۲۰، ص ۲۴۶

[2]۔ سورۃ المائدہ ۵:۳

(تم پر حرام ہے مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جس کے ذبح میں غیر خدا کا نام پکارا گیا اور وہ جو گلہ گھونٹنے سے مرے اور بے دھار کی چیز سے مارا ہوا اور جو گر کر مرا اور جسے کسی جانور نے سینگ مارا اور جسے کوئی درندہ کھا گیا مگر جنہیں تم ذبح کرلو۔)

آیت سے واضح ہوا صرف وہی جانور حلال ہے جسے ذکاۃ شرعی کے ذریعے حلال کیا گیا ہو۔

ذبح شرعی:

ذبح شرعی یا ذکاۃ شرعی کی تعریف کرتے ہوئے امام راغب فرماتے ہیں:

وحقيقة التذكية اخراج الحرارة العزيزية فكن خص فی الشرع بطال الحياة على وجه دون وجه[1]

" تذکیہ کی حقیقت، حرارت عزیزیہ ساقط کرنا ہے لیکن اصطلاح شریعت میں مخصوص طریقہ سے حیاۃ زائل کرنے کو تذکیہ کہتے ہیں۔"

امام راغب کی اس تصریح سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ ذکاۃ مطلقاً جانور کو قتل کر دینے کا نام نہیں بلکہ اس کے لیے ایک خاص طریقہ مقرر ہے۔

۲۔ وہ خاص طریقہ محض عادات و رسوم کے تابع نہیں بلکہ ایک شرعی اصطلاح اور قانون ہے۔

ابو عبد اللہ محمد بن احمد لکھتے ہیں:

انها فی الشرع عبارة عن انهار الدم و فری الاوداج فی المذبوح[2]

"ذکاۃ شرع میں خون کا بہانا اور مذبوح کی رگوں کو کاٹنا ہے۔"

ذبح شرعی کی قسمیں:

ذبح شرعی کی پھر دو قسمیں ہیں: ۱۔ ذبح اختیاری، ۲۔ ذبح اضطراری

1۔ اصفہانی، علامہ راغب، مفردات القران، دار القلم، دمشق، ص ۳۳۰

2۔ قرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، ج۸، ص ۲۷۸

"جب مسلمان شخص جانور کے گلے پر چھری پھیرنے کی قدرت رکھتا ہو اور بسم اللہ پڑھ کر اس کو ذبح کر سکتا ہو تو یہ ذکاۃ اختیاری ہے۔ اور اگر وہ اس کے گلے پر چھری پھیر کر ذبح نہ کر سکے تو پھر یہ ذکاۃ اضطراری ہے، مثلاً جب وہ وحشی جانور کو قابو نہ کر سکے یا پالتو جانور بھاگ جائے یا جانور کنویں یا کسی گڑھے میں گر جائے یا جانور کے مرنے کا خطرہ ہو اور بروقت ذبح کا آلہ دستیاب نہ ہو۔ یہ تمام اضطرار کی صورتیں ہیں۔ ایسی صورتوں میں کسی بھی دستیاب آلے کے ذریعے جانور کے بدن سے خون بہا دیا جائے تو وہ جانور حلال ہو گا۔"

ذکاۃ اختیاریہ کی تعریف

ملا نظام الدین حنفی لکھتے ہیں:

أما الاختياريّة فركنها الذبح فيما يُذبح من الشاة والبقر والنحر، فأما ينحر وهو الإبل عند القدرة على الذبح والنحر، ولا يحل بدون الذبح والنحر. والذبح هو فري الأوداج الخ[1]

"ذکاۃ اختیاریہ کا رُکن ذبح اور نحر ہے یعنی بکری اور گائے کو ذبح کیا جائے اور اونٹ کو نحر کیا جائے جبکہ ذبح اور نحر پر قدرت ہو۔ ذبح کی تعریف یہ ہے کہ سینہ کے بالائی حصہ اور جبڑوں کے درمیان جو رگیں ہیں ان کو کاٹ دیا جائے اور نحر کی تعریف یہ ہے کہ آخر حلق کی رگوں کو کاٹ دیا جائے۔ اگر نحر کی جگہ ذبح اور ذبح کی جگہ نحر کر دیا جائے تب بھی جانور حلال ہو گا البتہ یہ فعل مکروہ ہے کیونکہ طریقہ یہ ہے کہ اونٹ کو نحر کیا جائے اور باقی جانوروں کو ذبح کیا جائے۔"

ذکاۃ اضطراریہ کی تعریف:

ذکاۃ اضطراریہ کا رُکن یہ ہے کہ جانور کے بدن کے کسی حصے کو زخمی کر دیا جائے۔ ذکاۃ اضطراریہ یا تو شکار میں ہوتی ہے یا اگر اونٹ، گائے، بکری بھاگ جائے اور انسان اسے

---

[1] ۔ ملا نظام الدین حنفی، فتاویٰ ھندیۃ، ج ۵، ص ۲۸۵

پکڑنے پر قادر نہ ہو۔ اگرچہ یہ پالتو جانور ہیں، لیکن اس صورت میں یہ بھی شکار کے حکم میں ہیں، خواہ یہ پالتو جانور شہر میں بھاگیں یا جنگل میں۔[1]

ذبح کا مدار کتنی رگوں کے کاٹنے پر ہے:

ملا نظام الدین حنفی لکھتے ہیں کہ ذبح میں چار رگوں کو کاٹا جاتا ہے: ۱۔ حلقوم: (اسے نرخرا کہتے ہیں اور اس سے سانس لی جاتی ہے) ۲۔ مری (خوراک کی نالی) ۳، ۴۔ ودجان (دو شہ رگیں) یہ گردن کے دائیں بائیں جانب خون کی دو نالیاں ہیں۔ اگر یہ چاروں نالیاں کٹ جائیں تو ذبیحہ بالاتفاق حلال ہے۔ اگر بکری کو گُدّی کی جانب سے کاٹا جائے اور اس کے مرنے سے پہلے اکثر رگیں کٹ جائیں تو وہ حلال ہے اور اگر وہ رگیں کاٹنے سے پہلے مر جائے تو وہ حلال نہیں ہے، لیکن یہ خلافِ سنت ہے لہٰذا مکروہ ہے۔ اس فعل سے جانور کو زیادہ اذیت پہنچتی ہے۔ حلقوم کی جانب سے ذبح کرنا مستحب ہے اور گُدّی کی جانب سے ذبح کرنا مکروہ ہے۔"[2]

جانور کے حلال ہونے کے لیے ذبح شرعی کی شرائط:

ذبح کی اقسام سے معلوم ہوا کہ اسلام میں جانوروں کو ذبح کرنے کا طریقہ ایک تعبدی طریقہ ہے جس کی خلاف ورزی گناہ ہے اور بعض صورتوں میں ذبیحہ حلال نہیں ہوتا۔ لہٰذا ذبح کا مسنون اور شرعی طریقہ وہی ہے جو عام طور پر مسلمانوں میں رائج ہے کہ جانور کو لٹا کر گلے کی چار موٹی رگیں قطع کر دی جائیں جن سے خون بہہ جائے۔

سر دھڑ سے بالکل جدا کرنا:

ذبح میں سر کو دھڑ سے بالکل جدا کرنا منع ہے۔ محمد بن اسماعیل روایت کرتے ہیں:

عن ابن جريج قال: أخبرني نافع أن ابن عمر نهى عن النَّخْعِ، يقول:
"يقطع مادون العظم ثم يدع حتى يموت[3]

---

[1]۔ ملا نظام الدین حنفی، فتاویٰ ھندیہ، مطبوعہ امیریہ کبریٰ، مصر، ج۵، ص ۲۸۵

[2]۔ ایضا، ج۵، ص۲۸۶-۲۸۵

[3]۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الذبائح والصید والتسمیۃ علی الصید، باب النحر والذبح

"ابن جریج سے روایت ہے کہ مجھے نافع نے کہا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نخع کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ گردن کی آخری ہڈی نخاع کو قطع نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ (چار رگیں کاٹ کر) چھوڑ دیں یہاں تک کہ جانور مر جائے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا منع فرمانا دلیل ہے کہ آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ہی نخع کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس لیے گلے کی رگوں کو اتنا گہرا کاٹنا کہ آخر گردن تک پہنچ جائے درج بالا حدیث کی رو سے ناجائز ہے۔ اور اس سے زیادہ گناہ اور ناجائز یہ ہے کہ گُدّی کی طرف سے کاٹا جائے اور سر کو دھڑ سے الگ کر دیا جائے۔

و من بلغ بالسکین النخاع اوقطع الراس کرہ لہ ذلك و توکل ذبیحة وان ذبح الشاة من قفاھا فبقیت حیة حتی قطع العروق حلت لتحقق الموت بما ھو ذکاة[1]

"اور جس نے ذبح کے وقت چھری کو نخاع تک یعنی گردن کی آخری ہڈی تک پہنچا دیا تو یہ مکروہ ہے مگر ذبیحہ حلال ہے اور اگر بکری کو گُدّی کی طرف سے ذبح کیا اور وہ عروقِ ذبح کے قطع ہونے تک زندہ رہی تو ذبیحہ حلال ہو گیا۔ مگر ایسا کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔"

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کو گردن کے اوپر سے کاٹنا ذبح کے شرعی طریقے کے خلاف اور ناجائز ہے اور گردن کو جسم سے الگ کرنا ایک مکروہ فعل ہے۔ اگر گردن سے کاٹنے کی صورت میں آہستہ آہستہ کاٹا جائے جس سے رگیں کٹنے سے پہلے موت واقع ہو جائے تو اس صورت میں ذبیحہ مردار اور حرام ہو جائے گا۔ البتہ اگر تیز چھری سے فوراً گردن الگ کر دی جائے تو حالانکہ یہ طریقہ شرعاً غلط ہے اور گناہ کا باعث ہے، لیکن چونکہ اس عمل کے دوران بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا گیا، اس لیے ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔

---

[1]۔ مرغینانی، برھان الدین علی بن ابو بکر، ھدایۃ، ج ۴، ص ۴۲۷

مشینی ذبیحہ کا طریقہ کار اور حکم:

مشینی ذبح کا عمل درج ذیل مراحل سے گزر کر ممکن ہوتا ہے:

۱۔ بڑے جانوروں کو ذبح سے پہلے سر میں گولی یا ہتھوڑا مار کر بے ہوش کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جانور کو کم تکلیف ہو اور خون جلدی بہہ جائے۔ اس طریقہ کار سے اگر جانور کی موت ہو جائے تو وہ موقوذہ (چوٹ لگنے والا جانور) شمار ہو گا۔

ڈاکٹر شکیل اوج کے مطابق، مشینی ذبح جس میں جانور کے ہوش و حواس کو ختم کر دیا جائے اور وہ ٹانگوں کو حرکت دینے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جائے ایسے جانور حلال ذبیحہ میں تو شمار ہوں گے لیکن انہیں حلالاً طیبا کہنا محلِ نظر ہو گا۔ جانور کے دماغ پر چوٹ یا ضرب لگانا بامر مجبوری تو درست ہو سکتا ہے، لیکن مستقل بنیادوں پر اسے اختیار کرنا اسلامی قانونِ ذبح کے خلاف ہے۔ اگرچہ زمانے کے تغیر سے روایتی طریقوں سے ہٹ کر بھی ذبح کے طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں کیونکہ ذبح کا طریقہ قرآن میں منصوص نہیں ہے۔[1]

۲۔ عموماً مرغیوں اور چھوٹے جانوروں کو بجلی کے شاک لگا کر بے ہوش کیا جاتا ہے اور ذبح کے جملہ مراحل عموماً مشین کے ذریعہ ہی انجام پاتے ہیں۔ ہزاروں مرغیاں چین (chain) پر لٹکائی جاتی ہیں، پھر الیکٹرک شاک کے ذریعہ بے ہوش کر کے مشینی چھری کے ذریعے ذبح کے عمل سے گزاری جاتی ہیں۔

۳۔ جانور کو بے ہوش کرنے کے بعد مشین سے جڑی زنجیر سے جانور کو لٹکا کر ایک آدمی ہاتھ سے اس کا حلق کاٹتا ہے اور کبھی لٹکانے سے قبل زمین پر جانور کو ذبح کر کے زنجیر سے لٹکایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے تمام مراحل مثلاً کھال اُتارنا، الائشوں کی صفائی اور گوشت کے کٹنے کا عمل مشین کے ذریعہ ہی مکمل کیا جاتا ہے۔

۴۔ مشینی ذبیحہ میں بعض اوقات جانور کو صفائی کے لئے کھولتے ہوئے پانی میں ڈالا جاتا ہے۔

---

[1] محمد شکیل اوج، تعبیرات، کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۷۱-۱۷۲

مشین کے ذریعے ذبح کیے گئے جانور کی حلت اور حرمت کے بارے فقہاء کی دو آراء ہیں:

ا۔ اولاً یہ کہ مشین کے ذریعے ذبح کیا گیا جانور حرام ہے خواہ ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا اہل کتاب سے ہو، اس نے اللہ کا نام لیا ہو، غیر اللہ کا نام لیا ہو یا سکوت اختیار کیا ہو۔

مفتی محمد شفیع نے "بینات" میں چند شرائط کے ساتھ مشین سے ذبح کیے گئے جانور کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا، تو اس پر نقد کرتے ہوئے مفتی محمود نے کہا:

> "مہربان من! میں سمجھتا ہوں کہ بٹن دبانے والا مسلمان بھی ہو اور بٹن دبانے کے وقت تسمیہ بھی پڑھے تب بھی مشین کے ذریعے ذبح کیا گیا جانور حلال نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ مردار ہی ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ بٹن دبانے والے نے صرف اتنا ہی کیا کہ برقی طاقت اور مشین کا جو کنکشن (تعلق) کٹ چکا تھا اور ان دونوں کے درمیان جو مانع تھا، اسے دور کر دیا اور پھر سے کنکشن جوڑ دیا اور پھر بس۔ دراصل مشین کی چھری کو چلانے والی برقی لہر (کرنٹ) ہے نہ کہ ایک مسلمان کے ہاتھ کی قوت محرکہ اور یہ گلا کاٹنا مشین کا فعل ہے نہ کہ اس مسلمان کا۔"[1]

دوسری رائے کے مطابق جانور محض اس وجہ سے حرام نہیں ہوتا کہ اسے مشین سے ذبح کیا جا رہا ہے، کیونکہ مشین کو چلانے والا بھی تو بہر حال انسان ہی ہے۔ مفتی رشید احمد لکھتے ہیں:

> "اگر آگ جل رہی ہو اور کسی چیز مثلاً نلکی کے ذریعے وہ آگ مذبوح تک پہنچ جائے اور اس کی رگیں منقطع ہو کر خون بہہ جائے تو ایسا جانور حلال ہے، بالکل مشینی ذبیحہ کی یہی حالت ہے۔"[2]

اس مسئلے پر ہمیں مزید وضاحت اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے ساتویں سیمینار، منعقدہ ۱۹۹۵ء میں مولانا فہیم اختر ندوی کے مقالے "ذبیحہ کے شرعی احکام" میں ملتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

1۔ محمود، مفتی، فتویٰ بینات، مکتبہ بینات، کراچی، ج ۴، ص ۵۴۱

2۔ لدھیانوی، رشید احمد، مفتی، احسن الفتاویٰ، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ج ۷، ص ۴۷۳

> جانور کو بے ہوش کرنے اور اس کی موت سے قبل اگر کوئی مسلمان یا کتابی تسمیہ پڑھ کر اس کو ذبح کر دے تو یہ درست ہے۔ اگر انسان کی بجائے مشین جانور کو ذبح کرے اور انسان چھری کے بجائے مشین کا بٹن آن کرتے وقت بسم اللہ پڑھے، تو اس صورت میں بٹن چلانے والے انسان کی حیثیت ذابح کی ہے۔ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ ایک ہی مرتبہ بسم اللہ پڑھنا اور مشینی چھری چلانا بے شمار غیر معین جانوروں کے لیے کافی ہو گا یا نہیں۔ مشین کا ایک بار چلانا ایک عمل ہے یا متعدد۔ اگر مشین کا ایک مرتبہ چلانا ایک عمل ہے تو بسم اللہ بھی ایک ہی کافی ہے ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہو گا۔[1]

برصغیر کے نامور علما جن میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے مولانا قاضی ماجد الاسلام قاسمی، مولانا جلال الدین عمری، امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سیکرٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور مولانا رئیس الاحرار ندوی جامعہ سلفیہ بنارس کی رائے کے مطابق ایک بار مشین بند ہونے سے پہلے جو جانور ذبح ہو جائیں وہ سب حلال ہیں۔ جب مشین بند کر کے دوبارہ چلائی جائے تو بسم اللہ پڑھ کر چلائی جائے۔ اب یہ دوسرا عمل ہو گا۔ اس کے بعد جس قدر جانور ذبح ہوں گے وہ حلال ہوں گے۔"[2]

مشینی ذبیحہ سے کے جواز اور عدم جواز کے بارے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں مفتی نظام الدین اعظمی لکھتے ہیں کہ تیز دھار چیز (مشین) جو مرغیوں کی گردن کاٹتی ہے، وہ جس بٹن یا پرزہ کے دبانے سے چلتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان ذبح کرنے کی نیت سے ذبح کرنے کے

---

[1]۔ محمد فہیم اختر ندوی، مولانا، ذبیحہ کے شرعی احکام (تلخیص مقالات ساتواں سیمینار ۱۹۹۵ء، اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا)، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۰

[2]۔ مقبول احمد، حافظ، برصغیر میں بین الاقوامی اسلامی قانون کی تعبیرات: تحقیقی و تحلیلی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، مشینی ذبیحہ کا طریقہ کار اور اس کا حکم، ص ۲۷۳-۲۷۴

وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہتا ہوا وہ بٹن دبائے یا پرزہ چلائے اور اس دبانے، چلانے سے وہ دھار دار چیز (مشین) گردن کاٹے اور کٹنے میں ودجین (سانس کی نالی) اور حلقوم (غذا کی نلی) اور وصبۃ الریہ (سانس کی نلی) یہ سب کٹ کر پورا خون نکل جائے، اگرچہ یہ طریقہ خلافِ سنت ہونے سے مکروہ اور غلط ہوگا البتہ ذبیحہ حلال ہو جائے گا اور اس کا کھانا جائز رہے گا۔ اگر سب قیود میں سے کسی ایک قید کا بھی لحاظ کیے بغیر ذبح کر دیا جائے تو وہ ذبیحہ شرعیہ نہیں ہوگا اور حلال نہ ہوگا۔ ان سب قیود کا لحاظ کیے بغیر محض کسی مسلمان کا گردن کٹنے کے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہتے رہنا یا ٹیپ ریکارڈر سے بسم اللہ، اللہ اکبر کی آواز آتی رہنا کافی نہ ہوگا۔ خوب غور سے سمجھ لیا جائے۔ اسی طرح اگر ذبح کرنے اور خون نکلنے کے بعد شکم سے آلائش و غلاظت دور کیے اور نکالے بغیر کھولتے پانی میں ڈال دیا جائے گا تو غلاظت تمام گوشت پوست میں سرایت کر کے سب کو ناپاک بنا دے گی اور پھر کھانا ممنوع ہو جائے گا۔ اس لیے کھولتے ہوئے پانی میں ڈالنے سے قبل شکم چاک کر کے غلاظت سب نکال دی جائے، پھر اس کے بعد کھولتے پانی میں ڈالی جائے خواہ مشین ہی کے ذریعے سے شکم چاک ہوتا رہے اور آنتیں سب باہر نکل کر الگ ہوتی رہیں اور اس کے بعد کھولتے پانی میں پڑتی رہیں۔ جب بھی صحیح رہے گا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب"[1]

مفتی محمد نظام الدین اعظمی مفتی دار العلوم دیوبند (انڈیا) کے نزدیک حرج کو دور کرنے کے لیے مشینی ذبیحہ خلافِ سنت ہونے کے باوجود، ایک بار تسمیہ پڑھنے سے جائز ہو جاتا ہے۔[2]

مشینی ذبیحہ کے جواز کی صورتیں:

مشینی ذبیحہ کے جائز ہونے کے لیے درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

1۔ مفتی محمد نظام الدین اعظمی، منتخبات نظام الفتاویٰ، ایفاء پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ج۳، ص ۲۸۵

2۔ مفتی محمد نظام الدین اعظمی، منتخبات نظام الفتاویٰ، ج۳، ص ۲۶۳

۱۔ جدید آلات کے ذریعے ذبح کرنا جائز ہے بشرطیکہ یہ آلات تیز دھار والے ہوں اور حلق کیساتھ دیگر رگوں کو بھی کاٹ دیں۔

۲۔ اگر مشین ایک وقت میں متعدد مرغیاں ذبح کرے تو سب کے لیے ایک بار تسمیہ پڑھنا کافی ہو گا اور یہ مسلمان یا اہل کتاب، کوئی بھی کر سکتا ہے۔

۳۔ اگر مرغی کو ذبح کرنے والا شخص اپنے ہاتھ سے مرغیاں ذبح کر رہا ہے تو ہر مرغی پر الگ سے بسم اللہ پڑھنی ہو گی۔

۴۔ ذبح کرنے کی جگہ سے ذبح کرنا لازمی ہے، یعنی خوراک کی نالی سمیت خون کی دونوں یا کوئی ایک رگ لازمی کاٹی جائے۔[1]

عالمِ عرب کے معروف اسکالر ڈاکٹر سلیمان اشقر کہتے ہیں کہ بڑی تعداد میں شریعت کے مطابق ہاتھ سے جانور ذبح کرتے ہوئے ہر جانور پر تسمیہ پڑھنا ذبح کرنے والوں کے لیے شدید مشقت کا باعث ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو ایک گھنٹے میں ۱۲۰۰ مرغیاں ذبح کرنے کا حکم دیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے ہر تین سیکنڈ میں ایک مرغی ذبح کرنی ہو گی اور یوں اسے ایک گھنٹے میں ۱۲۰۰ مرتبہ بسم اللہ واللہ اکبر کہنا ہو گا۔ یہ عمل شدید مشقت اور تنگی کا باعث بن سکتا ہے، جبکہ شریعت نے تنگی اور مشقت کو کم کرنے اور آسانی پیدا کرنے کی تعلیم دی ہے۔" کیونکہ فرمانِ باری تعالی ہے: **وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ**[2] (اور تم پر دین میں کچھ تنگی نہ رکھی۔)

اسی وجہ سے کویت کے دارالافتاء نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ بڑی تعداد میں مرغیوں کو ذبح کرتے وقت صرف ابتدا میں تسمیہ پڑھا جائے، اور بغیر کسی وقفے کے ذبح کا عمل جاری رکھا

---

[1]. فتاوی اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والافتاء، ترتیب: احمد بن عبدالرزاق الدرویش، المکتبة العربیہ سعودیہ، ۲۰۰۵ء، ج۲۲، ص۴۶۳

[2]۔ سورۃ الحج ۷۸:۲۲

جائے تو ابتدائی پڑھی گئی تسمیہ ہی کافی ہو گی۔ تاہم، اگر دورانِ عمل کوئی وقفہ آجائے تو ذبح کرنے والا بقیہ مرغیوں کے لیے دوبارہ تسمیہ پڑھ لے۔[1]

بعض احباب اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسے معلوم ہو گا کہ کس جانور پر تکبیر پڑھی گئی؟ گزارش یہ ہے کہ شریعت نے شکار کی حالت میں، جہاں شکار کا تعین مشکل ہو، تعین کو لازمی قرار نہیں دیا۔ مثلاً، اگر شکاری تسمیہ پڑھ کر کسی خاص جانور کے شکار کی نیت کرے لیکن کوئی اور جانور شکار ہو جائے تو وہ بھی حلال ہو گا۔ لیکن اگر شکاری نے ایک تیر نکال کر اس پر تسمیہ پڑھی اور اسے رکھ کر دوسرا تیر نکال کر شکار کر لیا، لیکن تسمیہ نہیں پڑھی، تو اس کا شکار حلال نہیں ہو گا۔ اس طرح کی صورت حال میں شریعت رکاوٹ اور مشکلات کو دور رکھنے کی تعلیم دیتی ہے۔

درج بالا دلائل کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ ہاتھ سے ذبح کرنے کو ترجیح حاصل ہے اور مشینی ذبیحہ ایک رخصت اور خلافِ اولیٰ عمل ہے۔ تاہم، شرائط مکمل ہوں تو مشینی ذبیحہ حرام نہیں ہے۔ عمومی طور پر ہمارے ہاں ہر جانور پر تسمیہ پڑھنے کا مسئلہ زیرِ غور آتا ہے اور اصولی طور پر تسمیہ کسی معین جانور کو سامنے رکھ کر پڑھی جاتی ہے۔ لیکن جب ایک ہی وقت میں متعدد جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے خودکار آلات استعمال ہوں تو علمائے کرام ایسے آلات سے ذبح شدہ جانور کے حلال ہونے کا فتویٰ بھی دیتے ہیں۔ مزید برآں، بجلی کے جھٹکے سے مارا گیا جانور حرام ہے۔ مشینی ذبیحہ میں کم از کم تین رگوں کا کٹنا ضروری ہے۔ مشین کے ذریعے ذبح کرتے وقت ایک بار تسمیہ پڑھنا کافی ہے اور اگر مشین رک جائے تو دوبارہ چلانے سے پہلے تسمیہ پڑھنی ہو گی۔ مشین کے پاس تسمیہ پڑھنے سے جانور کی حلت و حرمت پر فرق نہیں پڑتا۔ مشین چلانے والا مسلمان یا اہلِ کتاب دونوں ہو سکتے ہیں۔

---

[1]۔ مجلة مجمع الفقه الإسلامي برابطه العالم الاسلامی، شماره نمبر: ۱۰ ج ا، ص ۳۴۶

ڈبہ پیک گوشت کا حکم:

مسلم اقلیات کے لئے غیر مسلم ممالک میں ڈبہ پیک گوشت اور مسلمان کی نظر سے اوجھل ہونے والے گوشت کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آتا ہے۔ مسئلہ ہذا کے بارے قدیم فقہا کا موقف اور دلائل ذکر کرنے کے بعد آخر میں ہم اپنا نقطہ نظر بیان کریں گے۔

فقہائے کرام کے نزدیک اگر دکاندار مسلمان ہو اور ذبح خانہ سے خود جا کر گوشت لاتا ہو یا خود ذبح کرتا ہو تو اس گوشت کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اگر وہ کسی اور کو بھیجتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ وہ شخص مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ اگر دکاندار کسی مسلمان کو گوشت لانے کے لیے بھیجتا ہے اور وہ صحیح جگہ سے گوشت لاتا ہے، تب بھی اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اگر وہ غیر مسلم سے گوشت منگواتا ہے، تو پھر دو صورتیں ہیں:

اولاً: وہ غیر مسلم اس کا ملازم ہے یا غیر ملازم: اگر وہ غیر مسلم اس کا ملازم نہ ہو تو مسلمان دکاندار سے بھی گوشت لینا شبہ سے خالی نہیں کیونکہ جو گوشت غیر مسلم کے ذریعے مارکیٹ میں آیا یا غیر مسلم کے ذریعے فراہم ہوا، اس کے ذبح شرعی ہونے میں شک ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس نے خود شرعی طریقے سے ذبح کیا ہے یا گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے۔ چونکہ جانور اصل میں حرام تھا، اس کے حلال ہونے کے لیے یقینی طور پر شرعی ذبح کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہاں ذبح شرعی کا یقین نہیں، اس لیے محض شبہ کی بنیاد پر حرام کو حلال قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فقہاء کا قاعدہ یہی ہے۔ اليقين لا يزول بالشك[1] "یقین شبہ سے ختم نہیں ہوتا۔" محقق ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الشاة فی حال حیاتها محرمة[2]

"بکری جب تک زندہ ہے حرام ہے۔"

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

---

[1] ۔ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم، الاشباہ والنظائر، دار الفکر بیروت، ج ۲، ص ۶۰

[2] ۔ابن نجیم، زین الدین بن ابراہیم الاشباہ والنظائر، ج ۲، ص ۶۳

فلا تحل حتی یعلم انہا مذکاۃ مسلم لان اصلہا حرام وشککنا فی الذکاۃ المبیحۃ[1]

"بکری حلال نہ ہو گی جب تک یقین سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ مسلمان کی ذبح کی ہوئی ہے کیونکہ بکری اصل میں حرام ہے اور ذبح شرعی جس سے یہ حلال ہو مشکوک ہے۔"

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ ماکول اللحم جانور بھی اصالۃً حرام ہوتے ہیں اور صرف ذبحِ شرعی کی وجہ سے حلال قرار پاتے ہیں، لہٰذا جب تک ان کے ذبحِ شرعی کا یقین نہ ہو، وہ حرام ہی مانے جائیں گے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ کافر و مشرک کے ذریعے حاصل کیا گیا گوشت، ذبحِ شرعی کے یقین سے خالی ہوتا ہے بلکہ اس کے بارے میں شک پایا جاتا ہے کہ ممکن ہے اس نے خود ہی ذبح کیا ہو یا گلا گھونٹ کر گوشت فراہم کیا ہو۔ اور بابِ حرمت میں شبہ بھی یقین کی مانند ہوتا ہے، اس لیے یہ گوشت حرام ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ اگر وہ غیر مسلم یہ کہے کہ یہ گوشت مسلمان کے ذبح کیے ہوئے جانور کا ہے، تب بھی اس کا اعتبار نہیں ہو گا، کیونکہ حلت و حرمت کا تعلق بابِ دیانات سے ہے اور بابِ دیانات میں کافر کی خبر بالاجماع ناقابلِ قبول ہے۔ خبر الکافر مقبول بالاجماع فی المعاملات لا فی الدیانات[2] "کافر کی خبر معاملات میں بالاجماع مقبول ہے اور دیانات میں غیر مقبول ہے۔"

من اشتری لحمًا فعلم أنہ من مجوسی وأراد الرد فقال: "ذبیحۃ مسلم"، یُکرہ أکلہ.[3]

"ایک شخص نے گوشت خریدا پھر اسے معلوم ہوا کہ بائع مجوسی ہے تو اسے اس نے واپس کرنا چاہا مجوسی نے کہا کہ ذبح تو اسے مسلمان نے کیا ہے پھر بھی اسے کھانا مکروہ تحریمی ہے۔"

1۔ ابن نجیم زین الدین بن ابراہیم، الاشباہ والنظائر، ج ۲، ص ۶۳

2۔ الحصکفی، محمد بن علی، الدر المختار، ص ۶۵۱

3۔ ابن عابدین شامی، محمد امین، حاشیہ رد المحتار علی الدر المختار، ج ۶، ص ۳۴۴

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محض اس بات سے کہ فروخت کنندہ مجوسی ہے، گوشت کا حرام ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب وہ گوشت کے حلال ہونے کی خبر دے رہا ہو اور یہ کہہ رہا ہو کہ اسے مسلمان نے ذبح کیا ہے، تب بھی اس گوشت کو کھانا مکروہ تحریمی ہو گا۔ تو ایسی صورت میں، جب وہ یہ خبر بھی نہ دے، گوشت کا کیا حال ہو گا؟

گوشت مسلمان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہونا شرطِ حلت ہے:

کافر سے ملنے والا گوشت اس حیثیت سے بھی حرام ہے کہ ذبح اضطراری، جس میں پابندی کم اور چھوٹ زیادہ ہوتا ہے، میں بھی اس شرط (نظر سے اوجھل نہ ہونا) کا لحاظ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ شکار کے حلال ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ تیر لگنے کے بعد وہ شکار شکاری کی نگاہ سے غائب نہ ہو یا پھر شکاری مسلسل اس کی تلاش میں لگا رہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عدی بن حاتم کو فرمایا:

وان وقعت صیدك فی الماء فلا تاكل فانك لا تدری ان الماء قتله ام سهمك[1]

"اگر شکار پانی میں گر جائے تو اسے مت کھانا کیونکہ تجھے معلوم نہیں کہ اسے پانی نے ہلاک کیا یا تمہارے تیر نے۔"

کره اكل الصيد اذا غاب عن الرامی وقال لعل هو ام الارض قتله[2]

جب شکار نگاہ سے چھپ جائے تو اس کا کھانا مکروہ ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اسے زیریلے کیڑے مکوڑوں نے ہلاک کر دیا ہو۔

تیر لگنے کے بعد شکار کا بھاگ جانا اور نگاہوں سے اوجھل ہو جانا ایک ناگزیر عمل ہے لیکن اس کے باوجود شکار کی حرمت صرف شک اور وہم کی بنیاد پر قرار دی جا رہی ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ ذبح اضطراری کا ہے، جس میں شریعت نے بڑی چھوٹ دی ہے۔ پس ذبح اختیاری میں تو یہ

1۔ بخاری محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الذبائح والتسمیۃ علی الصید، باب الصید اذا غاب عنہ، رقم: ۵۴۸۴

2۔ المرغینانی، برھان الدین ابو الحسین علی بن ابو بکر، ج ۴، ص ۵۱۲

حکم بدرجہ اولیٰ تسلیم کیا جائے گا کہ وہاں گوشت کا مسلمان کی نگرانی میں رہنا یا اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونا ضروری نہیں، بلکہ آسان ہے۔ اس لیے اگر یہاں وہ گوشت غیر مسلم کے ذریعے حاصل ہو تو اس کے ذبحِ شرعی میں وہم اور شک پیدا ہوگا، اور اسی بنیاد پر وہ گوشت حرام قرار پائے گا۔

ڈبہ پیک گوشت کے حلال ہونے کی صورت:

اگر ڈبے میں پیک شدہ گوشت اس طرح ملے کہ گوشت فروش مسلمان اسے خود مذبح سے لائے، کسی مسلمان کے ذریعے منگوائے، اپنے قابلِ اعتماد غیر مسلم ملازم سے منگوائے، یا کسی غیر مسلم سے مسلمان کی نگرانی میں منگوائے، تو یہ ذرائع بذاتِ خود حرمت کا سبب نہیں ہوں گے۔ مسلمان لائے یا مسلمان کی نگرانی میں غیر مسلم لائے تو گوشت کا حلال ہونا ظاہر ہے۔ اگر غیر مسلم ملازم لائے تو اس کے حلال ہونے کی صداقت کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

> "مسلمان اپنے کسی نوکر یا مزدور مشرک کو گوشت لینے بھیجے اور وہ خرید لائے اور کہے کہ میں نے مسلمان سے خریدا ہے تو اس کا کھانا جائز ہوگا جبکہ قلب میں اس کا صدق جمے۔ کیونکہ یہ اصالۃً معاملہ قولِ کافر کا قبول ہے، اگرچہ حکماً دیانت کو متضمن ہو جائے گا۔"[1]

قدیم فقہاء کی آراء اور دلائل کی روشنی میں خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ڈبہ پیک گوشت ان شرائط کے ساتھ حلال ہوگا:

۱۔ ڈبہ میں جو گوشت پیک ہے وہ حلال جانور کا ہو۔

۲۔ اس جانور کو مسلمان یا کتابی نے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا ہو اور بوقت ذبح تکبیر پڑھی ہو۔

۳۔ اگر کسی دوسرے سے ذبح کروایا جائے تو اس کا مسلمان یا کتابی ہونا یقینی ہو۔

---

[1]۔ اعلیٰ حضرت، احمد رضا بریلوی، فتاویٰ رضویہ، رضا فاونڈیشن، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور، ج ۲۰ ص ۲۸۳

۴۔مارکیٹ میں وہ گوشت مسلمان لایاہو یا اسکا معتمد ملازم یا مسلمان کی نگرانی میں لایا گیاہو۔
۵۔وہ گوشت مسلمان دکاندار سے خریدا جائے یا کم از کم یہ صورت ہو کہ وقت ذبح سے وقت خریداری تک وہ گوشت مسلسل مسلمان کی نگرانی میں رہاہو خواہ دکاندار جو بھی ہو۔

گوشت کا مسلمان کی نظر سے اوجھل ہو جانے کے بارے راقم کا نظریہ:

اگر کافر کے قول و عمل کوئی شک نہ ہو تو مسلمان کے لیے اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔ اصول یہ ہے کہ معاملات میں کافر کی خبر معتبر ہوتی ہے، اور گوشت کی خرید و فروخت بھی معاملات میں شامل ہے۔ جیسا کہ فقہی اصول ہے:۔ ان قوله شريعته من المعاملات[1]

اللہ پاک نے ارشاد فرمایا:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۗ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ[2]

(آج تمہارے واسطے سب پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور کتابیوں کا کھانا تمہیں حلال ہے اور تمہارا کھانا انہیں حلال ہے)

سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ[3]

(اے آدم کی اولاد اپنی زینت لو جب مسجد میں جاؤ اور کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ بڑھو بے شک حد سے بڑھنے والے اسے پسند نہیں۔)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[1]

---

[1] ابن عابدین شامی، محمد امین، حاشیہ رد المحتار علی الدر المختار، کتاب الحظر والاباحۃ، ج۵، ص۲۱۹

[2]۔سورۃ المائدہ ۵:۵

[3]۔سورۃ الاعراف ۷:۳۱

(اس نے یہی تم پر حرام کیے ہیں مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا تو جو ناچار ہو نہ یوں کہ خواہش سے کھائے اور نہ یوں کہ ضرورت سے آگے بڑھے تو اس پر گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔)

حدیث مبارکہ میں ہے:۔

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللَّهِ، حَدَّثَنَا أُسَامَةُ بْنُ حَفْصٍ الْمَدَنِيُّ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ. رضی الله عنها. أَنَّ قَوْمًا، قَالُوا لِلنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم إِنَّ قَوْمًا يَأْتُونَا بِاللَّحْمِ لاَ نَدْرِي أَذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ أَمْ لاَ فَقَالَ " سَمُّوا عَلَيْهِ أَنْتُمْ وَكُلُوهُ ". قَالَتْ وَكَانُوا حَدِيثِي عَهْدٍ بِالْكُفْرِ.[2]

"کچھ لوگوں نے نبی ﷺ سے عرض کیا بعض لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں (بیچنے کو) ہم نہیں جانتے کہ انہوں نے (ذبح کے وقت) بسم اللہ کہی ہے یا نہیں آپ نے فرمایا (کچھ) مضائقہ نہیں تم بسم اللہ پڑھ کر کھالو! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا یہ پوچھنے والے لوگ نو مسلم تھے۔"

شیخ الاسلام برہان الدین امام ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی (متوفی ۵۹۳ھ) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ہدایہ" میں لکھتے ہیں:

ومن أرسل أجيرًا له مجوسيًا أو خادمًا فاشترى لحمًا، فقال: اشتريته من يهودي أو نصراني أو مسلم، وسعه أكله، وإن كان غير ذلك لم يسعه أكله.[3]

---

[1] ۔سورۃ البقرۃ ۲:۱۷۲

[2] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الذبائح والصید والتسمیہ علی الصید، باب ذَبِیحہ الأَعْرَاب ونحرھم، رقم الحدیث: ۵۵۰۷

[3] ۔المرغینانی، برہان الدین، علی بن ابی بکر، ہدایۃ، ج ۴ ص ۴۳۷

"کسی نے مجوسی ملازم یا خادم کو گوشت لینے کیلئے بھیجا اس نے کہا کہ یہ گوشت یہودی سے یا نصرانی سے یا مسلمان سے خریدا تو مالک کیلئے کھانا جائز ہے۔"

اصول یہ ہے کہ کافر کا قول معاملات میں مقبول ہے۔ اس کے قول کے صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہے اور ایسے مذہب پر اعتقاد رکھتا ہے جس میں جھوٹ بولنا حرام ہے۔ کافر کے دین میں بھی جھوٹ بولنا حرام ہے اور معاملات کی کثرت کی وجہ سے اس کے قول کو قبول کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مہذب معاشروں میں جھوٹ کو بہت بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج کے دور میں کفار کے معاملات کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کے معاملات کی مثال دینے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ اگر گوشت کی خریداری کو ناجائز قرار دینا ہو تو سب سے پہلے ہمیں اپنے معاشرے میں غور کرنا چاہیے جہاں ایک کلمہ گو دوسرے کلمہ گو کو حلال کے نام پر گدھے اور کتے کا گوشت کھلا دیتا ہے۔

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا": کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ایک مسلمان نے گوسفند ذبح کیا اور اپنے غیر کتابی ملازم کے ہاتھ مکان بھیجا۔ وہاں موجود افراد سے کہا گیا کہ یہ ذبیحہ فلاں مسلمان شخص نے بھیجا ہے۔ کیا اس کا کھانا مسلمان کے لیے جائز ہو گا یا نہیں؟ آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"اگر قرائن کی رو سے اس کافر کے قول میں شک پیدا نہ ہو اور ظنِ غالب اس کے صدق کا ہو، تو مسلمان کے لیے اس ذبیحہ کے کھانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ہدیہ لانا از قبیلِ معاملات ہے اور معاملات میں کافر کا قول مقبول ہے۔ جب یہ مان لیا گیا کہ یہ ذبیحہ فلاں

مسلمان کا بھیجا ہوا ہے، تو اس کے ضمن میں حلت بھی مسلم ہو گئی۔ اگرچہ ابتداً حلت، حرمت، طہارت، نجاست اور دیگر امورِ خالصہ دینیہ میں کافر کا قول مقبول نہیں۔"[1]

ہم اسے معاملات ہی سمجھتے ہیں اور اس کی بابت تبیین الحقائق میں امام زیلعی لکھتے ہیں:

> "معاملات میں ہر باتمیز شخص کی بات مقبول ہے، چاہے وہ آزاد ہو یا غلام، مسلمان ہو یا کافر، بڑا ہو یا نابالغ، کیونکہ ضرورت عام ہے۔ انسانی معاملات میں یا خدمت لینے کے لیے یا کسی وکیل کے پاس بھیجنے کے لیے، شرائطِ عدالت پر پورا اترنے والے شخص کا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے، جبکہ سننے والے کے پاس خبر کے علاوہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہوتی جس پر عمل کیا جاسکے۔"[2]

جمعیتِ علمائے اورنگزیب عالمگیر نے کہا:

> "معاملات میں شخص کی بات قبول کی جائے گی، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، تاکہ حرج کو ختم کیا جاسکے۔ معاملات میں مضاربت، ہدیہ کا قاصد بنانا اور تجارت کی اجازت دینا بھی شامل ہے۔"[3]

مولانا محمد امجد علی اعظمی لکھتے ہیں:

> "اگر کسی نے اپنے نوکر یا غلام کو گوشت لانے کے لیے بھیجا، چاہے وہ مجوسی ہو یا ہندو، اور وہ گوشت لا کر کہے کہ میں نے یہ مسلمان یا کتابی سے خریدا ہے تو یہ گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ میں نے مشرک، مثلاً مجوسی یا ہندو سے خریدا ہے، تو اس گوشت کا کھانا حرام ہو گا۔ وجہ یہ ہے کہ خرید و فروخت معاملات میں شامل ہے اور

---

[1]۔ اعلیٰ حضرت، احمد رضا بریلوی، فتاویٰ رضویہ، ج ۲۰ ص ۲۸۶

[2]۔ زیلعی، عثمان بن علی، فخر الدین، تبیین الحقائق، المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ بولاق، مصر، ج ۶، ص ۱۲

[3]۔ جمعیت علما اورنگزیب عالمگیر، فتاویٰ ہندیہ، نورانی کتب خانہ، پشاور، کتاب الکراہیۃ، الباب الاول، الفصل الثانی

معاملات میں کافر کی خبر معتبر ہوتی ہے۔ اگرچہ حلت و حرمت، دیانات میں سے ہیں اور دیانات میں کافر کی خبر مقبول نہیں ہوتی مگر چونکہ یہاں اصل خبر خرید و فروخت کی ہے اور حلت و حرمت اس مقام پر ضمنی چیز ہے، لہٰذا جب اصل خبر معتبر قرار پائے گی تو ضمنی طور پر حلت بھی ثابت ہو جائے گی۔ البتہ اگر خبر کا تعلق براہِ راست حلت و حرمت سے ہو تو وہ غیر معتبر ہو گی۔ (ہدایہ، درمختار) معاملات میں کافر کی خبر اس وقت معتبر ہو گی جب غالب گمان یہ ہو کہ وہ سچ کہہ رہا ہے، لیکن اگر غالب گمان یہ ہو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کی خبر پر عمل نہیں کیا جائے گا۔"[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایسا گوشت جو مسلمان کی نظر سے اوجھل ہو جائے اور غالب گمان اس کی حلت کا اشارہ کرے، تو اس کا کھانا جائز ہے۔ اس لیے کہ ڈلیوری کرنے والا عموماً وہی شے ڈلیور کرتا ہے جو اسے دکاندار کی طرف سے موصول ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ گوشت کافر کے قبضے میں چلا گیا اور مسلمان کی نظر سے اوجھل ہو گیا لہٰذا اس کا کھانا جائز نہیں تو پھر اس میں گوشت کی تخصیص کیوں کی جائے؟ ادویات سے لے کر مشروبات و ماکولات تک، سب کچھ ان کے قبضے سے ہو کر آتا ہے۔ کیا وہ بھی ناجائز ہوں گی؟ پیزا سے لے کر پولیو کے قطرات تک، کیا وہ سب حرام ہوں گے؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ غیر مسلم کے قبضے میں جانے سے اشیاء اس وقت مشکوک ہوں گی جب غالب گمان اس کے صدق کی تصدیق نہ کرے۔ اگر کوئی کہے کہ فتاویٰ میں اجیر خاص کی بات کی گئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کلام کو ضائع کرنے والی بات ہے۔ آج کے دور میں اجیر خاص اور اجیر عام کے مباحث۔ فیاللعجب!

[1] ۔اعظمی، محمد امجد علی، مولانا، بہارِ شریعت، شبیر برادرز اردو بازار، لاہور، ج ۲، ص ۵۷۶

غیر مسلم کا پانی:

پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حلال اور پاک نعمت ہے، جس پر ہر جاندار کی حیات کا دار و مدار ہے۔ یہ نعمت سب کے لیے ہے۔ تکثیری معاشرے میں رہتے ہوئے بھی بہت سے لوگ انسانوں کے درمیان ذات پات، رنگ و نسل کی بنیاد پر فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر کوئی شخص، جسے وہ کم تر ذات سمجھتے ہیں، پانی کو ہاتھ لگا دے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس کا استعمال ان کے لیے ممنوع ہو جاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ پانی حقیقتاً پاک ہے اور کسی شخص کے ہاتھ لگانے سے ناپاک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اس میں کوئی نجاست، خواہ حقیقی ہو یا حکمی، شامل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کا پانی پیا بھی ہے اور عبادات تک کے لیے استعمال کیا ہے۔

حضرت عمران بن حصین بیان کرتے ہیں کہ رات میں ہم نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ صبح سب کی آنکھ لگ گئی۔ نماز قضا ہو گئی۔ فوراً بعد میں ادا کی گئی۔ ہمارے پاس پانی ختم ہو چکا تھا۔ شدید پیاس لگی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے کچھ سواروں کے ساتھ پانی کی تلاش کے لئے بھیجا۔ جب ہم نکلے تو دیکھا کہ ایک عورت پانی سے بھرے دو مشک اپنی اونٹنی پر لیے جا رہی ہے۔ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ پانی کہاں سے مل سکتا ہے؟ اس نے کہا قریب میں پانی نہیں ہے۔ میں اپنے قبیلہ سے ایک دن اور ایک رات کا فاصلہ طے کر کے پانی لا رہی ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک بیوہ عورت ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہم اسے لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ آپکے حکم پر اونٹنی کو بٹھایا گیا۔ آپ نے مشک پر دست مبارک رکھا۔ تھوڑا سا پانی لے کر اس پر کُلی کی۔ اس کے بعد آپکا یہ معجزہ دیکھنے میں آیا کہ ہم چالیس افراد تھے، ہم سب نے اس سے پانی پیا اور ہمارے پاس جو بڑے برتن تھے سب بھر لیے۔ ایک صاحب کو غسل کی حاجت تھی اس کو پانی دیا گیا۔ اس کے باوجود یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مشک اس قدر بھرے ہیں کہ پھٹے جا رہے ہیں۔ آپ نے اس عورت سے فرمایا:

دیکھو ہم نے تمہارا پانی کم نہیں کیا۔ پھر آپ کے حکم سے ہم نے بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے اور کھجوریں اسے دیں۔ آپ نے اس سے کہا جاؤ اپنے بچوں کو کھلاؤ! اس نے اپنے قبیلہ میں پہنچ کر پورا واقعہ سنایا تو سب لوگ اسلام لے آئے۔"[1]

امام بخاری فرماتے ہیں:

توضا عمر بالحمیم من بیت نصرانیة[2]

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانی عورت کے گھر سے گرم پانی لے کر وضو کیا۔"

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

فیه دلیل علی جواز استعمال میاہ اهل الکتاب من غیر استفصال و قال الشافعی فی الام لا باس بالوضوء من ماء المشرك[3]

"یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل کتاب کا پانی بغیر کسی تفصیل کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ امام شافعی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں مشرک کے پانی سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیر مسلم کے پانی سے وضو کرنا بالاتفاق، بغیر کراہت کے جائز ہے۔

غیر مسلم کے برتن:

جو برتن غیر مسلم کمپنیاں تیار کرتی ہیں ان کی خرید و فروخت اور استعمال میں حرج نہیں ہے۔ جو برتن غیر مسلم خود استعمال کرتے ہوں، ان کے بارے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کا استعمال جائز ہے یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو کس شرط کے ساتھ؟ اس سوال کا جواب ہمیں حدیثِ مصطفیٰ ﷺ سے ملتا ہے۔ حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے

1۔ النیسابوری، ابوالحسین مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوۃ، باب قضاء الصلوۃ الفائتة، رقم الحدیث: ۶۸۰

2۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، بخاری، صحیح بخاری، کتاب الوضو، باب وضو الرجل مع امراته، رقم الحدیث: ۱۹۳

3۔ عسقلانی، ابن حجر، حافظ احمد بن علی، فتح الباری، دار المعرفه، بیروت، لبنان، ج ۱، ص ۲۹۹

رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں اہل کتاب ہیں، کیا ہم ان کے برتن کھانے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

فان وجدتم غيرها فلا تأكلوا فيها، وان لم تجدوا فاغسلو ها وكلوا فيها ۔[1]

”اگر تمہیں ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن دستیاب ہوں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ! لیکن اگر دستیاب نہ ہوں تو انہیں دھولو پھر ان میں کھاؤ۔“

اسی طرح غیر مسلم مشرک کے برتن بھی استعمال کرنا جائز ہے۔ اس کا جواز بھی ثابت ہے۔ حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

أنا أهل سفر نمرّ باليهود والنصارى والمجوس، فلا نجد غير آنيتهم، قال: فإن لم تجدوا غيرها فاغسلوها بالماء ثم كلوا فيها واشربوا[2]

”ہم (ہمیشہ) سفر میں رہنے والے لوگ ہیں۔ ہمارا گزر یہود و نصاریٰ اور مجوس کے علاقوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا: اگر ان کے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن نہ ہوں تو تم انہیں پانی سے دھولو پھر ان میں کھاؤ اور پیو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب کے علاوہ جو غیر مسلم ہیں ان کے برتنوں میں بھی کھانا پینا جائز ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے برتن استعمال کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ دھونے کا ذکر کیوں فرمایا؟ اس کا جواب بھی حدیث مبارکہ میں ملتا ہے۔

---

[1] ۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، بخاری، صحیح بخاری، کتابالذبائح والصید والتسمیہ علی الصید، باب صید القوس، رقم: ۵۴۷۸

[2] ۔ ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع الترمذی، کتاب الصید، باب ماجاءمایوکل من صید الکلب، رقم الحدیث: ۱۴۶۵

انا مجاور لاھل الکتاب و ھم یطبخون فی قدورھم الخنزیر ویشربون فی اٰنیتھم الخمر[1]

''ہم اہل کتاب کے پڑوس میں رہتے ہیں اور وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے اور اپنے برتنوں میں شراب پیتے ہیں (کیا یہ برتن استعمال کر سکتے ہیں)۔ اس کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ان وجدتم غیرھا فکلوا فیھا و اشربوا وان لم تجدوا غیرھا فارحضوھا بالماء اگر تمہیں ان برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن دستیاب ہوں تو تم ان ہی میں کھاؤ اور پیو اور اگر دوسرے برتن نہ ہوں تو انہیں پانی سے دھو کر صاف کر لو۔''

واضح ہوا کہ یہ اہل کتاب اور غیر مسلموں کے ان برتنوں کا حکم ہے جنہیں وہ حرام اور ناپاک چیزوں کے پکانے اور کھانے پینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ جو برتن ان چیزوں کے لیے استعمال نہ ہوں، ان کے بارے یہ حکم نہیں ہوگا۔ یعنی اگر کوئی مسلمان غیر ملکی ایئر لائن میں سفر کرتا ہو یا یورپی ممالک کے کسی ہوٹل میں قیام پذیر ہو تو وہاں کے برتن، چمچ، پلیٹ وغیرہ استعمال کر سکتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اچھی طرح دھونے کے بعد ہر طرح کے برتن استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے تھے، مشرکین کے کھانے پینے کے جو برتن ہاتھ آتے، انہیں استعمال کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام نووی اپنی رائے دیتے ہیں کہ حضرت ابو ثعلبہ کی روایت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی اور برتن موجود ہو تو ان کو استعمال نہ کرو! یہ اس وقت ہوگا جب وہ ان برتنوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے ہوں یا شراب پیتے ہوں۔ ان کے علاوہ دیگر تمام برتن فقہاء کے نزدیک دھونے کے بعد پاک ہو جاتے ہیں۔ ان میں کوئی کراہت باقی نہیں رہتی۔

---

[1]۔ ابو داود، سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داود، کتاب الاطعمہ، باب فی استعمال آنیۃ، اھل الکتاب، رقم الحدیث: ۳۸۳۹

آدمی کے پاس دوسرے برتن ہوں تب بھی انہیں استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔[1]

علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کے برتن کو استعمال کرنے سے پہلے انہیں دھونے اور صاف کرنے کا حکم اس لیے ہے کہ وہ نجاسات سے نہیں بچتے، مردار کھاتے ہیں۔ دھونے اور صاف کرنے کے بعد ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔[2]

امام قرطبی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جو برتن وہ کھانے پینے کے علاوہ ضروریات کے لئے استعمال کرتے ہیں انہیں دھوئے بغیر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"[3]

علامہ عینی فرماتے ہیں:

> "اگر کسی غیر مسلم کے برتن سے طہارت حاصل کی جائے اور اس کا پاک اور ناپاک ہونا واضح نہ ہو تو دو صورتیں ہیں: اگر غیر مسلم کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہے جس کے نزدیک اس برتن کے ساتھ کوئی مذہبی جذبہ وابستہ نہیں ہے تو قطعی طور پر طہارت حاصل کی جائے گی اور اگر اس کا تعلق کسی ایسی قوم سے نہیں ہے پھر بھی صحیح قول کے مطابق طہارت حاصل ہو جائے گی۔ امام اوزاعی، امام ابو حنیفہ، امام شافعی، ان سب کا یہی مذہب ہے۔"[4]

---

[1]۔ نووی، محی الدین یحیی، ابوزکریا، شرح مسلم، ج۵، ص۷۹-۸۰

[2]۔ قرطبی، ابوعبداللہ محمد احمد انصاری، الجامع الاحکام القرآن، ج٦، ص۸۷

[3]۔ ایضاً، ج٦، ص۸۷

[4]۔ عینی، بدالدین، ابومحمد محمود بن احمد، عمدۃ القاری، ج۲، ص۳۹۱

خلاصہ کلام یہ ہے کہ غیر مسلموں کے برتن اور ان کی استعمال شدہ چیزیں استعمال کرنا جائز ہے جبکہ ان پر کوئی حقیقی نجاست موجود نہ ہو۔ غیر مسلموں کے جہازوں، ٹرینوں، بسوں اور ہوٹلوں میں مہیا کیے جانے والے برتن، چادریں اور شیٹس وغیرہ استعمال کرنا جائز ہے۔

ایک قبر میں متعدد مردوں کی تدفین:

ترقی یافتہ غیر مسلم ممالک میں عمومی طور پر قبر کی جگہ لیز پر حاصل کی جاتی ہے۔ قیمت بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی قبر میں کچھ وقت یا چند سالوں کے بعد دوسری میت کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے تدفین کے باب میں احترامِ میت اور انفرادیت کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور عام حالات میں ایک قبر میں ایک ہی میت کو دفن کرنا پسندیدہ قرار دیا ہے۔ یہ طریقہ اسلامی آداب کے مطابق اور میت کے حق میں زیادہ موزوں ہے۔ تاہم بعض مخصوص حالات میں شریعت نے ایک قبر میں ایک سے زیادہ افراد کی تدفین کی اجازت بھی دی ہے جو حکمت اور ضرورت پر مبنی ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ **جنگ یا قدرتی آفات کی حالت میں:** اگر جنگ، زلزلے یا کسی اور حادثے کے نتیجے میں بڑی تعداد میں اموات واقع ہوں اور علیحدہ علیحدہ قبریں تیار کرنا ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں شریعت نے ایک قبر میں ایک سے زائد افراد کو دفن کرنے کی گنجائش دی ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث نمبر 1343 میں حدیث ہے کہ نبی مکرم، شفیع معظم ﷺ نے احد کے شہداء کے بارے ارشاد فرمایا:

احْفِرُوا وَأَوْسِعُوا، وَادْفِنُوا الِاثْنَيْنِ وَالثَّلَاثَةَ فِي الْقَبْرِ الْوَاحِدِ، وَقَدِّمُوا أَكْثَرَهُمْ قُرْآنًا

"قبر کھودو اور وسیع کرو اور دو یا تین افراد کو ایک قبر میں دفن کردو، اور ان میں سے سب سے زیادہ قرآن جاننے والے کو آگے رکھو۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ضرورت کے وقت اجتماعی تدفین جائز ہے، لیکن ترتیب اور احترام کا خیال رکھا جائے۔

2۔ **ضرورت یا جگہ کی کمی:** اگر کسی علاقے میں قبرستان کی جگہ کم ہو یا وسائل کی قلت کی وجہ سے الگ الگ قبریں کھودنا ممکن نہ ہو، تو اس حالت میں بھی ایک قبر میں متعدد افراد کو دفن کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے درج ذیل اصولوں کا خیال رکھا جائے:

اگر دفن ہونے والوں میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں، تو مرد کو پہلے دفن کیا جائے اور عورت کو بعد میں، جبکہ ان کے درمیان مٹی یا کسی اور رکاوٹ کے ذریعے پردہ رکھا جائے۔ میتوں کی ترتیب اور احترام کا خاص خیال رکھا جائے۔

3۔ **ترجیحی ترتیب:** اگر ایک ہی قبر میں زیادہ افراد دفن کیے جا رہے ہوں، تو ان کی ترتیب کے لیے فضیلت اور تقویٰ کا معیار اپنایا جائے:

سب سے زیادہ نیک یا فضیلت والے فرد کو قبر میں پہلے رکھا جائے۔

باقی میتوں کو ترتیب وار دفن کیا جائے، جیسا کہ غزوہ احد کے موقع پر نبی مکرم ﷺ نے ہدایت دی تھی۔

خلاصہ

اقلیت ایک سیاسی اصطلاح ہے مراد وہ جماعت جو نسل، زبان، یا مذہب میں اکثریت سے مختلف نسبت رکھتی ہے جبکہ فقہ الاقلیات ایک جدید اصطلاح ہے جسکا مقصد اقلیات کے لیے ایسا حل تلاش کرنا ہے جو ان کے لیے مذہبی اعتبار سے قابل قبول ہو۔

ابتدائے اسلام میں مکۃ المکرمہ پھر حبشہ میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ مزید برآں تاریخ کے ہر دور میں تبلیغ اور تجارت کی غرض سے مسلمانوں نے غیر مسلم ممالک میں اقلیت کی حیثیت سے رہنا شروع کیا۔ فقہاء نے ہمیشہ مسلم اقلیات کے مسائل پر ضمنی حیثیت سے بحث کی۔

دنیا بھر میں بسنے والے مسلم اقلیات کے علاقائی تقاضوں کے مطابق کچھ معاملات ایک دوسرے سے جدا ہیں مگر زیادہ تر امور ان کے درمیان مشترک ہیں۔

عہد قدیم میں مسلم اقلیتوں کے مسائل زیادہ تر انفرادی تھے، ان مسائل کا حل فقہ الضرورت یا فقہ النوازل کے تحت کیا جاتا رہا۔ جبکہ آج کی مسلم اقلیات کے مسائل عمیق اور پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ یہ مسائل دینی تشخیص سے لے کر نئے ملک میں اسلام کے پیغام کی اشاعت، اکثریت کے ساتھ تعلقات کی نوعیت اور ملک کے جدید سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی امور سے متعلق ہیں۔ بدیں وجہ عصر حاضر میں مسلم اقلیات کے مسائل پر خصوصی توجہ دینے کا رجحان پایا جارہا ہے اور فقہ الاقلیات کے عنوان سے ایک لٹریچر وجود میں آرہا ہے۔ اس فقہ کی بنیاد فقہ کے دوسرے ابواب کی طرح قرآن کریم کی آیات، احادیث، اجماع اور اجتہاد پر ہے۔

اولاً تو فقہ الاقلیات کے موضوع پر کام کرنے والے علماء کی تعداد بہت کم ہے، ثانیاً ان کی آراء اور مشورے اس قدر متضاد ہیں کہ عام مسلمان سخت تشویش اور بے چینی کا شکار ہیں۔ اول الذکر کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم اقلیتوں کے مسائل اسی وقت حل ہو سکتے ہیں جب وہ اکثریت کے ساتھ قومی دھارے میں ضم

ہو جائیں، تعلیم، معیشت، معاشرت، اور سیاست کے تمام میدانوں میں پوری طرح حصہ لیں، اس مقصد کے حصول کے لئے اسلام کی ایسی تشریح کرنی چاہئے کہ جس سے ہمارے طرز عمل کی تائید ہو۔جبکہ ثانی الذکر علماء و مفتیانِ کرام مسلم اقلیات کے حالات کو ماضی کی مسلم اقلیات کے حالات پر قیاس کرتے ہیں۔ان کے فتاویٰ جات کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و معیشت، معاشرت و سیاست کے میدانوں میں مسلمانوں کا اندھا دھند داخل ہونا چنداں درست نہیں کیونکہ ان ممالک کے حالات مذہب دشمنی یا الحاد کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ہمیں قدیم و جدید علماء کی آراء اور فکر میں اخلاص ہی کی جھلک نظر آتی ہے۔ہماری رائے میں اقلیات کے مسائل کا حل ان حدود میں تلاش کرنا قطعاً غلط ہے جو ہمارے ماحول سے کلیتہ مختلف ہے۔ ہمیں علمائے متقدمین کی طرح براہِ راست قرآن کریم کا اطلاقی پہلو بیان کرتے ہوئے سنت نبوی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم متفقہ امور پر سختی سے قائم رہتے ہوئے دیگر مسائل میں فقہی ورثہ سے دستبردار ہوئے بغیر، تیسیر کے رجحان کے ساتھ اجتہاد سے کام لیں اور اللہ تعالی کے درج ذیل فرمان کو حرز جاں بنائیں:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ اَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَ ظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ

اللہ تمہیں ان لوگوں سے تعلق رکھنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے معاملے میں نہیں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا بلکہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور انصاف کا برتاؤ کرنے کا حکم دیتاہے۔بے شک انصاف والے اللہ کو محبوب ہیں۔

اللہ تمہیں انہی سے منع کرتا ہے جو تم سے دین میں لڑے یا
تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یا تمہارے نکالنے پر مدد کی
کہ ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی ستمگار
ہیں۔[1]

درج بالا آیت مبارکہ پر عمل کرنا مسلم اقلیت کے لیے خاص طور پر دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مددگار ثابت ہوگا اور دیگر اقوام کی ہدایت اور دین حق میں داخلے کے دروازے کھولے گا۔

[1]۔ سورۃ الممتحنہ:9،8

فہرست آیات قرآنیہ

33	إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا	سورۃ النساء۴:۱۰۳	171
34	وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا	سورۃ النساء۴:۱۴۱	213
35	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ	سورۃ النساء۴:۵۹	254
36	لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ	سورۃ النساء۱۴۸:۴	277
37	فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا	سورۃ النساء۴:۹۰	284
38	يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى	سورۃ النساء ۴:۴۳	303
39	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ	سورۃ المائدہ۵:۵۱	69
40	وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	سورۃ المائدہ۵:۴۲	85
41	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ	سورۃ المائدہ۵:۸	89
42	مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا	المائدہ۵:۳۲	103
43	مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا	سورۃ المائدہ۵:۳۲	279
44	يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ	سورۃ المآئدہ۵:۹۱۔۹۰	303
45	وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ	سورۃ المآئدہ۵:۲	305
46	حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ	سورۃ المائدہ۵:۳	340
47	اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	سورۃ المائدہ۵:۵	355
48	وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	سورۃ الانعام۶:۱۰۸	85
49	اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا	سورۃ الانعام۶:۱۵۲	87
50	فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ	سورۃ الانعام۶:۱۲۵	99
50	وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ	سورۃ الانعام۶:۱۵۱	279
51	فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ	سورۃ الانعام۶:۱۲۲	325
52	وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ	سورۃ انعام۶:۱۲۱	331
53	فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ	سورۃ انعام۶:۱۱۹	331
54	وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ	سورۃ انعام۶:۱۱۸	325
55	قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ	سورۃ الاعراف۷:۲۹	87
56	وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ	سورۃ الاعراف۷:۸۶	4
57	قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ	سورۃ الاعراف۷:۲۹	87
58	قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا	سورۃ الاعراف۷:۱۵۸	94
59	وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا	سورۃ الاعراف۷:۸۵	106
60	قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ	سورۃ الاعراف۷:۲۴	142
61	وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ	سورۃ الاعراف۷:۱۰	293
62	يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا	سورۃ الاعراف۷:۳۱	355
63	وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ	سورۃ الانفال۸:۲۶	4
64	وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ	سورۃ الانفال۸:۶۱	94
65	وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ	سورۃ الانفال۸:۶۲	94
66	وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	سورۃ الانفال۸:۶۲۔۶۱	131
67	وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا	سورۃ الانفال۸:۶۱	284
68	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ	سورۃ التوبہ۹:۲۴۔۲۳	68

69	وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ	سورۃالتوبہ ۹:۶	91
70	لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ	سورۃالتوبہ ۹:۱۲۸	95
71	يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ	سورۃالتوبہ ۹:۳۴	97
72	اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ	سورۃالتوبہ ۹:۱۱۱	125
73	اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا	سورۃالتوبہ ۹:۶۰	174
74	مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	سورۃالتوبہ ۹:۱۸۔۱۷	244
75	اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ	سورۃالتوبہ ۹:۱۸	281
76	وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ	سورۃالھود ۶:۱۱	174
77	قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ	سورۃیوسف ۱۲:۵۶۔۵۵	75
78	قال اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ۔اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ	سورۃیوسف ۱۲:۵۵	274
79	قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم	سورۃیوسف ۱۲:۵۵	298
80	فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ	سورۃالرعد ۱۳:۴۰	93
81	وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ	سورۃالرعد ۱۳:۷	85
82	وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ۔اِمَّا يَبْلُغَنَّ	سورۃبنی اسرائیل ۱۷:۲۴۔۲۳	49
83	وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ	سورۃالاسرائیل ۱۷:۷۰	102
84	قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا	سورۃطہٰ ۲۰:۱۲۳	142
85	وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا	سورۃطٰہٰ ۲۰:۱۲۴	294
86	اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ۔وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ	سورۃالحج ۲۲:۴۱	79
87	وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ	سورۃالحج ۲۲:۴۰	287
88	وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ	سورۃالحج ۲۲:۵	311
89	فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ	سورۃالحج ۲۲:۵	312
90	وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ	سورۃالحج ۲۲:۲۸	331
91	وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ	سورۃالحج ۲۲:۳۴	331
92	وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا	سورۃالحج ۲۲:۳۶	331
93	وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ	سورۃالحج ۲۲:۷۸	349
94	وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	سورۃالانبیاء ۲۱:۱۷	115
95	وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ	سورۃالنور ۳۳:۲۴	62
96	وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآىِٕكُمْ ؕ۔	سورۃالنور ۲۴:۳۲	212
97	كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ	سورۃ الشعراء ۲۶:۱۰۶۔۱۰۵	106
98	كَذَّبَتْ عَادُ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ	سورۃالشعراء ۲۶:۱۲۴۔۱۲۳	106
99	كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ	سورۃالشعراء ۲۶:۱۴۲۔۱۴۱	106
100	كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ۔الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ	سورۃالشعراء ۲۶:۱۶۱۔۱۶۲	106
101	كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ	سورۃالشعراء ۲۶:۱۷۶۔۱۷۷	107
102	وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ	سورۃالنمل ۲۷:۳۵	108
103	اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ	سورۃالقصص ۲۸:۷۷	84
104	وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا	سورۃالقصص ۲۸:۸۵	293

105	وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۔فَلَا تُطِعْهُمَا	سورۃ القمان ۱۵:۳۱	258
106	لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	سورۃ الاحزاب ۲۱:۳۳	12
107	يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ	سورۃ الاحزاب ۵۹:۳۳	38
108	وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ	سورۃ الاحزاب ۵۳:۳۳	45
109	وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ	سورۃ یٰسین ۴۷:۳۶	97
110	وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ	سورۃ الروم ۳۰:۳۹	311
111	ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ	سورۃ الروم ۳۰:۴۱	93
112	نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	سورۃ الزخرف ۲۳:۴۳	293
113	اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	سورۃ محمد ۱:۴۷	284
114	وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا	سورۃ الذاریات ۱۹:۵۱	173
115	قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ	سورۃ الممتحنہ ۴:۶۰	122
116	لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ	سورۃ الممتحنہ ۸_۹:۶۰	80
117	لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ	سورۃ الممتحنہ ۱۰:۶۰	216
118	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ	سورۃ المنافقون ۹:۶۳	268
119	هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا	سورۃ الملک ۱۵:۶۷	295
120	لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ	سورۃ الغاشیہ ۲۲:۸۸	93
121	كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ	سورۃ الفجر ۱۷_۲۰:۸۹	96
122	فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعٰمٌ	سورۃ البلد ۱۱_۱۸:۹۰	98
123	لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ	سورۃ التین ۴:۹۵	103
124	فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ	سورۃ الماعون ۴_۵:۱۰۷	164

فہرست احادیثِ مبارکہ

۳۷۔	الظہر والعصر جمیعاً والمغرب والعشاء جمیعاً فی غیر خوف ولا سفر	صحیح مسلم	172
۳۸۔	عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ	صحیح مسلم	256
۳۹۔	فَأَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُودُهُ، فَقَعَدَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَقَالَ: أَسْلِمْ	صحیح بخاری	113
۴۰۔	فَاخْتَلَطَ الرِّجَالُ مَعَ النِّسَاءِ فِي الطَّرِيقِ	سنن ابوداؤد	46
۴۱۔	فان وجدتم غیرها فلا تأکلوا فیها، وان لم تجدوا فاغسلوها	صحیح بخاری	362
۴۲۔	فرحض فی کلب الصید وفی کلب الغنم	سنن ابوداؤد	242
۴۳۔	قدمت علی امی وھی مشرکة، فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم،	صحیح المسلم	116
۴۴۔	قلنا: یارسول الله! وما لبثه فی الأرض؟ قال أربعون یوماً	صحیح مسلم	165
۴۵۔	كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ	صحیح مسلم	304
۴۶۔	کانت دیة الیهودی والنصرانی فی زمن النبی مثل دیة المسلم	نیل الاوطار	7
۴۷۔	لا تبدءوا الیهود والنصاری بالسلام	صحیح مسلم	122
۴۸۔	لا تساکنوا المشرکین ولا تجامعوهم فمن ساکنهم	سنن ترمذی	141
۴۹۔	لَا تَقَاطَعُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَلَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحَاسَدُوا	صحیح مسلم	83
۵۰۔	لا هجرة بعد الفتح ولکن جهاد ونیة	صحیح بخاری	135
۵۱۔	لا یحل لامری یومن بالله والیوم الاخران یسقی مآء ه زرع غیره	سنن ابوداؤد	205
۵۲۔	لا یکون متعة الا بامرین باجل مسمی وباجر مسمی	تہذیب الاحکام	61
۵۳۔	ما ارادلهذه القسمة وجه الله	صحیح بخاری	99
۵۴۔	مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمة	صحیح بخاری	76
۵۵۔	من اتخذ کلبا الا کلب ماشیة او صیدا او زرع انتقص من اجره کل یوم	سنن ابوداؤد	241
۵۶۔	مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ يَعْصِنِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ	صحیح مسلم	256
۵۷۔	من تشبه بقوم فهو منهم	سنن ابوداؤد	233
۵۸۔	من طلب الدنیا حلالا استعفافا عن السئوال	المصنف	146
۵۹۔	من قتل معاهدا ألم یرح رائحة الجنه	صحیح بخاری	7
۶۰۔	من قتل معاهدا ألم یرح رائحة الجنه	صحیح بخاری	91
۶۱۔	من کان یومن بالله والیوم الاخر فلیقل خیر	صحیح مسلم	101
۶۲۔	من کان يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فلا يَسْقِيَ مَاءَهُ وَلَدَ غَيْرِهِ	سنن ترمذی	205
۶۳۔	نعم الادام الخل	صحیح مسلم	160
۶۴۔	نهی عن النخع یقول یقطع	صحیح بخاری	343
۶۵۔	هدی کسری لرسول الله ﷺ فقبل منه	المسند	110
۶۶۔	وجاز عیادتة ای عیادة مسلم ذمیا لو نصرانیا اویهودیا	الترمذی	114
۶۷۔	والله مامست یده ید امراة قط فی المبایعة	صحیح بخاری	240
۶۸۔	وان وقعت صیدك فی الماء فلا تاکل فانك لا تدری ان الماء	صحیح بخاری	353
۶۹۔	وتوضا عمر بالحمیم من بیت نصرانیة	صحیح بخاری	361
۷۰۔	وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم	تبیان الفرقان	327
۷۱۔	وقال ابن عباس رضی الله عنهما طعامهم ذبائحهم	صحیح بخاری	326

فہرست مصادر و مراجع

1. القرآن الکریم
2. آکسفرڈ انگلش ڈکشنری، آکسفرڈ، ۱۹۷۸ء
3. آلوسی، شھاب الدین، محمود بن عبد اللہ، روح المعانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۶
4. ابن حاتم، عبد الرحمٰن بن محمد بن ادریس، تفسیر القرآن العظیم، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۴۷ھ
5. ابن ابی شبہ، ابو بکر عبد اللہ بن محمد، المصنف، مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۰ھ
6. ابن العربی، ابو بکر محمد بن عبد اللہ، احکام القرآن، دار الکتاب العربی، بیروت، ۲۰۱۲ء
7. ابن بیۃ، عبد اللہ بن الشیخ المحفوظ، صناعۃ الفتویٰ، دار المنہاج، جدہ، الطبعۃ الاولی، ۲۰۰۷ء
8. ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم، مجموع الفتاویٰ، مجمع الملک فھد، المدینۃ المنورہ، ۲۰۰۴ء
9. ابن حبان، امام ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد، صحیح ابن حبان، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۳ء
10. ابن حزم، علی بن احمد حنبلی، المحلی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۲ھ
11. ابن عابدین، محمد بن امین شامی، در مختار دار احیاء، التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۴
12. ابن عادل، ابو حفص عمر بن علی، اللباب فی علوم الکتاب، دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان، ۱۹۹۸ء
13. ابن قدامہ، عبد اللہ بن احمد مقدسی، المغنی، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۲۰۰۶
14. ابن قیم، محمد بن ابو بکر، احکام اھل الذمۃ، دار ابن حزم، بیروت، لبنان، ۱۹۹۷ء
15. ابن کثیر، حافظ اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۹ھ
16. ابن منظور، علامہ، لسان العرب، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ-۲۰۱۰م
17. ابن نجیم، زین الدین بن ابراھیم محمد، الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۲۰۱۶
18. ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، ابن ہشام، الیسوۃ النبویۃ مصطفیٰ، مصر، ۲۰۰۳
19. ابن ہمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد، شرح فتح القدیر، دار الفکر، بیروت، لبنان، ۲۰۱۸
20. ابو الحیان اندلسی، محمد بن یوسف، البحر المحیط، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ
21. ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داؤد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۸ء
22. ابو زہرہ، محمد، العلاقات الدولیہ فی الاسلام، دار الفکر العربی، مصر، س ن

23. ابو عبید القاسم بن سلام، کتاب الاموال، دار الفکر بیروت، ۲۰۱۵

24. ابو یعلی، محمد بن حسن، المعتمد فی اصول الدین، دار المشرق، بیروت، لبنان، ۲۰۰۸

25. احمد بن حنبل، امام، المسند، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ

26. احمد رضا خان، بریلوی، مولانا، فتاوی رضویہ، رضا فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۱

27. احمد عطیۃ اللہ، القاموس السیاسی، دار النھضۃ العربیۃ، القاھرۃ، ۱۹۶۸ء

28. اصفہانی، علامہ راغب، مفردات القران، دار القلم، دمشق، ۲۰۱۴

29. اصلاحی، امین احسن، مولانا، اسلامی ریاست، دار التذکیر، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۶ء

30. اعظمی، محمد امجد علی، مولانا، بہارِ شریعت، شبیر برادرز اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء

31. اکرم، محمد، شیخ، آب کوثر، ادارہ ثقافت اسلامی، لاہور، جون، ۲۰۰۲ء

32. البجیرمی، سلیمان بن محمد، حاشیۃ البجیرمی علی الخطیب، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۶ء

33. بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، دار صادر، بیروت

34. بدر الدین محمد بن عبد اللہ الزرکشی، المنثور فی القواعد الفقہیہ، وزارۃ الاوقاف الکویتیۃ، ۱۹۹۹

35. بلاذری، احمد بن یحیٰ بن جابر البغدادی، فتوح البلدان، الموسوعات، مصر، ۱۹۰۱ء

36. البوطی، ڈاکٹر محمد سعید رمضان، فقہ السیرۃ النبویۃ، نشریات، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۷ء

37. البیہقی، احمد بن الحسین، السنن الکبریٰ، نشر السنۃ، ملتان، س ن

38. بیہقی، عبد اللہ بن حسین، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۷

39. بھٹی، محمد اسحق، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء

40. پرویز، غلام احمد، مطالب الفرقان، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۳ء

41. پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکشنز، لاہور، ۱۴۰۳ء

42. ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، ترمذی، دار الفکر، بیروت، ۲۰۰۸ء

43. مفتی، تقی عثمانی، فتاویٰ عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۱۴۳۸ھ

44. جابر ابراہیم، ازدی، شرح احکام الجنسیۃ، دار مجد، ۱۹۹۳ء

45. جرجانی، علامہ علی بن محمد اسید شریف، التعریفات، دار الفضیلۃ، القاھرہ، ۱۹۸۳

46. جریدۃ الحیاۃ ومجلۃ العالم، ۱۹۹۰ء

47. جریدۃ اللواء النبانیۃ، ۱۹۸۹ء

48. الجصاص، ابو بکر احمد بن علی، الرازی، احکام القرآن، دار الفکر، بیروت، ۱۴۳۲ھ

49. جلال الدین قادری، مولانا، محمد، احکام القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

50. حسن بن عمار، نور الایضاح مع مراقیالفلاح، مصری مکتبہ، مدینہ، کراچی، ۲۰۱۱ء

51. الحصکفی، محمد بن علی، الدر المختار، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۲

52. خالد سیف اللہ رحمانی، غیر مسلم ممالک میں عدالتوں کی طلاق، ایفاء، پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

53. خطاب المغربی، ابو عبد اللہ محمد بن محمد، مواھب الجلیل، دار عالم الکتب، بیروت، ۲۰۱۰

54. الخطابی، ابو سلیمان محمد بن محمد، معالم السنن، دار الحرمین، القاہرہ، ۲۰۰۰

55. دار قطنی، علی بن عمر، سنن دار قطنی، دار لکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۷ھ

56. ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران، ۲۰۰۵ء

57. عطیہ عدنان، ڈاکٹر، الاحکام الشرعیہ للنوازل، بیروت، ۲۰۰۱۲

58. فضل الرحمٰن، ڈاکٹر، تحقیق ربوا، فکر و نظر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۶۳ء

59. ڈاکٹر ساجد شہباز خان، غیر مسلموں سے مشابہت اور تعلقات کے ضمن میں مسلم اقلیات کے مسائل، در مشمولہ، اجتہاد، اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، ۲۰۱۹

60. الذھبی، شمس الدین، محمد بن احمد، سیر اعلام النبلاء، بیت الافکار الدولیۃ، لبنان، ۲۰۰۴

61. رازی، محمد بن عمر، فخر الدین، التفسیر الکبیر، مکتبہ علوم اسلامیہ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۷

62. راغب علی بیروتی، الثقافۃ، مکتبہ اصلیۃ، بیروت، ۲۰۱۳

63. رشید رضا، الفتاویٰ، الطبعۃ الاولی، دار الکتب الجدید، بیروت، ۱۹۷۰ء

64. الزحیلی، وہبہ، الدکتور، آثار الحرب فی فقہ الاسلامی، دار الفکر، دمشق، ۱۹۹۷ء

65. الزحیلی، وہبہ، الدکتور، التفسیر المنیر، امیر حمزہ کتب خانہ، کوئٹہ، ۲۰۰۱

66. زمخشری، ابو القاسم، محمد بن عمر، الکشاف، دار احیاء التراث، بیروت، لبنان، ۲۰۱۵

67. زیلعی، عبد اللہ بن یوسف، نصب الرایہ لاحادیث الھدایہ، موسسۃ الریان، بیروت، ۱۹۹۷ء

68. زیلعی، عثمان بن علی، فخر الدین، تبیین الحقائق، المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ بولاق، مصر، ۲۰۱۱

69. السایس، محمد علی، السبکی، تفسیر آیات الاحکام، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۲۸

70. سرخسی، شمس الدین محمد بن احمد، المسبوط، دار المعرفہ، بیروت، ۲۰۰۷

71. سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان الفرقان، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
72. سعیدی، علامہ غلام رسول، تبیان القرآن، فرید بک سٹال، لاہور، ۲۰۱۳ء
73. سید مودودی، ابو الاعلیٰ، تفہیمات، اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۱۳
74. الشافعی، محمد ادریس، کتاب الام، مکتبہ امیریہ، قاہرہ، ۱۹۷۲ء
75. شامی، محمد امین بن عمر، رد المختار علی الدر المختار، دار عالم الکتب، الریاض، ۲۰۰۳ء
76. شبلی نعمانی، علامہ، سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۲ء
77. الشرنبلالی، حسن بن عمار بن علی، نورُ الایضاح، المدینہ العلمیہ، کراچی، الطبعۃ الاولی، ۲۰۱۱ء
78. شکیل اوج، محمد، ڈاکٹر، نسائیات، کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی، ۲۰۱۲ء
79. شہابی، فیض احمد، مسلم دنیا۱۹۹۷تا۲۰۰۲، ادارۃ معارف اسلامی، لاہور، جنوری ۲۰۰۴ء
80. الشوکانی، محمد بن علی، نیل الاوطار، شرح منتقی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۷ء
81. صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور، جون ۲۰۰۴ء
82. طاہر القادری، محمد، ڈاکٹر، اقتصادیاتِ اسلام، منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۷ء
83. طبرانی، امام ابو القاسم، سلیمان بن احمد، المعجم الکبیر، دار حیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ
84. الطبرانی، سلیمان بن احمد، ابو القاسم، المعجم الکبیر، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۷
85. طبری، محمد بن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دار عالم الکتب، ریاض، ۱۴۳۴ء
86. طحاوی، ابو جعفر احمد بن محمد الازدی، احکام القرآن الکریم، النوریہ رضویہ، پبلشنگ کمپنی، ۲۰۱۴ء
87. طوسی، ابو جعفر محمد بن حسن، تہذیب الاحکام، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳۶۵ھ
88. عبد الماجد دریا آبادی، مولانا، تفسیر ماجدی، پاک کمپنی، لاہور، ۱۹۹۵
89. عسقلانی، احمد بن علی ابن حجر، فتح الباری، شرح صحیح بخاری، دار الاسلام الریاض، ۲۰۰۰ء
90. العمری، احمد سویلم، معجم العلوم السیاسیۃ المیسر، القاہرۃ: الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب
91. عینی، بدالدین، ابو محمد محمود بن احمد، عمدۃ القاری، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ
92. غازی، ڈاکٹر محمود احمد، خطباتِ بہاول پور، شریعہ اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
93. جوینی، عبد الملک، امام الحرمین، غیاث الامم فی التیاث الظلم، المکتبۃ العصریہ، بیروت
94. غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ اہم مسائل، ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی، جنوری ۲۰۱۰

95. غیر مسلم ممالک میں عورتوں کی طلاق، مجموعہ مقالات، انیسواں سیمنار، ۲۰۲۰، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، ایفاء پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

96. فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء، ترتیب: احمد بن عبد الرزاق الدرویش، المکتبۃ العربیہ، سعودیہ، ۲۰۰۵ء

97. فتح البیان فی مقاصد القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۰ء

98. فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ، المیزان وناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۸ء

99. فقہی کانفرنس شمالی امریکہ کے فیصلے، مجلہ بحث ونظر، دہلی، ۲۰۰۰ء

100. فیروزالدین، مولوی، فیروزاللغات، کراچی: فیروز سنز، راولپنڈی، ۲۰۱۰

101. فیوسی، احمد بن محمد المصباح، المنیر، المکتبۃ العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۱

102. قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

103. قدوائی، ڈاکٹر محمد ھاشم، مبادی سیاسیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا، ۲۰۱۵

104. القرضاوی، ڈاکٹر یوسف، فقہ الاقلیات المسلمہ، دار الشروق، القاہرہ، ۱۴۲۲ھ

105. قرطبی، ابوعبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۶

106. الکاسانی، علاء الدین ابو بکر کاسانی، بدائع الصنائع، دار الکتب العربی، بیروت، ۱۹۸۲ء

107. کلینی، ابوجعفر محمد بن یعقوب، اصول الکافی، دار الکتب الاسلامیہ، تہران ۱۳۶۲ھ

108. الکیاالہراسی، عماد الدین بن محمد طبری، احکام القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۳۴ھ

109. لجنۃ علماء الہند، الفتاوی الھندیہ، مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ، ۱۳۱۰ھ

110. لدھیانوی، رشید احمد، مفتی، احسن الفتاویٰ، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۲۰۱۳

111. لوبس معلوف، المنجد، مطبعہ کاثولیکیہ، مصر، ۱۹۴۷ء

112. ماتریدی، ابومنصور محمد بن محمد، تاویلات اہل السنۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۶ھ

113. الماوری، علی بن محمد، الاحکام السلطانیہ، مکتبہ دار ابن قتیبہ، الکویت، ۲۰۱۴

114. الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد، تفسیر الماوردی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۸

115. المبسوط للسرخسی

116. المثنی التمیمی، امام احمد بن علی، مسند ابویعلی، دار المامون، بیروت،

117. مجلۃ مجمع الفقہ الإسلامی برابطہ العالم الاسلامی، ۲۰۱۷

118. محمد الجوزی، ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی، زاد المسیر، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۳۱ھ
119. محمد سعود عالم قاسمی، غیر مسلم معاشرے میں مسلمانوں کے فقہی مسائل، اجتماعی اجتہاد، تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، ادارہ تحقیقات اسلامیہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
120. محمد فہیم اختر ندوی، مولانا، ذبیحہ کے شرعی احکام (تلخیص مقالات ساتواں سیمینار ۱۹۹۵ء، اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا)، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۰
121. محمد کمال، فہمی، اصول القانون الدولی الخاص، موسسۃ الثقافۃ، الجامعۃ الاسکندریۃ، ۱۹۹۲ء
122. محمد نجات اللہ صدیقی، مقاصد شریعہ، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۰
123. محمود، مفتی، فتویٰ بینات، مکتبہ بینات، کراچی، ۲۰۰۳
124. المرغینانی، علی بن ابی بکر الفرغانی، برہان الدین، الھدایۃ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن
125. المرغینانی، برھان الدین ابوالحسن علی بن ابو بکر، الھدایۃ، مکتبہ رحمانیہ در دو بازار لاہور، ۲۰۱۷
126. مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۸
127. مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، تحقیق محمد فواد عبد الباقی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۷۱ء
128. المعجم الوسیط، دارالدعوۃ، قاہرہ، س ن
129. مفتی احمد یار خان نعیمی، تفسیر نعیمی، نعیمی کتب خانہ لاہور، ۲۰۰۹
130. مفتی عابد الرحمٰن بجنوری، اہل کتاب سے متعلق مسائل واحکام، اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا، ۲۰۱۷ء
131. مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، ۲۰۱۲ء
132. مفتی محمد نظام الدین اعظمی، منتخبات نظام الفتاویٰ، ایفاء پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
133. مفتی منیب الرحمٰن، تفہیم المسائل، ضیاء القرآن، لاہور، ۲۰۱۵ء
134. مقبول احمد، حافظ، برصغیر میں بین الاقوامی اسلامی قانون کی تعبیرات: تحقیقی و تحلیلی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی علومِ اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
135. ملا محمد جیون، تفسیراتِ احمدیہ، ضیاء القرآن پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء
136. ملا نظام الدین الفتاوی، الھندیہ، المطبعۃ الکبریٰ، الامیریہ، ۲۰۱۸
137. ملا علی قاری، مرقاۃ المناجیح، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۲۰۱۲
138. منیب الرحمٰن، مفتی، زاویہ، کالم: مفادات کا کھیل، روزنامہ دنیا، ۲۰۲۰ء

139. مودودی، سید ابو الاعلیٰ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء
140. موسوعہ فقہیہ، مطبوعہ کویت، ۱۵/ ۱۲۲-۱۷۰
141. مولانا اقبال احمد قاسمی، اہلِ کتاب سے متعلق مسائل و احکام، اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا، ۲۰۱۷ء
142. ندوی، سید ابو الحسن علی ، اسلامی تہذیب و ثقافت، دعوہ اکیڈمی، اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء
143. ندوی، سید ابو الحسن علی، عرب و ہند کے تعلقات، مشعل بکس، پاکستان، ۲۰۰۴ء
144. نسائی، عبد الرحمٰن احمد بن شعیب، سنن النسائی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۱
145. نوائے وقت، ۱۹۹۷ء
146. نووی، محی الدین یحییٰ بن شرف، شرح مسلم، مصطفیٰ البابی واولادہ، مصر، ۲۰۱۴
147. نیشابوری، نظام الدین حسن بن محمد، تفسیر غرائب القرآن، مطبعۃ الکبریٰ، ۱۴۱۶ھ
148. الھیثمی، حافظ نور الدین، مجمع الزوائد، دار الکتب العربیہ، بیروت، ۱۴۰۴ھ
149. www.bbc.com/urdu/science-۴۸۰۶۷۲۰۲
150. ww.bbc.com/urdu/regional-۴۹۲۰۸۷۲۸
151. Charles Gray Shaw, Trends of civilization and culture, American book,۱۹۳۲
152. Charles Gray Shaw, Trends of civilization and culture,American Book Company, New York, ۱۹۳۲
153. David Marquand, Ronald L. Nettler, Religion and Democracy, Blackwell Publishers, ۱۰۸-Cowley Road, Oxford, ۲۰۰۰
154. www.en.wikipedia.org/wiki/Minority group
155. edition.cnn.com/interactive/۲۰۱۷/۰۹/world/myanmar-rohingya-refugee-stories
156. ww.indiaonlinepages.com/muslim-population-in-india

157. Kitabistan New Millennium Dictionary, B.A.Qureshi,Kitabistan Publishing co

158. Majid Khaduri, war and peace in the law of islam,boltimore: john hopkings, ۱۹۵۵

159. M.Z.Sadiqui,international Islamic colloquium papers,Lahore,۱۹۵٦

160. www.oxfordlearnersdictionaries.com/definition/american_english/minority

161. www.pewforum.org/۲۰۰۹/۱۰/۰۷/mapping-the-global-muslim-population

162. www.prb.org/muslim-population-growth

163. www.worldpopulationreview.com/country-rankings/muslim-population-by-country

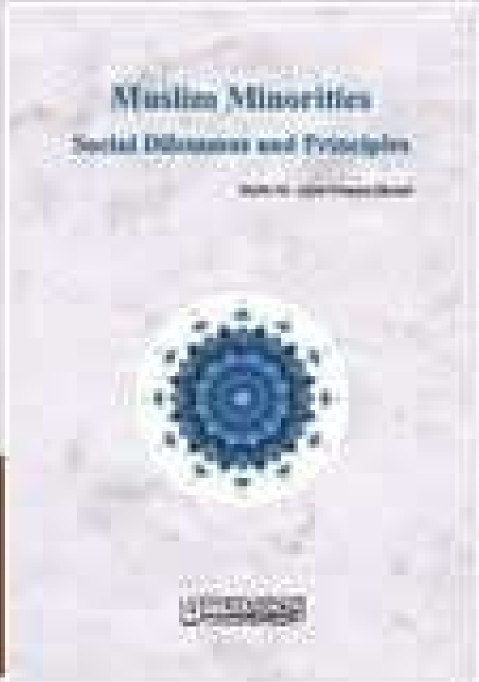
164. en.wikipedia.org/wiki/Surrogacy

165. www.webmd.com/infertility-and-reproduction/qa/who-uses-surrogates

166. surrogate.com/about-surrogacy/types-of-surrogacy/what-is-gestational-surrogacy

167. Simon Murden, Culture in world affairs in john baylis & steve smith's the globalization of world politics, (Oxford University Press, ۲۰۰۸,





INTRODUCTION

Dr. M. Abid Noman Shami

Dr. Hafiz Muhammad Abid Noman Shami is a distinguished Islamic scholar and educator, known for his scholarly lineage as a member of the noble family of Hafiz Muhammad Amin (R.A.) in Faisalabad. His expertise lies in Islamic studies, Quranic exegesis, and the study of Muslim minorities, with a focus on fostering peace, tolerance, and spirituality through his deep understanding of Islam and comparative religion.

Dr. Noman holds a PhD in Quran and Tafseer and an MPhil in Islamic Studies. He is well-versed in traditional Islamic sciences, having completed the rigorous Dars-e-Nizami curriculum, alongside obtaining specialized certifications from internationally recognized institutions. His profound engagement with Tasawwuf, particularly within the Naqshbandi and Shadhili spiritual orders, adds depth to his scholarly perspective on spiritual and ethical development.

In his academic and religious outreach, Dr. Noman advocates for a vision of Islam that transcends sectarian divides and promotes universal peace and harmony. His work emphasizes the importance of interfaith dialogue and mutual understanding. His lectures and seminars have been well received across Pakistan, Malaysia, The Singapore, UAE, the UK, and the USA, where he addresses critical topics of moral conduct, social justice, and spiritual refinement.

Dr. Noman has held key educational roles and served as an expert voice on various media platforms. His teaching spans Islamic banking, traditional Islamic law, and Quranic sciences, with substantial contributions to religious education in both academic and community settings. His scholarly writings cover contemporary Islamic issues, Quranic commentaries, and Hadith studies.

A prolific writer and public speaker, Dr. Noman continues to strive for a society where Islamic values of compassion, justice, and humility are upheld. His scholarly work is a beacon for those seeking a balanced, enlightened approach to understanding Islam in the modern world.

Muslim Minorities: Social Dilemmas and Principles